TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222427

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ٨٩١٥٤٣١٧ Accession No. ١٣٤٧٢

Author س. ك. 13472

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

کلیم عجم

بیماب

خطباتِ شاعری

میں نے اس خوابیدہ عالم کو بنایا کام کا
گرمیٔ محفل نتیجہ ہے مرے پیغام کا

فہرستِ خطباتِ شاعری

شمار خطبہ	تاریخ و مقام خطبہ خوانی	موضوعِ خطاب	صفحہ
پہلا خطبہ	مشاعرۂ گیا ۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۲۲ء	قومی مشاعرۂ احمد آباد۔ شاعر اور تبصرۂ حیات۔ ہندوستان کے سب سے پہلے قومی شاعر۔ شاعر اور قومیات۔ رزمگاہ آگرہ اور نصرتی۔ عروج و زوالِ ملک سے شاعر کا تعلق۔ ملکی اور قومی انجمنوں میں شاعر کی ضرورت۔	۳
دوسرا خطبہ	مشاعرۂ آگرہ ۵ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء	خطبۂ صدارت کی ترویج۔ مبتدی اور منتہی شعرا کی مشارکت۔ آگرے کی شاعرانہ افضلیت۔ آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق۔ شعرائے آگرہ سے اپیل۔ مناظمہ۔	۹
تیسرا خطبہ	مشاعرۂ امراوتی ۲۹ نومبر سنہ ۱۹۳۰ء	برار کی تاریخی و ادبی حیثیت۔ شاعری کا اثر نظامِ حیات پر۔ عہدِ عتیق اور شاعری۔ اردو شاعری۔ فارسی شاعری کے نقشِ قدم پر۔ اردو شاعری اور غیر فطری جذبات۔ طالبِ علم شاعری کا غلط	۱۰

مطبوعۂ فاہ عام پریس آگرہ

شمار خطبہ	تاریخ و مقام خطبہ خوانی	موضوعِ خطاب	صفحہ
		اصول زندگی۔ غزل اور تغزل کی تشریح۔ تقلید محض کی لعنت۔ شعر کی تعریف۔ کالجوں اور اسکولوں کے مشاعرے۔ شاعری اور ماحولی خصوصیات ..	۱۹
چوتھا خطبہ	مشاعرۂ ڈیرہ دون ۱۳ر دسمبر ۱۹۳۰ء	مشاعروں میں خطبۂ صدارت۔ عربی علم عروض۔ ہندی قواعد شاعری سیدنشا اور عروض اردو میں قواعد شاعری کی ضرورت۔ لیٹا جمعیۃ الشعرا کے قیام کی ضرورت۔ ایرانی شاعری میں انقلاب۔ ہندوستانی شاعر اور تحریکِ وطن۔ موجودہ ذہنیت اور قواعد وضوابط میں انقلاب کی ضرورت	۲۹
پانچواں خطبہ	مشاعرۂ ڈبائی ۲۶ر دسمبر ۱۹۳۱ء	خطبہ خوانی کا غلط مصرف۔ اردو شاعری۔ غلط نظریہ۔ غلامانہ ذہنیت۔ شاعری اور مصوری شاعری کے مدارج بلحاظ اثر۔ شاعری اور دورِ آزادی۔ اسبابِ قبولیت رسمی و نشاطی شاعری۔ مشاعروں کی اصلاح۔ شاعری اور مشاعرے جدید نظام عمل۔ ماضی و حال شاعر کی عظمت۔ تخ نوائی کی معنویت	۴۰
چھٹا خطبہ	مشاعرۂ علیگڑھ ۲۷ر فروری ۱۹۳۲ء	شاعری اور مشاعروں کی اصلاح۔ مروجہ اقسام شاعری۔ محاورات، مصطلحات، اور اسالیب بیان کا تحفظ۔ میر و سودا اور غالب و مومن۔ اساتذۂ متقدمین کے دیوانوں کا تجزیہ۔ بدعاتِ مشاعرہ۔ مشاعروں کی اصلاح کیونکر ہو؟ شاعر اور مشاعروں میں انقلاب پیدا کرنیکی عملی تدبیر۔ جمعیۃ الشعرا کی تحریک	۵۰

شمار خطبہ	تاریخ و مقام خطبہ خوانی	موضوعِ خطاب	صفحہ
ساتواں خطبہ	مشاعرۂ جہلم ۱۶ر اپریل ۱۹۳۳ء	علم و ادب۔ ادب اردو۔ مشہور شعرائے اردو کے چھ دور لحاظ ترقی زبان۔ فارسی کا اثر اردو پر۔ ادب کا مواد اور مقصد و منشا۔ قدیم و جدید ادب نوئے ادب کے وسائل۔ شعر میں ادب کی جگہ۔ ملک کی اجتماعی زندگی پر ادب کا اثر۔ حیاتِ قومی میں ادبیات کا حصہ۔ علم و ادب کی تبلیغ و خدمت کے ذرائع مستقبل کے متعلق مشورہ	۶۱
آٹھواں خطبہ	مشاعرۂ کانپور ۲۸ر اکتوبر ۱۹۳۳ء	اردو شاعری کی ترقی اور معیار۔ شاعرے۔ شعر کی بے قدری و کس پرسی۔ اس کا علاج۔ صدارت ناقص۔ شاعرے کا غلط احول فوری و شعرا کی اصلاح۔ محاکمے کی ضرورت۔ غزل کا معیار۔ غزل کی زبان	۷۸
نواں خطبہ	محررۂ دسمبر ۱۹۳۳ء	غزل کی صنفی خصوصیت۔ عرب کے بعد عجم میں۔ ہندستان اردو شاعری سے پہلے۔ غزل ہندوستان میں۔ غلط بحثی۔ اقدام اصلاح۔ حکومت کا اثر غزل پر۔ دورِ غالب۔ مرزا داغ اور امیر و جلال کا زمانہ۔ حالی اور آزاد کا اثر غزل پر۔ غزل کا ارتقا۔ ایک مترنم انقلاب۔ حالی اور ان کے معاصرین۔ غزل کے قدیم موضوعات۔ غزل کا جدید رنگ۔ غزل اور واردات و جذبات۔ ایک ضروری مشورہ۔	۸۹
دسواں خطبہ	مشاعرۂ کانپور ۲ر دسمبر ۱۹۳۳ء	شاعری کا معیار۔ ادارہ ہائے شاعری اور انکی شاخیں۔ آگرہ اسکول عام اردو شاعری پر تنقید۔ آگرہ اسکول کی خصوصیات۔ حریفان کم پایہ اردو شاعری کا ایک اور نقص۔ تقلید و قدامت پرستی۔ تنقید کا غلط معیار۔ موجودہ شاعر کا عملی کریکٹر اور مشاعرے۔ موجودہ شاعری کے نمونے۔ عصر حاضر سے عصر قدیم کا موازنہ۔ نظم گوئی کا رواج	۱۰۳
گیارہواں خطبہ	مشاعرۂ آگرہ ۹ر فروری ۱۹۳۴ء	اردو زبان کی عالمگیری۔ مشاعروں کی افادیت۔ کالجوں کے مشاعرے اور ادبی مجالس کی اہمیت۔ طلبا اور شاعری۔	

شمار خطبہ	تاریخ و مقام خطبہ خوانی	موضوعِ خطاب	صفحہ
		یونیورسٹیوں کی ادب اردو سے بے اعتنائی۔ یونیورسٹیاں کیا کر سکتی ہیں؟ تعلیم میں اردو کی ضرورت بحیثیت مادری زبان کے۔ نصاب تعلیم میں معیار کی ادب کی ضرورت۔ ادبائے اردو کی ہمت افزائی۔ مدراس نصاب کی مردہ پرستی۔ کالج کی لائبریریاں۔ کالجوں کے رسالے کالجوں کے شاعروں کا معیار۔ خاتمہ۔	۱۲۲
بارھواں خطبہ	مشاعرۂ گوالیار ۲۸ فروری ۱۹۳۴ء	چند لمحے ماضی میں۔ توضیح حال۔ اردو کی عالمیت اور صوبجاتی گیرائی اردو کس کی زبان ہے؟ اردو زبان کے خصائص۔ اردو املا و انشا مصطلحات اردو۔ قوتِ انجذاب سارے اردو بحیثیت اخباری زبان کے۔ اردو زبان کی علمی حیثیت۔ اردو کا تجارتی وزن۔ اردو اور سیاست اردو اور شاعری۔ اردو کی تعمیفی قوتیں۔ اردو میں تاریخ و سیرۃ نگاری اردو کا اخلاقی استحکام۔ اردو کا مذہبی اقتدار۔ اردو کی بین القومی حیثیت اردو کے مستقبل پر ایک نظر۔	۱۳۲
تیرھواں خطبہ	مشاعرۂ آگرہ ۲ مارچ ۱۹۳۴ء	ارباب طریقت اور شاعری۔ آگرے کے صوفی شعراء تصوف اور شاعری۔	۱۴۵
چودھواں خطبہ	مشاعرۂ اورنگ آباد ۱۵ جون ۱۹۳۵ء	اورنگ کا ادبی جغرافیہ۔ شاعری اور بقائے عمرانیت۔ شاعری کا تفوق جنسی۔ موجودہ شاعری اور تنوع خیال۔ آخری گذارش	۱۵۶
شعر الحیات	۱۴ دسمبر ۱۹۳۵ء	خود نوشتہ حالات شاعری اپنا بیان اپنی زبان۔ پیدائش تعلیم اور فطری ذوق شعر گوئی۔ ملازمت اور تلمذ بیت اور شاعری۔ شاگردوں کا مجموعہ۔ ترک ملازمت اور قیام مرکز۔ شاعروں کی شرکت معنوی و صوری اولاد۔ میری ناچیز خدمات۔ میرے شاعرانہ معتقدات	۱۶۱
میں شعر کو کر کہتا ہوں؟	۰	شاعری کے چار دور۔ پہلا دور۔ دوسرا دور۔ تیسرا دور۔ چوتھا دور۔ دورِ موجود	۱۷۲
متروکات و مختارات	۰	.. ..	۱۷۶

۸۶

پہلا خطبہ

آل انڈیا قومی مشاعرہ۔ گیا

۲۴۔ دسمبر ۱۹۲۲ء

معززینِ قوم!

جیسا کہ آپ حضرات کو معلوم ہوگا اس "آل انڈیا قومی مشاعرہ" کی صدارت کا اعزاز جناب چکبست لکھنوی کے لئے مقدر تھا لیکن سوءِ اتفاق سے ان کی والدۂ ماجدہ کی طبیعت ناساز ہوگئی اور اراکین مجلس انتظامیہ نے بار صدارت میرے کاندھوں پر رکھ دیا۔ جسے قلت وقت اور نزاکت موقع کے خیال سے مجھے مجبوراً اُٹھانا پڑا۔

احمد آباد (گجرات) کے بعد "آل انڈیا قومی مشاعرہ" کی یہ دوسری نشست ہے اور اہل گیا قابل مبارکباد ہیں کہ اُنہوں نے بہتر سے بہتر انتظامات فرماکر اور کثیر اخراجات برداشت کرکے قوم کی شاعرانہ زندگی کی یادگار امسال بھی کشادہ دلی اور وسیع النظری کے ساتھ قائم کی۔

یہ ظاہر ہے کہ مرورِ ایام نے ایشیائی شاعری کو انحطاط کے پست ترین قعرِ مذلت میں ڈھکیل دیا ہے۔ تاہم رنگِ زمانہ صاف کہہ رہا ہے کہ شاعر ضروریاتِ زندگی کا جزو اعظم ہے۔ حیاتِ حاضرہ کی صحیح ترجمانی اور واقعاتِ ہائلہ پر حقیقی تبصرہ جس خوبصورتی اور دقتِ نظر کے ساتھ ایک شاعر کرسکتا ہے کوئی اور نہیں کرسکتا۔

اُردو شاعری کے اجزائے ترکیبی جب تک صرف گل و بلبل، شمع و پروانہ، سنبل و قمری اور شانہ و زلف سے وابستہ رہے، شاعری صرف تفریح خاطر کا ایک ذریعۂ مسرور سمجھی گئی۔ لیکن قدرت نے لکھنؤ دہلی اور پانی پت کے بعض فاضل عمائدین کے دماغ کو انوار شاعری سے متجلی کر کے دنیائے سخن کی فضائے بسیط پر رشد و ہدایت کی بجلیاں چمکائیں۔ وہ ہندوستان میں سب سے پہلے قومی شاعر تھے، جن کے رشحات شاعری کو خدائے سخن نے ایک نئی قوت، ایک نیا اثر، اور ایک نئی ترتی بخشی۔ اور جس کے بعد قومی شاعری کا ایک خاص معیار قائم ہو گیا۔ میر مطلب مولانا حالی، شمس العلما محمد حسین آزاد، شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد، اور مولانا شبلی (مرحوم) سے ہے۔

شاعری جس طرح جذبات قومی کے نشر و اعلان کے لئے ایک ذریعۂ مخصوص ہے اُسی طرح مذہب کے اثرات کو سماعت گزیں اور دل نشیں کرنے کا بھی ایک خاص وسیلہ ہے۔ نصیحتیں جو نثر میں کی جاتی ہیں وہ اصلاحی نظموں سے زیادہ اثر آفریں نہیں ہوتیں۔ نثر عبارتیں خواہ کیسی ہی خوش ترکیب کیوں نہ ہوں زبانوں سے نکل کر دلوں میں محفوظ نہیں رہتیں مگر ایک درد میں ڈوبا ہوا شعر مدتوں آغوشِ سماعت میں جھولا کرتا ہے اور اس کی موجیں فضائے شوق سے باہر نہیں نکلتیں۔

پچھلے دنوں جب خدام وطن کی جماعتیں، سودائے حریت بسر، اور رایتِ ملت بدست بغرض مظاہرہ نکلتی تھیں جن کے پیچھے پیچھے شیدایان وطن کا ایک محشر ہوتا تھا۔ تو ان کی زبانیں کسی نہ کسی شاعر ہی کی اثر خیز نوائے موزوں سے آشنا ہوتی تھیں۔ اور اُن کے ہلالی رایت کے بلند پھریرے پر بخط جلی لکھا ہوتا تھا۔ کہ "ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا"

قوم کے ناہموار اور غیر مستعلیق مذاق میں یہ شعریت پیدا کرنا اگر شاعروں کی دماغی محنت کا نتیجہ نہ تھا تو اور کیا تھا؟ رزمگاہِ انگورہ کی خوں بدامن وادیوں سے پوچھئے کہ اُس کے مناظرِ خاموش میں جس نے جزر و مد کا ایک طوفانِ عظیم پیدا کر دیا وہ کون تھا۔ شاعر اور صرف شاعر!!

یہ نصرتی کا فیضِ سخن ہی تھا، جس کی حوصلہ افزا رجز نے غازیانِ اسلام کے تور بدل دیئے انکے ٹھہرے ہوئے جوش اور سکوں طلب جذبات کو حرکت میں لا کر اُبھار دیا۔ اور اُن کے دلوں کو

شوق شہادت وجذبۂ فدائیت سے لبریز کر دیا۔ جس کا بدیہی نتیجہ یہ ہوا کہ آج انگورہ گو دارالخلافۃ نہیں تاہم دارالخلافۃ کی مقدس شانیں اپنے آغوش میں لئے ہوئے عامۃ المسلمین کی نگاہوں میں سجدہ گاہِ عقیدت بنا ہوا ہے۔

موجودہ قوانین جنگ کے ماتحت، ہر فوج اور ہر لشکر کا مقدمۃ الجیش ایک فوجی نغمہ ہوتا ہے جسکی لبریز جوش صدائے دلکش ایک نظم منضبط کا عکس ناطق ہوتی ہے۔ اُس میں الفاظ نہیں ہوتے مگر صرف ایک پُر جوش موسیقی۔ بغیر اس نغمہ کے کوئی فوج میدانِ جنگ میں معرکہ آرا نہیں ہوسکتی۔

جب نظموں کی صوت بے لفظ میں یہ اثر ہے تو پھر اصلی نظموں کے تاثر کا کیا ٹھکانہ ہے۔ اور جب نظموں کا درجہ اس قدر بلند ہے تو پھر ناظموں کے مدارج کا کیا پوچھنا ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ اگر آج ساری دنیا کا ایک لشکر عظیم تیار کیا جائے۔ تو شعرا بطور مقدمۃ الجیش اُس کے آگے آگے ہوں گے۔ اور اُس کی فتحیابی و کامرانی، حرکت و روانی، صرف شعرا کی اثر آفرینی اور گرم نوائی پر موقوف ہوگی۔

شاعری کی قسمت ہمیشہ ملک کی قسمت کے ساتھ وابستہ رہی ہے۔ جب ہندوستان کو عروج حاصل تھا، تو شاعری کا عروج بھی نقطۂ کمال کی آخری حد پر نظر آرہا تھا۔ اب ہندوستان زوال کے خطوط انتہائی پر آپہونچا ہے۔ تو روایات شاعری بھی اُسی نسبت سے انحطاط پذیر ہیں لیکن میں کہے دیتا ہوں کہ جس وقت ہندوستان کا ستارہ چمکے گا، اُس وقت شاعری کا آفتاب بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ نور باری کرتا نظر آئے گا۔ اور جہاں تک قرائن کی گنجائش ہے، ہندوستان کی ترقی، اور عروج و کمال کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ ہی شاعری ہوگی۔ جو اپنے طلسمی اثر سے دردمندانِ ملک و قوم کو ایک دن ضرور کامیاب مقاصد بنا دے گی۔

یاد رکھئے، ایک شاعر، اگر اُسے اپنے فرض کا احساس ہے، اور وہ زمانہ کا نبض شناس ہے تو ہزاروں جری اور نبرد آزما جوانوں سے بہتر ہے۔

ہماری ملکی اور قومی انجمنوں کو ہنوز شاعر اور شاعری کی عظمت و اہمیت کا احساس نہیں۔ ورنہ جس طرح آج کانگریس کے پنڈال میں یہ قومی مشاعرہ منعقد ہوا ہے، اگر اسی طرح ہر سال منعقد ہوتا رہے تو نہ صرف قومی شاعری کے رواج میں ترقی ہوسکتی ہے بلکہ قومی و ملکی انجمنوں کے مقاصد و

عزائم کے پروپیگنڈے میں بھی کافی مدد مل سکتی ہے۔ اور عام شاعری کا رجحان رطب و یابس کی طرف سے سمٹ کر قومی تعمیر کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔

شاعر سماج کا ایک رکن عزیز ہے۔ ایک مضبوط ستون ہے۔ ایک ترجمانِ حقیقی ہے۔ اُس سے بے نیاز رہنا سماج کو علمی و ادبی قوتوں سے محروم رکھنا ہے۔ کسی حقیقی شاعر کا ایک شعر متعدد مقررین کی طویل تقریروں سے زیادہ مؤثر ہو سکتا ہے۔ ملکی انجمنوں کی تاریخ میں یہ حقیقت موجود ہے کہ شعرا کی گرم نوائی نے جذبات انسانی میں تحریک کی آگ بھڑکا دی ہے۔ اور سرد سے سرد ماحول کو بھی گرم و پُرجوش بنا دیا ہے۔ مگر آج ہمارے ملک کی سب سے بڑی سیاسی مجلس شاعری کی ان معجزانہ قوتوں کو نظر انداز کئے ہوئے ہے۔ اگر وہ ڈھونڈے تو اسی ہندوستان میں اُسے آج بھی والمیک اور نصرتی مل سکتے ہیں۔ اگر وہ آواز دے تو آج بھی گنگا اور جمنا کے کناروں سے بیسیوں وٹھل پو اور بائرن اُس کی آواز پر لبیک کہہ سکتے ہیں۔ مگر وہ بحث و مباحثہ تائید و تردید ریزولیشن اور ایجنڈا کی رسمی تقلید میں گرفتار ہے اور اُسے شاید کسی نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ ان چیزوں سے زیادہ اثر آفریں ملک میں بیداری پیدا کرنے کا ایک ذریعہ اور بھی ہے۔ اور وہ شاعری ہے۔ تقریروں کے درمیان کبھی کبھی نظم پڑھنے کا رسمی دستور اب بھی ہے مگر وہ ایک غلط دستور ہے جس کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا اور شاعر کی آواز "صدا بصحرا" ہو کر رہ جاتی ہے۔ صحیح طریقۂ کار یہ ہے کہ قومی انجمنوں کے دوش بدوش قومی مناظمے منعقد کئے جائیں۔ اور اُن مشاعروں میں بجائے غزلوں کے کسی خاص موضوع پر نظمیں پڑھی جائیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس مناظمے میں تمام ہندوستان کے شعرا کو حضرات کو دعوت دے کر غلط بحث کے لئے راستے کھول دیے جائیں۔ بلکہ ضرورت ہے کہ خاص خاص شعرا کی ایک کافی تعداد اس مقصد کے لئے مدعو ہو۔ اور اُن کی نظم خوانی کے لئے ایک خاص دن اور وقت اُسی پنڈال میں مقرر کیا جائے جو سیاسی مباحث طے کرنے کے لئے بنایا گیا ہو۔ ہمارے احول میں ترقی و تعمیر کے وسائل و اسباب موجود ہیں۔ مگر ہماری محدود نگاہیں اُنھیں نظر یاب نہیں ہونے دیتیں۔ شاعر موجودہ زمانے کی نئی دریافت نہیں۔ وہ اسی ہندوستان میں صدیوں

سے گونج رہا ہے۔ گرج رہا ہے۔ اور اپنے افکار و تخیل کی بلندیوں سے انسانی پستیوں میں بیداری برسا رہا ہے۔ اُسے آواز دو۔ اُسے بلاؤ۔ اُس کا خیر مقدم کرو۔ وہ تمہیں بتائے گا کہ غلامی سے آزاد ہونے کا علاج روحانی قوتوں کو بروئے کار لانے میں ہے۔ وہ تمہارے سامنے تاریخ ماضی کی شمعیں روشن کر کے رکھ دیگا۔ اور اپنے پیام سے تمہاری سوئی ہوئی اور گمراہ ذہنیتوں میں بیداری اور صلاحیت کار پیدا کر دے گا۔ اُس میں امیر کارواں بننے کی صلاحیت تمہارے موجودہ رہنماؤں سے زیادہ ہے۔ اُس کی ایک نوا تمہارے ذہن کو منوّر اُس کی ایک للکار تمہارے جمود کو متحرک، اور اُس کی ایک رجز تمہاری منزل کو قدموس کرنے کے لئے کافی ہے۔

برادرانِ وطن! آپ نے شاعر کو سیاسی معاملات سے الگ کر کے بہت بڑا سیاسی نقصان کیا ہے۔ آپ نے اپنے وطن کی ۱/۴ آبادی کو عضو معطل سمجھ لیا ہے۔ اور آپ نے علم و ادب کی قوتوں سے دانستہ چشم پوشی کر لی ہے۔ اگر آج یہ متروک جماعت آپ کے اجزائے عمل سے مربوط ہو جائے تو میں نہایت آزادی کے ساتھ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ "منزلِ آزادی" کے حصول میں آپ اپنی توقع سے پہلے کامیاب ہو سکتے ہیں۔

قومی انجمنیں تو ہمارے پُرتکلف اسٹیج ہیں۔ جہاں تکلف اور صنعت کے سایہ میں، اطمینان و آرام کے ساتھ ٹھنڈا پانی یا گرم چائے پی کر ہم دھواں دھار تقریریں کر لیتے ہیں۔ لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو ہمارے مقررِ شعلہ بر لب اپنے گھروں کی سب سے زیادہ اندرونی کوٹھری میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں "تا بہ میدانِ جنگ کہ رسد"۔ مگر "شاعر" "شمع بزم" ہونے کے ساتھ ساتھ "صاعقۂ رزم" بھی ہے۔ اُس نے ہمیشہ میدانِ جنگ میں اپنی پامردی کا ثبوت دیا ہے۔ میدانِ رزم میں پہونچ کر اُس نے اپنی نوا کو شورِ قرنا پر غالب کر دیا ہے۔ اور اس کی ایک موزوں للکار پر قوموں نے کامیابی کے لئے اپنی جانیں لڑا دی ہیں۔ پھر ایک ایسے ہمہ گیر مردِ میداں کو آپ اپنے ساتھ شریکِ کار کیوں نہیں رکھتے جو بزم و رزم دونوں جگہ آپ کا مشیر و معاون ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور جو بغیر تیغ و تفنگ بھی براہ راست دلوں پر حملہ کر سکتا ہے؟

ہندوستان ہی ایک ایسا بدنصیب ملک ہے جہاں ملکی و اجتماعی قوتوں کو ہماری بے پروائی اور تن آسانی نے منتشر اور معطل کر کے کمزور کر دیا ہے۔ ورنہ دوسرے ممالک میں مردوں کے ساتھ خواتین کی بیداری اور سیاسیین کے ساتھ شعرا کی متحدالعملی ہمیشہ بروئے کار رہی ہے اور آج تک ہے۔ اجتماعیات کے اس مسئلے کو جتنی جلد حل کر دیا جائے اُتنا ہی فلاحِ ملک و قوم کے لئے اولیٰ تر ہے۔

دوسرا خطبہ

مشاعرۂ بزمِ ادب بیکر گارڈن آگرہ

۵۔ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء

معزز شرکائے مشاعرہ و اعیانِ وطن!

خطبۂ صدارت کی ترویج بزمِ ادب میں جو عزتِ صدارت آپ نے مجھے دی ہے اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میں کچھ عرض بھی کرنا چاہتا ہوں۔ آج بزمِ ادب کے اس جلسۂ رنگین و رعنا میں آپ کو دو نئی باتیں یا بدعتیں نظر آئیں گی۔

(۱) یہ کہ مشاعرہ کا صدر آپ کے سامنے خطبۂ صدارت پڑھ رہا ہے۔

(۲) یہ کہ اس مشاعرے میں بندیِ متعلمانِ شعر کو غزل پڑھنے کا موقعہ دانستہ نہیں دیا گیا ہے۔

میں نے انھیں دو بدعتیں کہا ہے وہ بھی اس لئے کہ اگر بالکل نہیں تو قریب قریب دونوں باتیں سنتِ شعرا میں عام طور پر داخل نہیں ہیں۔ اس لئے ناممکن نہیں کہ بعض قدامت پسند حضرات انھیں بدعت سے تعبیر کریں۔ ورنہ یہ دونوں ایسی امتیازی خصوصیتیں ہیں جو ہمارے مشاعروں کو ممتاز اور منظم کر سکتی ہیں۔ پہلی خصوصیت کے متعلق میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مشاعروں کی صدارت کبھی خاموش نہ ہونی چاہئے۔ اور صدر ہمیشہ کسی ایسے شخص کو منتخب کرنا چاہئے جو اہلِ جلسہ کے سامنے اس کا ثبوت دے سکے کہ اسکے منہ میں زبان ہے اور زبان میں قوتِ بیاں بھی ہے۔ میں نے کسی سیاسی یا قومی مجلس کے صدر کو نہیں

دیکھا کہ وہ اہل مجلس کے سامنے نقش قالین بنا بیٹھا رہا ہو۔ محض عوام کے ساتھ "واہ واہ" میں شریک ہو جانا فرض صدارت سے سبکدوش نہیں کرتا۔ صدر مجلس کا فرض ہے کہ وہ جس مجلس کا صدر بنایا جائے اسکے اساسی مقاصد پر روشنی ڈالے۔ مجلس کا جس موضوع یا فن سے تعلق ہو۔ اس کے متعلق کوئی مفید بیان دے اور کم از کم شرکائے جلسہ پر یہ ثابت کر دے کہ جو امتیاز بحیثیت صدر اُسے دیا گیا ہے وہ اس کا اہل ہے۔ میری رائے ہے کہ آیندہ نہ صرف ہمارے شہر میں بلکہ تمام ہندوستان میں ایک بھی ایسا مشاعرہ منعقد نہ ہونا چاہیئے جس کا صدر کوئی غیر متاثر ہو۔ اور کبھی کسی ایسے شخص کو منصب صدارت نہیں دینا چاہیئے جو ہماری رہنمائی اور افادہ پذیری کے لئے اپنی زبان کو تکلیف جنبش نہ دے سکے۔

مبتدی اور منتہی شعرا کی مشارکت

دوسری خصوصیت آج کے مشاعرہ میں مبتدی حضرات کی عدم غزل خوانی ہے۔ مبتدی کی تعریف یہ ہے کہ وہ نو آموز ہو اور اس کی عمر کی طرح مشق سخن کی عمر بھی زیادہ نہ ہو۔ ایسے طلبائے شاعری کے لئے مشاعروں میں شریک ہو کر غزل پڑھنے سے زیادہ مفید یہ ہے کہ وہ اپنے بزرگان وطن اور شاہیر شعرا کا کلام غور و فکر کے ساتھ سنیں اور اُن کی کہنہ مشقی، تجربہ کاری اور معلومات سے فائدہ اُٹھائیں۔

اساتذہ کے دوش بدوش بیٹھ کر غزل پڑھنا اور پھر داد سخن کا مطالبہ، میری رائے میں ایک قسم کی بے ادبی ہے جو طالب علمانہ جذبہ ظاہر نہیں کرتی اور جس سے مساویانہ ذہنیت کا اظہار ہوتا ہے مبتدی اگر اپنے مشاعرے علیحدہ مقرر کریں اور اپنی حوصلہ افزائی کے لئے کہنہ مشق شعرا کو احترام و عزت کے ساتھ اپنے مشاعروں میں مدعو کریں تو یہ ایک مستحسن طریقہ کار ہے۔ اس صورت میں کہنہ مشقان سخن کے لئے ناروا نہیں کہ وہ مبتدی شعرا کے کلام کی داد دے کر اُن کا دل بڑھائیں۔ اور اُن کے عیوب و محاسن سے بطریق احسن انھیں آگاہ کریں۔ مگر ان کی محفلوں میں اپنے لئے کوئی متکلمانہ حیثیت بہ اعتبار غزل گوئی اختیار کر کے اُن سے داد لینے پر حریص ہونا کسی طرح مناسب نہیں اگر استادانہ حیثیت سے مبتدی حضرات کے سامنے میری کلام مختصراً پیش کرنا ضروری اور لابد ہو تو چنداں معیوب نہیں لیکن مبتدی اور منتہی شعرا کی باہمد گر غزل سرائی بے جوڑ اور نامناسب ہے۔

آگرے کی شاعرانہ فضلیت

برادرانِ وطن! آگرہ پندرھویں صدی عیسوی اور دسویں صدی ہجری میں فضلا، علما اور شعرا کا مرکز بن چکا تھا از منۂ ما بعد میں بھی آگرہ نے زبان کی نشو و نما اور پرورش میں نمایاں حصّہ لیا۔ تیسرے دور تک جو صبائے سخن ہندوستان میں لنڈھائی گئی وہ اُسی بادہ کہن کا ایک جرعہ تھی جس کا میخانہ اکبر آباد یا آگرہ تھا۔ دورِ اکبری تک شاعری کا رجحان فارسی کی طرف زیادہ رہا مگر ہندی آمیز اُردو، اور اُردو آمیز فارسی کا رواج عہد جہانگیر سے شروع ہو گیا۔ شہنشاہ جہانگیر اپنی تزک میں شہزادۂ دانیال کے تذکرے میں ضمناً لکھتے ہیں کہ :-

"بہ نغمۂ ہندی مائل بود گاہے بزبان اہلِ ہند باصطلاح ایشاں شعرے می گفت"

"بدنبودے"

داراشکوہ کے منشی چندر بھان برہمن اکبر آبادی بھی اُردو ہندی مخلوط زبان میں شعر کہتے تھے۔ گو فارسی میں ان کی مشقِ سخن بہت بڑھی ہوئی تھی۔ جن شعرا کے ادبی کارناموں سے دارالسلطنت دہلی کی فضا مدتوں گونجتی رہی اُن میں اکثر اکبر آبادی تھے۔ میر، غالب، نظیر۔ اسیر وغیرہ اساتذۂ سخن آگرے ہی میں پیدا ہوئے۔ جن کے نام سے ادبی دنیا کا بچہ بچہ آج تک واقف ہے۔ میں اس اجمال کی تفصیل آگرے اور دہلی کا شاعرانہ تعلق بیان کرکے بطور واضح کر دینا چاہتا ہوں۔

آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق

دہلی اور آگرے کا شاعرانہ تعلق تین حیثیتوں سے واضح کیا جا سکتا ہے۔

(۱) جغرافیائی حیثیت سے،

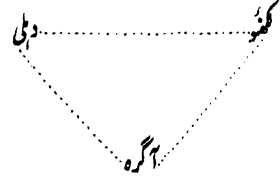
(۲) تاریخی حیثیت سے،

(۳) اس حیثیت سے کہ دہلی کے زمانۂ شعر و شباب کی شہرت و عظمت میں شعرائے اکبر آباد (آگرہ) نے کتنا حصّہ لیا؟

جغرافیائی حیثیت سے، دہلی، آگرہ اور لکھنؤ آج سے چند سال پہلے تک ایک ہی صوبے کے تین ممتاز شہر تھے، ممالکِ متحدہ میں انھیں تین شہروں کو وقتاً فوقتاً دارالسلطنت بننے کا موقع ملا ہے اور یہی

تین مقام مرکزِ ادبِ اُردو رہے ہیں۔

انتقالِ دارالصدر کے بعد بھی جغرافیائی حیثیت سے آگرہ، لکھنؤ اور دہلی کے بین بین تھا اور ہے اس لئے دہلی اور لکھنؤ کو آگرے سے وہی تعلق رہا جو کسی نہال کے برگ و بار کو اصل سے ہوتا ہی، ہندوستان کے نقشے میں اب بھی آگرہ، دہلی اور لکھنؤ کے محاذی خطوط کا وسطی حصّہ ہے۔



لہٰذا جغرافیائی اعتبار سے ماننا پڑے گا کہ لکھنؤ، آگرہ اور دہلی ایک ہی زنجیر کی تین کڑیاں ہیں اور لسانی حیثیت سے ان تینوں کو ایک دوسرے سے قطعاً مربوط ہونا چاہیئے۔

تاریخی توضیح یہ ہے کہ آگرہ سکندر لودی، ابراہیم لودی، بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہدِ سلطنت تک ہندوستان کا پایۂ تخت رہا ہے اور اُردو زبان ان میں سے آخری تین بادشاہوں کے زمانوں میں ہندی، فارسی، عربی اور ترکی زبانوں کے اختلاط سے بنی ہے۔

عہد جلال الدین محمد اکبر میں جو مردانہ اور زنانہ بازار قلعہ (آگرہ) میں لگتا تھا اُسے "اُردو" کہتے تھے، جہانگیر کے عہد میں بھی یہ بازار آباد رہا وہاں لین دین بدستور اسی زبان میں ہوتا تھا، شاہ جہاں نے اسے اور رونق دی، یہ شاہی بازار چونکہ احتراماً اور تعظیماً "اُردوئے مُعلّٰے" کہلاتا تھا اس لئے اس نئی زبانِ مرکب کا نام بھی اُردوئے معلّٰے رکھا گیا۔

صاحب "ظہیر الانشا" کے اس بیانِ محقق سے ظاہر ہے کہ اس مخلوطِ زبان (اُردو) کی بنیاد سب سے

لہ ظہیر الانشاء

پہلے قلعۂ آگرہ میں پڑی۔ وضع زبان کے بعد پہلے بھاشا (ہندی اُردو) میں شاعری کا رواج ہوا اور پھر اُردو شاعری وجود میں آئی۔

جلال الدین محمد اکبر کے عہد سے عہد شاہجہاں تک فارسی شاعری زیادہ مقبول و مروج تھی جسے مغل سلطنت اپنے آبائی وطن سے ساتھ لائی تھی، اس تمام زمانے میں بھی اکبر آبادی الاصل شعرا موجود تھے مثلاً شیخ ابوالفضل فارغی، علامہ فیضی بن ملا مبارک، میر ہاشمی ملا صبوحی چغتائی، ملا شیدا، محمد امین ذوقی، عبداللہ سحری وغیرہ وغیرہ، لیکن اُردو شاعری کا رواج بتدریج عہد اورنگ زیب عالمگیر سے شروع ہوتا ہے۔

عہد شاہجہاں میں جب بعض سیاسی مصالح کی بنا پر حکومت کا پایۂ تخت آگرے سے دہلی منتقل ہوگیا تو آگرہ کے ادبا اور شعرا نے بھی دہلی کا رُخ کیا، حتیٰ کہ جب دہلی سے کاروانِ ادب لکھنؤ پہنچا تو میر کارواں میر تقی میر اکبر آبادی ہی تھے۔

اگر اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں مرزا عبدالقادر بیدل، میر جعفر زٹل اور نواب لطف اللہ خاں صادق وغیرہ شعرا نے دہلی کے مطلع سخن کو چمکایا تو عالمگیر ثانی کے عہد میں قاضی سراج الدین علی خاں آرزو اکبر آبادی اور مرزا مظہر جانِ جاناں اکبر آبادی خلف مرزا جان علوی آگرے ہی کی شاعر خیز خاک سے اُٹھے اور دہلی میں صدر الصدور بن کر بیٹھے۔

میاں نجم الدین عرف شاہ مبارک آبرو کا مولد گو الیار تھا لیکن اگر میر و غالب کی نزادگاہ آگرہ ہونے کے باوجود انہیں دہلوی مانا جاسکتا ہے تو آبرو کو اکبر آبادی کہنے میں کوئی چیز مانع نہیں۔ جنکی عمر کا زیادہ حصہ آگرے میں گزرا اور جو عہد عالمگیر ثانی کے بہت مشہور شاعر ہیں۔

عہد محمد شاہ میں (سنہ ۱۷۲۰ء) میر باقر علی متخلص اکبر آبادی نے نقلِ وطن کیا اور دہلی کی محفل ادب کو چار چاند لگا دیے۔

خانِ آرزو کے ارشد تلامذہ میں میاں شرف الدین علی پیام اکبر آبادی بھی اسی عہد کے ممتاز شاعر تھے، بیشتر فارسی میں اور کمتر اُردو میں شعر کہتے تھے، یہ بھی آگرے ہی سے دہلی گئے، اور پھر وہیں کے ہو رہے۔

اسی طرح میر باقر علی جعفر اکبر آبادی برادر زادۂ نظام الدین ممنون آگرے میں پیدا ہوئے اور آخر عمر میں دہلی چلے گئے۔

میر باقر خرسں اکبر آبادی مرزا مظہر جانِ جاناں کے شاگرد اور سپاہی پیشہ آدمی تھے، سادات آگرہ سے تھے، یہ بھی آگرے سے دہلی گئے اور پھر وہاں سے بنگال چلے گئے۔

میر تقی میر میر عبداللہ اکبر آبادی کے فرزند اور ہمشیر زادۂ سراج الدین علی خاں آرزو تھے، آگرے میں پیدا ہوئے یہیں تعلیم و تربیت پائی، یہیں شعر کہنا سیکھا، اور پھر اپنے باپ عبداللہ کے انتقال کے بعد دہلی چلے گئے، وہاں راجہ ناگرمل کی رفاقت میں کچھ دن بسر کئے، دہلی اب اُجڑ رہی تھی اور لکھنؤ آباد ہو رہا تھا اس لئے دہلی میں آپ کا قیام زیادہ نہ رہا، اور وہاں سے دوسرے شرفا اور اُدبا کی طرح آپ بھی لکھنؤ چلے گئے۔

محمد عارف عارف اکبر آبادی، میر تقی میر کے دوست تھے شیخ شرف الدین ممنون[۵۱] کے شاگرد تھے۔ رفوگری پیشہ کرتے تھے جب میر تقی میر دہلی گئے تو عارف اپنے دوست کی مفارقت برداشت نہ کر سکے اور ترکِ وطن کر کے خود بھی دہلی چلے گئے۔

مغل سلطنت کے آخری تاجدار سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے عہد میں مرزا اسد اللہ خاں غالب اکبر آبادی بھی تعلیم و تربیت اور کافی مشق سخن کے بعد آگرے سے دہلی پہنچے۔ مرزا رفیع سودا، میر اکبر آبادی کی طرح دہلی چھوڑ کر لکھنؤ جا چکے تھے، مگر ان کے شاگرد رشید شاہ نصیر اور شاہ نصیر کے شاگرد ابراہیم علیخاں ذوق دہلوی کی موجودگی میں مرزا غالب اکبر آبادی نے اپنا پرچم سخن ایسا لہرایا کہ حریف بن کر کوئی ان کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکا۔

۱۸۶۹ء یعنی مرزا غالب کی وفات تک، آگرہ اور دہلی کا اتحاد و تعلق شاعرانہ اسی نوعیت سے تھا جس کا ذکر مجملاً میں کر چکا ہوں یعنی آبرو اکبر آبادی، آرزو اکبر آبادی، مظہر اکبر آبادی، مخلص اکبر آبادی، پیام اکبر آبادی، جعفر اکبر آبادی، خرسں اکبر آبادی، میر اکبر آبادی، عارف اکبر آبادی اور غالب اکبر آبادی، یہ سب آگرے ہی کی خاک پاک کے تربیت یافتہ تھے۔ آگرے ہی میں پیدا ہوئے، آگرے ہی میں پروان

---

۵۱ ان کا مولد قصبۂ جاجو ضلع آگرہ ہے اس لئے انہیں بھی اکبر آبادی ہی کہنا چاہئے۔ (مخزنِ نکات)

پڑھے یہیں تعلیم پائی، یہیں شاعر بنے اور پھر دہلی کی مرکزیت نے انہیں اپنی طرف کھینچ کر تاریخ ادب اُردو کا ہیرو بنا دیا۔

یہ میرا خیال یا بیان نہیں ہے، بلکہ اس مضمون کی ترتیب کے وقت میرے مطالعہ کے تحت یہ تذکرے آثار الامراء، تصویر الشعراء، آبِ حیات، مخزنِ نکات، منتخب التواریخ، خزانۂ عامرہ، مظہر الآثار، نتائج الافکار، تذکرۂ سرخوش، مرآۃ العالم، گلشن بیخار اور تذکرۃ الانساب وغیرہ کتابیں اور تذکرے موجود ہیں، ان تذکروں کو پیش نظر رکھ کر میں نے جو کچھ کہا ہے میں اسے ایک تحقیقی نقطۂ نظر یقین کرتا ہوں۔

آگرے اور دہلی کا شاعرانہ تعلق انہیں ارباب فضل و کمال کی ذات گرامی سے پیدا ہوا اور مرزا غالب اکبر آبادی ثم الدہلوی کے عہد پر کچھ عرصے کے لئے ختم ہو گیا،

آگرے میں مرزا غالب کے کئی شاگرد تھے، جن سے مرزا کا سلسلۂ اصلاح و مکاتبت تمام عمر جاری رہا، منشی ہرگوپال تفتہ اکبر آبادی، رائے بہادر شیونرائن آرام اکبر آبادی (سکریٹری میونسپل بورڈ متوفی ۱۸۹۸ء) مرزا تفضل حسین خاں تفضل اکبر آبادی (جو آگرہ میں کتب داری کرتے تھے پھر ریاست الور میں ملازم ہو گئے تھے) مولوی سید مدد علی تپش اکبر آبادی، شیخ عبد المجید سوا اکبر آبادی، بابو ہرگوبند سہائے نشاط اکبر آبادی یہ سب مرزا غالب کے عزیز شاگرد تھے، ان میں اکثر دہلی کے مشاعروں میں بھی شریک ہوئے ہیں۔

مرزا غالب، دہلوی بن جانے کے بعد بھی اپنے مولد و وطن آگرے کو نہیں بھولے وہ اکثر دہلی سے آگرے آتے رہتے تھے خصوصاً جب کوئی نئی غزل کہتے تو جب تک منشی نبی بخش حقیر اکبر آبادی خلف منشی حسین بخش اکبر آبادی کو آگرے آکر نہ سنا دیتے انہیں چین نہیں آتا تھا۔

منشی نبی بخش حقیر اکبر آبادی کی سخن فہمی کے متعلق مرزا غالب خود فرماتے ہیں:۔

اس فرزانۂ یگانہ (یعنی نبی بخش حقیر) کو کس درجہ سخن فہمی و سخن سنجی عنایت ہوئی ہے، حالانکہ میں شعر کہتا ہوں، اور شعر کہنا جانتا ہوں مگر میں نے جب تک اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں جانا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے؟ (اُردوئے معلّٰی)

مرزا غالب کا اکثر آگرے آنا، اُن کے شاگردوں کا دہلی جانا، اور سلسلۂ مکاتبت و اصلاح برسوں جاری رہنا بھی دہلی اور آگرے کے تعلق شاعرانہ پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کا آخری دور برطانوی حکومت کی تاسیس و تشکیل کا ابتدائی زمانہ تھا۔ جب حکومت کو مرکزیت حاصل نہ ہو تو ادب و شعر کی مرکزیت کہاں قائم رہ سکتی ہے؟ مغل سلطنت کے زوال سے جو عظیم سیلاب بے سکونی اٹھا وہ اپنے ساتھ ادبی رجحانات کو بھی بہالے گیا، مرزا غالب کی موت دراصل آگرے اور دہلی کے رابطۂ شاعرانہ کی موت تھی، جہاں تک میرا مطالعہ ہے ۱۸۶۹ء سے ۱۸۹۹ء تک دہلی اور آگرے کا شاعرانہ تعلق تاریخ کے کسی صفحہ سے ثابت نہیں ہوتا۔

اس تمام زمانے میں آگرے اور دہلی کی بساط سخن شعرا سے معمور تھی، مگر ان میں پہلے سے ربط و اتحاد کا فقدان تھا، آگرہ میں ۲۹، ۳۰ سال تک شاعرانہ طوائف الملوکی رہی، شعر سے ذوق رکھنے والے آگرے ہی کے کسی دیرینہ مشق شاعر کو اپنی غزلیں دکھاتے رہے مگر تیر و میر زا نے آگرے سے لکھنؤ اور دہلی پہونچ کر آگرے کا جو نام پیدا کیا تھا اسے باقی رکھنے کی کسی نے کوشش نہ کی۔

فطرت کو آگرے اور دہلی کا یہ قطع تعلق منظور نہ تھا، آخر ان دونوں مراکز ادب کے شاعرانہ تعلق کی تجدید ۱۸۹۸ء میں راقم السطور نے کی یعنی میں نے فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی سے رشتۂ تلمذ پیدا کر کے آگرے اور دہلی میں پھر ایک شاعرانہ تعلق قائم کر دیا،

خدا کا شکر ہے کہ آج "آگرہ اسکول" "دہلی اسکول" کی طرح ایک علیحدہ ادارۂ فکر یہ تسلیم کیا جاتا ہے، مرزا غالب آج بھی ہندوستان کے ادبی معیار کا آخری نقطۂ نگاہ ہیں۔ میر سوز و گداز، سادگی بیان اور تاثرات کی مصوری میں آج تک عدیم النظیر ہیں۔

میاں نظیر کو ہندوستان کا شیکسپیئر ماننے میں ہندوستان کیا یورپ بھی ہم آہنگ ہے۔

شعرائے آگرہ سے اپیل

متقدمین کی اس طول وطویل فہرست کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو متاخرین میں، حضرات مہر و ماہ، ربا، مرتب۔ اصغر، رئیس، واصف، نثار، عالی (فوراللہ مرقدھم) نے بھی آگرہ کا ادبی امتیاز قائم رکھنے میں کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ ہم سب انھیں کے نام لیوا ہیں۔ انھیں کے سجائے ہوئے اور آباد کئے ہوئے گلزار سخن میں نوالیخ ہیں۔ آج بھی یہاں کے اکثر شعرا اطراف ہند میں مشہور ہیں۔ جن کے افادات نہایت احترام و اعتبار کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ دور

بھی ایک دن ختم ہو جائے گا۔ اور اُنکے بعد آپ ہی لوگوں میں سے اُن کے جانشیں چُنے جائیں گے۔ اگر آپ کو ذوقِ شاعری ہے تو استعداد و ذہانت کی پوری قوتوں کے ساتھ فنِ شاعری میں دستگاہ حاصل کرنی چاہیئے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ زمانے کی رفتار کیا ہے۔ زمانہ کدھر جا رہا ہے۔ آپ سے کس قسم کی شاعری کا مطالبہ ہے اور آپ کس طرح زمانے کا ساتھ دے سکتے ہیں؟

غرور و ناز کی ضرورت نہیں خود نمائی و خود رائی کا موقع نہیں۔ کام کا وقت ہے کام کیجئے۔ نام خود چمک جائے گا۔ اگر آپ کے قلم میں قوت، طبیعت میں جودت، خیال میں وسعت اور کلام میں جاذبیت ہے تو دنیا آپ کا لوہا خود مان لے گی۔ اور زمانہ آپ کی اہلیت کا خود اعتراف کرلے گا۔

آج دُنیا کی ہر قوم اور ہر جماعت تنازع للبقا میں سرگرم ہے۔ آپ کو بھی ایسی ہی کوشش کرنی چاہیئے کہ آپ کا کلام اور آپ کا نام باقی رہے۔ اور جس طرح آج آپ متقدمین و متاخرین کو یاد کر کے اُن کے کارناموں کا احترام کر رہے ہیں۔ اسی طرح آیندہ نسلیں آپ کے نام اور کام کی عزت کریں اور آپ کو بقائے جاوداں حاصل ہو جائے۔

حضراتِ مشاعرہ کی داد و تحسیں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس رسمی مطالبۂ نفس کی پروا نہ کیجئے قدرتِ کلام یہ ہے کہ جب شعر کاغذ پر آئے تو پڑھنے والا چند منٹ تک اپنی نگاہ اُس سے ہٹا نہ سکے۔ اس کی نگاہوں میں اس کا دل سمٹ کر آجائے۔ اور جو کچھ آپ نے کہا ہے وہ نگاہوں کے راستے دل میں اُتر جائے۔

میں اُمید کرتا ہوں کہ میری آواز ضرور سُنی جائے گی اور ملک میں وہ دَور بہت جلد آجائے گا کہ ملک کو شاعر کی ضرورت محسوس ہوگی اور شاعر اپنے ملک کا ایک ممتاز پیشوا تسلیم کرلیا جائے گا۔ مگر یہ سب کچھ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم شاعری کو من حیثیت الشاعری اور شعر کو من حیثیت الشعر کام میں لائیں۔ ہمارا کوئی اصول ہونا چاہیئے۔ ہمارا کوئی نصب العین ہونا چاہیئے۔ اور ہمارا کوئی نقطۂ نگاہ ہونا چاہیئے صرف غزل گوئی ہمارے جادۂ عمل کو منزل رس نہیں بنا سکتی۔ قدما کی بات اور تھی اُن کا شاہانہ اور رنگین ماحول اُن سے وہ ہی مطالبہ کرتا تھا جسے وہ اپنا لائحہ عمل بنائے ہوئے تھے۔ حکومت

قدرشناس تھی۔ ملک میں علم وادب کی تحصیل کا ذوق وشوق تھا۔ مگر اب زمانہ بدل چکا ہے۔ آپ کی شاعری غیر شاعر مگر تعلیم یافتہ طبقے میں مفید نہیں سمجھی جاتی۔ اس کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ اسے "کار بیکاراں" کہا جاتا ہے۔ آپ کو اس کا احساس ہونا چاہیئے۔ خدا کے لئے اپنی شاعری کو کارآمد بنایئے۔ اور اس الزام کو شاعری کے سر سے دور کر دیجئے کہ وہ ملک کے لئے مفید نہیں ہے۔

میں قدیم طرز شاعری اور تغزل کے خلاف نہیں۔ خود بھی اسی کا پابند ہوں۔ مگر تھوڑی سی تجدید کے ساتھ۔ اگر ہم اپنا محاذ شاعری واقعات وحادثات عالم کے دوش بدوش قائم کر دیں۔ اس طرح کہ جب کوئی حادثہ ظہور پذیر ہونے والا ہو تو ہمارا شاعر اسکی بھی بدافعت کر سکے جب ملک پر جمود وخمود طاری ہو تو ہمارا شاعر بیداری وحرکت کا صور پھونک سکے اور جب کوئی سانحہ شریک وقت ہو جائے۔ تو ہمارا شاعر اس کی چارہ فرمائی کے لئے قلم دست نظر آئے اور اپنی فکر ونوا سے قوم وملک کو محظوظ رکھنے کی کوشش کرے۔ اس کی آسان تدبیر یہ ہے کہ میرے ہم وطن شعرا غزل گوئی کے علاوہ اصلاحی، اخلاقی، قومی ملکی اور سیاسی نظمیں کہنے کی عادت ڈالیں۔ اپنا کلام موقت الشیوع اخباروں اور رسالوں میں بھیجیں اور اس دائرہ عمل سے ایک قدم آگے بڑھائیں جو ہمارے اکثر گوشہ نشیں اور گمنام نیچہ وطنی بزرگوں کا اب تک مسلک رہا ہے۔

مناظمہ اس کی عملی صورت یہ ہے کہ جہاں مقامی مشاعرے ہوتے رہتے ہیں وہاں "مناظمے" بھی منعقد کئے جائیں اور کوئی موضوع دے کر اس پر شعرا کو بصورت نظم طبع آزمائی کی دعوت دی جائے۔

شاعری کا تعلق لسانیات سے ہے۔ شاعری ہماری زبان میں وہ خزانے جمع کر رہی ہے جو اب سے پہلے بکھرے ہوئے پڑے تھے۔ شاعری ہماری مشرقی روایات کی محافظ ہے۔ اس لئے شاعری کو تفریح محض اور مشاعروں کو رسمی تفریح گاہ بنا دینے کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک تہذیب واخلاق معاشرت اور جذبات کا تعلق ہے ہم اپنی شاعری کو بصورت "اصلاح" پیش کر کے ملک کی رہنمائی کر سکتے ہیں اور ہم اس شاعری سے وہ کام لے سکتے ہیں جو مہاتما گاندھی سول نافرمانی اور دل پر آتش بار جنگوں سے نہیں لے سکتیں۔

تیسرا خطبہ

مشاعرۂ امراؤتی (برار)

۲۹- نومبر سنہ ۱۹۳۰ء

میرے بزرگو، دوستو، اور بچو!

میں آپ کی اس عنایت آمیز کشش کا معترف ہوں جو مجھے اپنے صوبہ سے کھینچکر آج صوبۂ برار کے ایک ایسے خوش سواد شہر میں لے آئی ہے جس کا نام میں نے اکثر سنا تھا۔ لیکن جس کی آب وہوا اور فضائی لطافتوں سے میرے احساسات آشنا نہ تھے۔ میں اسے بھی آپ کے ذوق کی نوازش سمجھتا ہوں کہ آپنے مجھے اپنے ادبی جلسہ کی صدارت تفویض فرماکر میری عزت بڑھائی جو میرے لئے بہرحال سبب افتخار ہے۔ یہ علمی ماحول مجھے بیشتر ارباب علم وکمال سے آباد نظر آرہا ہے۔ اور میرے لئے سب سے بڑی تسکین اس میں ہے کہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں اپنے ماحول کی اہلیت سے مایوس نہیں ہوں۔ امراؤتی جغرافیائی حیثیت سے ایک ایسے صوبہ میں واقع ہے جس کے چاروں طرف کم وبیش تاریخی آثار پائے جاتے ہیں۔ لیکن اُس کے ہمسایہ صوبوں میں دکن کے علاوہ کوئی اور صوبہ ایسا نہیں جس نے لٹریچر میں، اور خصوصاً اردو لٹریچر میں کوئی خاص امتیاز حاصل کیا ہو۔

برار جو آپ کا صوبہ ہے، تاریخی حیثیت سے ہمیشہ صوبۂ دکن کے ماتحت رہا ہے۔ جہاں سلاطین بہمنیہ کے عہد میں، نیز قطب شاہی اور عادل شاہی دور میں علم وادب کے بیش از بیش چرچے رہے ہیں۔ اور جہاں اردو نے بھی دو آخری دوروں میں اپنے لئے ابتدائی گنجائشیں پیدا کی ہیں مگر جنوبی ہند میں صوبہ

برار ہی ایک ایسا صوبہ ہے جس کا نام اُردو شاعری کی تاریخ میں بارھویں صدی ہجری تک نظر نہیں آتا۔ اور یہ ایک حیرت ناک بات ہے۔ کیونکہ دکن ۱۰۱۸ھ میں اُردو شاعری کی نو آفریدہ شاعروں سے درخشاں ہو چکا تھا۔ جس کا ثبوت وجیہ الدین وجدی دکنی کی دو مثنویوں پنچھی نامہ اور تحفۂ عاشقاں سے ملتا ہے۔

ان مثنویوں کی زبان آجکل کی اُردو سے کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہو۔ فارسی نہیں کہی جا سکتی۔ اشعار میں جا بجا کو کی بجائے کوں ہمیشہ کی جگہ نت، دیوانہ کی بجائے دوانہ اور کی بجائے ہور اور کسی کی جگہ کسو استعمال کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ یہ تمام الفاظ قدیم اُردو کی ابتدائی شکلیں ہیں جن میں سے بعض میر کے کلام میں بھی پائی جاتی ہیں وجدی کے بعد ولی دکن کا مشہور شاعر ہوا۔ اور گودڑی کے کلام میں بھی قدامت الفاظ باقی رہی تاہم اُس کے شق یافتہ قلم سے بعض اشعار ایسے بھی نکل گئے۔ جو اگر آج کہے جاتے تو غالباً ان میں کسی مزید تغیر و تبدل کی ضرورت نہ ہوتی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۵۵ھ ہجری تک اُردو شاعری کا صحیح مذاق دکن میں پہونچ چکا تھا اور اس کے بعد زمانہ جس قدر ترقی کرتا گیا۔ آصف جاہی دورِ حکومت کیساتھ ساتھ اُردو نے اور اُردو شاعری نے بھی ترقی کی یہاں تک کہ آج سلطان العلوم اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں خلد اللہ ملکہٗ کے دورِ سلطنت میں دکن کا پایۂ تخت، حیدرآباد، اُردو کی ایک یونیورسٹی اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ یہ ایک ایسا خصوصی امتیاز ہے جو ہندوستان کے کسی دوسرے صوبہ کو ابتک میسر نہیں ہوا۔

میرا مقصد یہ ہے کہ ادب گاہِ دکن سے اس درجہ قریب ہونے کے باوجود بھی برار، ادب کے اُس لطیف ترین شعبے میں کوئی قابلِ ذکر ترقی نہ کر سکا۔ جس کا نام فنِ شعر ہے۔

مجھے بظاہر اس کا ایک ہی سبب نظر آتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ برار کا ماحول بدقسمتی سے ہمیشہ غیر شعری رہا ہے۔ مرہٹی۔ گجراتی اور دکنی زبانوں کے غلبہ نے اُردو کو یہاں اُبھرنے کا موقع نہیں دیا۔ اور اُردو صرف تجارتی اور معاشرتی ضروریات کے مطابق شائستہ حصول سمجھی گئی۔ ظاہر ہے کہ جب زبانِ اُردو کا مذاق ہی نہ تھا۔ تو ادبِ اُردو کی نشو و نما کیونکر ہو سکتی تھی، مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ

اب اچلپور، اکولہ اور امراؤتی وغیرہ مقامات میں شاعرانہ مذاق پیدا ہو چلا ہے اگر اس مذاق کی نشوونما احتیاط وانضباط کے ساتھ ہوتی رہی تو مجھے یقین ہے کہ صوبۂ برار بھی ایک دن صوبۂ دکن کی طرح ادب اُردو کا گہوارہ بن جائے گا۔

حضرات! میں اس انحطاط وزوال سے اچھی طرح آگاہ ہوں جو فنّ شعر پر طاری وساری ہے۔ میں اُس عام غیر دلچسپی سے بھی لاعلم نہیں جو اُردو داں طبقہ کو اس فن لطیف سے ہوتی جارہی ہے۔ لیکن مجھے کہنے دیجئے کہ یہ انحطاط، یہ زوال، اور یہ عدم دلچسپی ہماری ہی بے توجہی کے نتائج ہیں ہم نے خود اس فن لطیف کو اپنی سہل پسندیوں سے اس قابل بنا دیا ہے کہ آج سوائے وقتی تفریح کے شاعری کا کوئی اور مقصد معلوم نہیں ہوتا۔

لیکن حقیقت کچھ اور ہے، صورتِ حال اس کے خلاف ہے اُردو شاعری نے نظامِ حیات پر جس قدر احسان کیا ہے وہ بجائے خود ایک مبسوط تاریخ ہے۔ شاعری ہمارے تمدن میں، ہماری معاشرت میں، ہماری سیاست میں، اور ہماری عمرانی زندگی کی رگ رگ میں جذب ہو چکی ہے۔ مردہ قوموں کو اُبھارنا، بجھے ہوئے احساس کو مشتعل کرنا، اور عساکر کے قوائے عمل میں جزر ومد پیدا کرنے کے علاوہ الفاظ کے مخارج منضبط کرنا، زبان کے محاورات محفوظ کرنا۔ سوئی ہوئی فضاؤں کو جگانا، جاگنے والوں کو عمل کے لئے تیار کرنا اور تخیل کو اُن ارتقائی خطوط پر پہونچا دینا۔ جہاں دوسرے فنون لطیفہ کی رسائی ناممکن ہے، صرف شاعر کا کام ہے۔

معزز حضرات، شاعری اور شاعر کا یہ درجۂ عروج، اور یہ ہمہ گیری موجودہ ارتقائی دور کا کوئی نیا معجزہ نہیں۔ بلکہ آپ تاریخ عالم کے صفحات اُلٹئے آپ کو معلوم ہوگا کہ ازمنۂ قدیم میں بھی مذہبی احکام نظم ہی میں قلمبند کئے جاتے تھے۔ سنسکرت میں عرفان حقیقی اور فلسفہ وحکمت کا اشاعتی کام نظم ہی سے وابستہ تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں جبکہ عرب میں کتابت کا دستور نہ تھا ہزاروں اشعار اہل عرب کو زبانی یاد تھے۔ اُردو کی تخلیق سے صدیوں پہلے ہندوستان میں شاعری موجود تھی۔ کرشن اور بودھ کی مقدس تعلیم کا کافی حصہ قدیم ایرین زبانوں میں منظوم موجود تھا۔ ان

زمانوں کے بعد والمیک اور تلسی داس کی دل موہنے والی نظمیں اور حقیقت کے چہرے کو بے نقاب کرنے والے منظوم کارنامے آج بھی عہد گزشتہ کی پاکیزہ اور کبھی نہ مٹنے والی یادگاریں ہیں۔ کالیداس اور کبیر کے منظوم رشحات سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی خلقی شاعر ہونے کے اعتبار سے، عرب کائناتِ ادب میں کتنے ہی سابق اور ممتاز کیوں نہ ہوں لیکن یہ کہنا ایک تاریخی غلطی ہے کہ اُن کے سوا ساری دُنیا اس عالمگیر جذبۂ شعری سے خالی تھی۔ گو وہ اپنے سوا ساری دنیا کو عجم ہی سمجھتے تھے۔ ہندوستان کا ذکر میں ابھی کر چکا ہوں۔ یورپ کے متعلق بھی تحقیق ہو چکا ہے۔ کہ وہاں سب سے پہلا شاعر چاسر تھا۔ جس کا زمانہ یورپ کے عہدِ بیدار سے صدیوں پہلے ختم ہو چکا ہے۔

اُردو شاعری اپنی ہمسایہ زبانوں کی شاعری میں سب سے چھوٹی ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں۔ کہ اُردو شاعری نے اپنی مٹھاس، دل آویزی اور جذبات آفرینی میں حتی الامکان دوسری زبانوں کی شاعری کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ اور آج اُردو شاعری محاکات آفرینی، خیالات پیدائی۔ اور جذبات آرائی میں کسی زبان کی شاعری سے پیچھے نہیں ہے۔

بدقسمتی سے اُردو اُس وقت پیدا ہوئی جب کہ دوسری زبانیں اپنے شباب کی منزلیں طے کر چکی تھیں۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ واضعانِ زبان نے اسے فارسی کا تقلیدی رنگ دینے اور فارسی اسلوب پر ڈھالنے میں بہت جلدی کی، اور حقیقت یہ ہے کہ ماحول کی مجبوریوں کی وجہ سے کوئی دوسرا رنگ دیا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اسلامی سلطنت اور مسلمان، جس معاشرت اور تمدن سے متاثر تھے اسی سے اُردو شاعری بھی متاثر ہوئی۔ حالانکہ مقامی اور فطری اعتبار سے، اسے ہندی شاعری سے متاثر ہونا چاہیے تھا۔

یہ تقلیدی رنگ اس قدر گہرا ہوتا چلا گیا، کہ گو ملک میں اُردو کے ملک الشعرا اور خاقانیٔ ہند پیدا ہوئے لیکن صدیاں گزر جانے پر بھی کوئی مجدد یا مجتہد پیدا نہ ہو سکا۔

ہماری شاعری کی اساس، عربی عروض پر قائم ہے، موضوعات ایرانی شاعری کے مقروض منت ہیں۔ معاملات اور واردات میں شعرائے متاخرین، غالب، داغ، امیر اور جلال نے ایرانی معاشرت

سے بچ کر ایک راستہ ضرور نکالا لیکن وہ کبھی خطِ رخسار، بندِ قبا، اور کاکل و کلاہ سے اپنے موضوع کو آزاد نہ کر سکے۔ جو ایرانی مذاقِ شاعری کے عناصرِ ضروری تھے گو زمانہ ترقی کر گیا ہے، مغربی حکومت نیز ادبیاتِ مغرب کے اثرات سے ذہنیتوں میں ایک انقلاب پیدا ہو چکا ہے اور ملک میں شعرا کا ایک طبقہ ایسا موجود ہے جس کی شاعری اصولی طور پر فطری کہی جا سکتی ہے۔ تاہم شعرا کی اکثریت، اور شاعری کی دنیا آج بھی اسی تقلید میں ایک بڑی حد تک آلودہ ہے۔

اس قسم کی شاعری، جس میں تقلید اور غیر فطری جذبات کے زیادہ سے زیادہ جراثیم پائے جاتے ہیں۔ ایک رواجی بدعت، ایک بے اصولی۔ اور ایک غلط ذہنی تربیت کے ماتحت مروج ہے۔ جس میں عام اور پست نیز قدیم ترین معاشرت کی تصویریں کھینچی جاتی ہیں۔ وصل و وصال ہمخوابی و ہم آغوشی، بوس و کنار اور ایسے ہی مخرب اخلاق اور تہذیب سوز مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ پھر رونا یہ ہے کہ یہ موضوعات بھی اُس صادق جذباتی کیفیت سے خالی لہجے میں ظاہر کئے جاتے ہیں جس سے تقلید اور نقالی تو ظاہر ہو جاتی ہے لیکن حقیقت کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔

اگر اس قسم کی شاعری پر ملک کا تعلیم یافتہ اور مہذب طبقہ قہقہے بلند کرتا ہے تو میرے خیال میں وہ حق بجانب ہے اس لئے کہ ایرانی معاشرت، اور ایرانی شاعری جس سے اُردو شاعری اوّل اوّل متاثر ہوئی تھی۔ اور آج تک متاثر ہے خود اس درجہ انقلاب پذیر ہو چکی ہے کہ اگر آج طہرانیوں کے سامنے حافظ یا نظیری کے تتبع میں کوئی غزل پڑھی جائے تو وہ بھی ایک غماز تبسم کے علاوہ کچھ اور شاعر کی خدمت میں پیش نہ کر سکیں گے۔

ہندوستان کے اُردو شاعر کی سادہ لوحی اور پریشان خیالی کا اندازہ یوں فرمایئے کہ ایران میں زلفوں پر مقراض چل چکی، بندِ قبا ٹوٹ چکے، کجکلاہی کا دور ختم ہو چکا، مگر ہمارا ہندوستانی شاعر ابتک خیالی زلفوں کی درازی سے طولِ شبِ ہجر کی پیمائش کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔

جب طولِ شامِ غم سے بہر دل کی وحشتیں سایہ سمجھ لیا تری زلفِ دراز کا

حقیقت یہ ہے کہ اُردو شاعری کے طالب علم کی زندگی اصولاً غلط شروع ہوتی ہے۔ شاعروں

کی لائیسنس سے مستثنیٰ شرکت سے اس کے دل میں ایک تحریکی جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ شعر کہنے لگتا ہے، ابتدائی نقائص و اغلاط سے بچنے اور آگاہ ہونے کے لئے اُسے کسی ماہر فن سے استمداد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ اس میں بھی بہت جلد کامیاب ہوجاتا ہے مگر اب اس کے رجحانات اور خیالات اخلاقی طور پر تابع اور محدود ہو جاتے ہیں۔ وہ ادب اور احترام کے اُس جذبہ سے مجبور ہوکر، جو مشرقی اقوام کا خاصۂ فطرت ہے اُسی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے جس پر اس کا اُستاد یا رہنما اُسے لیجاتا ہے۔

کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسم منزل ہا

ایک عمر اسی پیروی میں گزر جاتی ہے۔ اور وہ ایک مصنوعی جہانِ خیال میں عمر کا کافی حصہ گذارنے اور ایک طویل مشق کے بعد انھیں فرسودہ موضوعات کو کسیقدر پختگی کے ساتھ ظاہر کرنے لگتا ہے یہ گویا اُس کی معراج ہوتی ہے۔ اس معراج کے بعد جو اکثر تیس یا چالیس برس کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اختصار عمر اور قربتِ فنا کے تخیل سے اس کے قلب میں مذہبی یا صوفیانہ۔ یا روحانی قسم کا ایک جذبہ فطرتاً پیدا ہوتا ہے۔ یہ جذبہ حقیقی شعر گوئی کا جذبہ ہوتا ہے۔ جس کی تکمیل کے بعد اُس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ یہ آخری منزل شاعر کی پہلی منزل ہونی چاہیے تھی۔ یعنی ایک شاعر کے لئے پہلی منزل منزلِ احساس، دوسری منزل، منزلِ تاثر، اور تیسری منزل، منزلِ تفکر ہوتی ہے۔ ان منازل سے گذر جانے کے بعد وہ جو کچھ کہتا ہے وہ اتنا موثر اور دل دوز ہوتا ہے کہ کائنات اُس کے استقبال کے لئے دل بدست نظر آتی ہے۔ غالب اسی مقام کی تفسیر اس طرح کرتا ہے ؎

ہے پرے منزلِ ادراک سے اپنا مسجود ۔۔۔ قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

اسی سلسلہ میں، میں چاہتا ہوں کہ غزل اور تغزل کی تشریح بھی کردوں تاکہ یہ مسئلہ تاریکی میں نہ رہے، غزل فارسی اور اردو اصناف نظم میں ایک ایسی صنف ہے جس کا پتہ دوسری زبانوں میں نہیں ملتا۔ ایک غزل کی جامعیت بعض اوقات ہزاروں نظموں سے بڑھ جاتی ہے۔ تغزل اُس رنگ اور اسلوب بیان کو کہتے ہیں جو غزل میں استعمال کیا جاتا ہے۔ تغزل کا تعلق انسان کی لطیف ترین روحانیت اور نفسیات سے ہے۔ حسن و عشق، یاس و امید، وصل و فراق،

انتظار و کامیابی اور اسی قسم کی مختلف فطری حالتوں کو گہرے تاثر کے ساتھ مصور کرنے کا نام تغزل ہے۔ غزل کی تعریف میں "با معشوق سخن گفتن" اور تغزل کی تعریف میں "معاملہ بندی" کہہ کر خاموش ہو جانا غزل اور تغزل دونوں کی توہین ہے۔ تغزل کو قدرتی طور پر نسائیت سے پاک اور روحانیت سے لبریز ہونا چاہئے۔ تغزل کے مختلف اسکول ہیں۔ لیکن حقیقی تغزل وہی ہے جس کی بنیادیں جذبات لطیفہ پر قائم کی گئی ہوں۔ اور جس میں ابتذال و رکاکت کا شائبہ تک نہ ہو۔

میں غزل میں پاکیزہ تغزل کا مخالف نہیں۔ لیکن شاعری کو تغزل محض تک محدود رکھنا بھی نہیں چاہتا میں جانتا ہوں کہ اردو شاعری میں "غزل" اس وقت ایک مدقوق مریضہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اندیشہ ہے کہ اگر اسے صحیح صورت میں زندہ رکھنے کی کوشش نہ کی گئی تو وہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے گی۔

دنیا چلا رہی ہے زمانہ چیخ رہا ہے کہ خدا کے لئے تقلید محض کی لعنت کا جوا اپنی گردنوں سے اتار کر پھینک دیجئے اگر تقلید ہی کرنی ہے تو عرب اور یورپ کی تقلید کیجئے جہاں شاعری کا موضوع کم از کم غیر فطری تو نہیں ہے۔ اور جہاں مناظر فطرت کی تصویر کشی اور حقیقی جذبات کی ترجمانی کا نام "شاعری" ہے۔ عام اس سے کہ اس کا تعلق حسن سے ہو یا محبت سے، معاشرت سے ہو یا معیشت سے۔

لیکن میں پوچھتا ہوں کہ آخر تقلید ہی ہمارا نصب العین کیوں ہو؟ ہم اپنے ذہنوں کو دوسروں کے دل و دماغ سے نکلی ہوئی پیداوار کی جگالی کے لئے مجبور کیوں کئے ہوئے ہیں اور ہم بیگانوں کے نقش قدم پر چلنے کو تدبیر منزل کیوں سمجھے ہوئے ہیں؟ کیا ہندوستان کا ماحول ہماری شاعرانہ اور تخیلی تشنگی کو نہیں بجھا سکتا؟ کیا ہندوستان کا سواد شعریت آفریں اور شعر نگار نہیں ہے۔ کیا گنگا اور جمنا کی موجیں ٹیمس، نیل اور نہر رکن آباد کا پر کیف تموج نہیں پایا جاتا؟ کیا ہمارے ملک کے جنت فریب باغوں میں بلبل سے بہتر کوئی خوش الحان طائر موجود نہیں؟ کیا ہم کوئل اور پپیہے کو محض اس تعصب کی وجہ سے اپنی شاعری میں دعوت شرکت دینا نہیں چاہتے کہ ہندی یا بھاشا شاعری میں ان کے نغمے گونج چکے ہیں؟ کیا جمالیاتی ذوق کی نشو و نما کیل، اور مصرف صحیح کے لئے، معیار نظر پہ

صحیح اُترنے والا جمال، اس سرزمین حسن و محبت میں موجود نہیں؟ کیا ایران کے فرہاد و شیریں۔ نجد کے قیس و لیلیٰ۔ مصر کے یوسف و زلیخا۔ اور عراق کے وامق و عذرا سے بہتر رومان، کنگ اور تارا، نل اور دمن۔ ہیر اور رانجھا کے وطنی افسانوں میں نہیں ملتا۔ کیا ماذا کرشن کے لئے صرف موسیٰ بن عمراں اور طور سینا مخصوص ہیں؟ اور بودھ یا کرشن یا ایسے ہی دوسرے عرفاں یافتہ انسانوں کا ذکر کرنا عیوب کلام کی کوئی شاخ ہے؟ اور کیا دارورسن کی روایات زندہ کرنے کے لئے ہمیں منصور حلاج کے علاوہ کوئی ملکی مثال کسی عہد میں نہیں ملتی؟

میں بلاخوف تردید عرض کرتا ہوں کہ اگر ہم آج اپنی شاعری کے تقلیدی موضوعات بدل دیں اور اپنے وطنی ماحول کے سرد و گرم اور رطب و یابس سے متاثر ہو کر نشاطیہ یا المیہ اشعار کہیں تو ہماری شاعری دوسری زبانوں کی شاعری سے نہ صرف ممتاز ہو سکتی ہے بلکہ آج بھی ہم میں، ہمارے ملک میں، اور ہماری جماعتی وسعت میں، حسان، فردوسی اور شیکسپیر سے بہتر شاعر پیدا ہو سکتے ہیں۔

بنگالی، سنسکرت، بھاشا، مرہٹی۔ گجراتی غرض کہ کسی زبان کی شاعری کو لے لیجئے، کسی میں اتنے غیر فطری، غیر ضروری، اور غیر حقیقی جذبات نہ ملیں گے۔ جتنے آج ہماری اُردو شاعری میں بھر دیئے گئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہماری نقالی، ہمارا بہروپیا پن۔ یعنی ہماری تقلیدی ذہنیت ہمیں اربابِ علم و فضل کی نگاہوں میں ذلیل کر رہی ہے۔ اور ہم اپنی اس ذلت، اس توہین۔ اور اس تذلیل و تضحیک کو اپنے پندار کی غلطی سے سبب نازش سمجھ رہے ہیں۔

"العمدہ" عربی زبان میں تنقید کی ایک مسلمہ کتاب ہے اس میں شعر کی تعریف یہ ہے کہ "شعر فنون لطیفہ کی بہترین صنف ہے جس میں مادیت نہیں ہوتی۔ بلکہ مطلق روحانیت ہوتی ہے" ارسطو نے بھی اپنی کتاب تنقید میں شعر کی تعریف یہی کی ہے کہ اُسے مادی خیالات و رجحانات سے بالاتر ہونا چاہئے شعر کے علاوہ جس قدر فنون لطیفہ ہیں، یہاں تک کہ موسیقی بھی سب کی اساس مادیت پر قائم ہے۔ لیکن شعر الہام کی اعانت سے براہِ راست شاعر کے دماغ میں وارد ہوتا ہے اور خیال اسے مرتسم کر لیتا ہے۔ جب شعر مطلق روحانیت اور ایک زائیدۂ الہام چیز ہے تو کیا اُس کے متکلم کو، اور اُس کے مصنف کو اس

مادّی دُنیا میں، تمام عالم اور تمام کائنات پر حاوی نہ ہونا چاہئے؟

افسوس کہ ایسا نہیں ہے ——— کیوں نہیں ہے؟ صرف اس لئے کہ ہم نے شعر کی روحانیت میں مادّی اختلاط سے ایک غلط چیز کا اضافہ کرلیا ہے۔ ہمارے خیالات ردیف وقافیہ کی پابندیوں میں محدود ہیں۔ ہمارے ذہن کا رُخ الہام کدۂ حقیقت کی طرف نہیں۔ ہم صنم کدۂ مجاز میں اپنی جبینِ فکر، رواسم، رواج، تقلید اور تائید کے خود ساختہ بتوں کے سامنے رگڑ رہے ہیں۔ ہمارا سر جھکا ہوا ہے۔ ہماری نگاہیں نیچی ہیں۔ اور ہم نے بالکل بھلا دیا ہے کہ اس فضائے پست کے علاوہ جو ہمارے ذہنِ خیال کے سامنے پھیلی ہوئی ہے۔ کوئی بلند فضا اور بھی ہے۔ جہاں ہمارے خیالات واحساسات کو پرواز کرنے کی اجازت ہے۔ اور جہاں ان خذف پاروں سے زیادہ قیمتی، تاروں کی معصومیت سے پیدا شدہ گوہرِ شاہوار ہمیں مل سکتے ہیں۔ اور ہم روح القدس کی امداد وتائید سے ظلمت کدۂ عالم کو منوّر وتجلی کرسکتے ہیں۔

مجھے اکثر یونیورسٹیوں، کالجوں، اور اسکولوں کے مشاعروں میں کسی نہ کسی حیثیت سے شریک ہونے کا موقع ملا ہے ایسے ہر انسٹی ٹیوشن، اور ایسی ہر درسگاہ میں مجھے طلبا سے توقع رہی ہے۔ کہ وہ میرے سامنے اور تمام مہذب وتعلیم یافتہ سامعین کے سامنے، انتہائی بلند خیالی، اعلیٰ ترین اخلاق، اور پاکیزہ ترین معیارِ ذوق کے نمونے پیش کرینگے مگر مجھے کسقدر مایوسی ہوئی جب اُن کے اساتذہ اُن کے پروفیسروں ان کے اعزا، اُن کے احباب اور سنجیدہ سے سنجیدہ سامعین کی موجودگی میں، میں نے ان کی زبان سے اس قسم کے اشعار سُنے کہ ؎

وصل کی رات ہے اب شرم وحیا رہنے دو
اپنے سینے پہ مرا ہاتھ ذرا رہنے دو

خیال کی عمومیت درکاکت، شعر کی عام فہمی، اور وقتی تفریح پر ہر طرف سے "واہ واہ سبحان اللہ" کی سقف پاش آوازیں بلند ہوئیں۔ اور صاحبزادے مجھک مجھک کر سعادتمندانہ سلیقہ کے ساتھ ہر آواز پر سلام وآداب کرنے لگے۔

حضرات، میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آخر یہ کیا مصیبت ہے، کیا طلبا کی ادبی تعمیر و تہذیب کا یہی طریقہ ہے۔ اور کیا اس تخریب کی اصلاح ضروری نہیں؟

میں مقتدر شعرا، اور معزز طلبا سے معافی خواہ ہوں کہ میں نے اُن کی بہت سبع خراشی کی لیکن مجھے یقین ہے کہ میں نے اُن کا وقت ضائع نہیں کیا۔ اس موضوع پر ہنوز تشریحی تقریر کی بہت زیادہ گنجائش ہے۔ میں نے اُن کے سامنے شاعری کے موجودہ انحطاط کے مختصر اسباب بیان کرکے اختصار و اجمال کے ساتھ انھیں بتایا ہے کہ ہماری شاعری اگر بدنام ہے تو اس کا سبب ہماری ہی غلط روی ہے۔ ہم دانستہ اپنے ماحول کو گمراہ اور برباد ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔ ہم نے اپنی شاعری کو تنگ خیالی، پستیٔ فکر، اور غیر فطری رجحانات میں مقید کر دیا ہے۔ لیکن ہم جب چاہیں ان حدودِ متعینہ سے جست کرکے باہر نکل سکتے ہیں ہم جب چاہیں اپنی ذہنیت کو ارفع، اپنے خیالات کو بلند، اور اپنے احساسات کو بلند تر بنا سکتے ہیں۔

اس تمام تقریر کا مقصد یہ ہے کہ ہماری شاعری اجتماعی خصوصیات کی حامل ہونی چاہیئے اور زیادہ سے زیادہ نظری۔ ہمارا ہر شعر اپنی جامعیت، اکملیت اور موضوع کے اعتبار سے ایک مکمل نظم ہونا چاہیئے۔

ہماری ہر نظم ضروریاتِ زمانہ کے مطابق، اہلِ ملک اور فرزندانِ وطن کے لئے مستقبل کا ایک پیغام ہونی چاہیئے، اور ہماری ہر غزل حقائق و معارف اور جذباتِ عالیہ کا ایک ایسا آئینہ ہونا چاہیئے جس میں ہمارے نوجوان، ماضی، حال، اور مستقبل کا صحیح ادراک کر سکیں، جو ہمیں تدبیرِ منزل اور شاہراہِ ترقی بتا سکے اور بلند و لطیف محاکات سے ہماری روح میں کیف و تسکین کی موجیں پیدا کر سکے۔

چوتھا خطبہ

مشاعرۂ بزمِ ادب - ڈیرہ دون

۱۳ - دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء

معزز حضرات!

میں اُس عظمت کے اعتراف میں آپ کا شکر گزار ہوں جو اس ادبی مجلس میں بصورت صدارت آپ حضرات کی طرف سے مجھے عطا فرمائی گئی ہے۔ کسی شخصی حیثیت سے نہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ میں کامل ۳۶ سال سے ادب اُردو کی خدمت کر رہا ہوں مجھے حق ہے کہ میں اپنے ناچیز خیالات آپ حضرات کے سامنے پیش کروں، ایسے خیالات جن کا تعلق ادب اور شعر سے ہے۔

جہاں تک میری ناقص یادداشت مجھے مدد دیتی ہے، مشاعروں میں خطبہ خوانی کا محرکِ اوّل میں ہوں - اور سب سے پہلا خطبہ سنہ ۱۹۲۲ء کے آل انڈیا مشاعرۂ گیا میں میں نے پڑھا ہے۔

نئی ناقوس میں پھونکی ہے جس نے روح وہ میں ہوں ۔ ابھی موجود ہیں اہلِ کلیسا دیکھنے والے

آپ خود غور فرمائیں کہ جب مجلسِ مشاعرہ ایک ادبی مجلس ہے جب شعر و شاعری علم و ادب کی ایک صنف ہے تو دوسری سیاسی، معاشرتی، اخلاقی قومی اور تعلیمی مجلسوں کی طرح مجلسِ مشاعرہ کا افتتاح بھی خطبۂ صدارت سے کیوں نہ ہو؟ کیا ضرورت ہے کہ حکومت کا کوئی فرد، ضلع کا کوئی سرمایہ دار شہر کا کوئی شاہ لاک، یا ملک کا کوئی اور مشہور شخص جو غیر شاعر ہو۔ ہماری شعری اور ادبی مجلس کا صدر

بن کر ہم پر خاموش حکومت کرے۔ کیا ہماری جماعت میں خطیبوں اور ادیبوں کی کمی ہے۔ اور کیا ہم میں اپنی جماعتی مجالس کی صدارت و قیادت کی اہلیت نہیں ہے؟

وجاہت و امارت کی مرعوب کن شان کے ساتھ مسند صدارت پر ایک غیر شاعرانہ حیثیت سے کسی معزز شخصیت کے برائے نام رونق افروز ہونے سے بہتر یہ ہے کہ ایک غریب شاعر جو اس فن لطیف پر عبور رکھتا ہو جو ادبی دنیا کے مالہ و ماعلیہ سے واقف ہو ہمارا صدر بنے اور صدر بننے کے بعد ہمارے سامنے اپنے تجارب اور ذخائر معلومات سے کچھ ایسی باتیں پیش کرے جو ہماری ادبی اور فنی ترقیوں میں مدد دے سکیں۔ اسی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے مشاعروں میں "خطبہ خوانی" کے رواج کو، اپنی پوری قوتوں سے، اپنے جرائد کی قوتوں سے، اور اپنے احباب و تلامذہ کی قوتوں سے وسعت دینے کا کام عملاً شروع کر دیا ہے اور آپ سن کر مسرور ہوں گے کہ میں اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوں۔

غالباً آپ بھی میری تائید فرمائیں گے، اور آئندہ کبھی کسی ایسے نمائشی مشاعرہ میں شریک نہ ہوں گے جس کا صدر کوئی غیر شاعر ہو یا جس میں خطبۂ صدارت پڑھے جانے کا یقین نہ ہو۔ اور جس کا مقصد صرف غزلخوانی اور رسمی داد و تحسین تک محدود ہو۔

حضرات! میں آپ کا عزیز اور قیمتی وقت جو آپ نے آرام دہ لحافوں گرم کمروں، اور میٹھی نیندوں کا ایثار کر کے اس ادبی مجلس کے لئے وقف کیا ہے، اُردو شاعری کی ادبیات۔ مراکز ادب کی تعیین و تخصیص گل و بلبل کے ترک کرنے کی حدیث کہن اور اُردو کی داستان دیرین سنا کر ضائع نہیں کروں گا۔ بلکہ میں آپ کے سامنے ایک ایسی بات پیش کروں گا۔ جو آپ کے لئے باعتبار موضوع نئی ہوگی۔ اور جس کے سننے کے بعد آپ کا ذہن غور و فکر کے لئے مجبور ہو جائے گا۔

آج ہماری اُردو شاعری کی پیدائش کو تقریباً تین سو برس گزر چکے ہیں، اس تمام عرصہ میں ہماری شاعری عرب اور ایران کی مقلد رہی ہے۔ اور کس قدر تعجب و حیرت کی بات ہے کہ اس طویل مدت میں آج تک کوئی مجدد اور کوئی مجتہد ایسا پیدا نہ ہو سکا جو ہماری شاعری کو "ہماری شاعری" بنا کر

کم از کم موضوعی اور اساسی تقلید ہی سے آزاد کر دیتا۔

فن شاعری کی اساس علم عروض پر قائم ہے۔ اور عروض خلیل ابن احمد اور ابو الحسن اخفش عربی کی ایجاد ہے۔ جو بحریں اہل عرب نے ایجاد کیں ان کا اتباع فارسی شعراء نے بھی کیا۔ لیکن یوسف نیشاپوری۔ اور بزرجمہر وزیر نوشیرواں نے اُن میں بعض تصرفات کئے اور بعض عربی بحریں ترک کر دیں۔ ہم نے بھی عربی اور فارسی ایجادات میں ترک و اختیار سے کام لیا۔ لیکن کبھی ہمیں اتنا حوصلہ نہیں ہوا کہ ہم اپنی شاعری کے لئے اپنی بحریں ایجاد کرتے، اپنی زبان میں اوزان مرتب کرتے، اور فنی اصطلاحیں وضع کر کے ہندوستانی ذہنیت کی خلاقی کا ثبوت دیتے۔

ہندوستان کی ہر قدیم زبان میں شاعری موجود ہے۔ لیکن ہر زبان کے ذاتی قواعد بھی موجود ہیں۔ اُن کے ذاتی مصطلحات بھی موضوع ہیں۔ ہندوستان کی سب سے زیادہ مشہور زبان ہندی کو لے لیجئے۔ گو اس کے وجود سے پہلے سنسکرت ایک مکمل زبان ہونے کی حیثیت سے ملک میں موجود تھی اور سنسکرت شاعری کے قواعد بھی منضبط تھے۔ لیکن ہندی شاعر نے اُس کا محتاج اور مقلد ہونا پسند نہ کیا۔ اور شاعری کے لئے اپنے ذاتی قواعد و قوانین الگ بنا لئے۔ جن کا نام "کوتا" رکھا گیا۔ اسی اعتبار سے ہندی میں شاعر کو "کو" اور شعر کو "کوت" کہتے ہیں مصرع کو "پد" اور نظم کو "پد" لکھتے ہیں۔ دوہا، چوپائی، سورٹھا، تروٹک چھند، من ہرن چھند، لاؤنی، کنڈلیا، سوّیا، وغیرہ نظم کی سیکڑوں قسمیں وضع کی گئیں اور مصرع طرح کے لئے "سمسیا" ایک خاص لفظ مقرر کیا گیا۔

ہندی میں تقطیع کرنے کے لئے ارکان کی ضرورت نہیں۔ بلکہ تقطیع صرف ماتراؤں اور لے یعنی بحر کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ ہر سُر اور ویَنجن دو قسم کی ماترائیں ہیں۔ دونوں مصرعوں میں ہم تعداد ماترائیں لانے سے ایک خاص دُھن میں ہندی شعر مرتب ہو جاتا ہے۔ پھر اصناف نظم کا تسمیہ یوں کیا جاتا ہے کہ چار ٹکڑوں کا ایک شعر جس کے ہر مصرعہ میں ۱۶ ماترائیں ہوں "چوپائی" کہلاتی ہے اور چار ٹکڑوں کا ایک شعر جس کے آخر میں قافیہ ہو "دوہا" کہلاتا ہے۔ اگر قافیہ درمیان میں آجائے تو

سورٹھا ہے۔ ۲۴ حروف کا چھند ہو تو اُسے سوّیا کہتے ہیں۔ کبھی "وزن" یعنی الفاظ کی یکسانی اور ہم تعدادی سے بھی شعر کا وزن قائم کیا جاتا ہے۔ ایسے شعر "ورن چھند" کہلاتے ہیں اور دوسرے "ماترا چھند"۔

اس کا فائدہ یہ ہے کہ ایک موزوں طبع ہندی شاعری کا طالب علم، لَے اور ماتراؤں کے ذریعے نہایت آسانی کے ساتھ بے تکلف ہندی شعر مرتب کر لیتا ہے اور اُسے ہماری طرح "مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن" کی گردان نہیں کرنی پڑتی۔

ہندوستان کی دوسری زبانوں کا بھی قریب قریب یہی حال ہے مگر اُردو شاعری کی بساط پر وہی پرانے مہرے سجھے جا رہے ہیں۔ جو ابتداءً صرف اس لئے استعمال کئے گئے تھے کہ اُردو زبان نامکمل تھی۔ کلاسیکل نہ تھی۔ اور اس کا خزانہ تعمیری سامانوں سے خالی تھا۔

اودھ کے دورِ عروج و اقبال میں، جب نواب سعادت علی خاں تختِ حکومت کی زینت تھے، انشاء اللہ خاں انشا کو سب سے پہلے اُردو میں یہ کمی محسوس ہوئی اور انشا نے اُردو شعر کی تقطیع کے لئے بعض اُردو ارکان وضع کئے۔ مثلاً "مفاعیلن" کے لئے "پری خانم"۔ "فعلان" کے لئے "بی جان" "فعلن" کے لئے "خانم" وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح اگر انہیں اپنے اس مصرع کی تقطیع کرنی ہوتی کہ "تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں" تو وہ بجائے "مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن" کے "پری خانم پری خانم پری خانم پری خانم" کہہ کر اس ضرورت کی تکمیل کر سکتے تھے۔ لیکن یہ اختراع مزاح کا پہلو لئے ہوئے تھی۔ اس لئے کہ جب عروض و ضرب یا صدر و ابتدا کو مقبوض و مکفوف کیا جاتا تھا تو کہیں "پریخ" رہ جاتا تھا اور کہیں "پری خاں" ہو جاتا تھا۔ لہٰذا خوش وقتی کے لئے نوابی دربار میں "عروض انشائی" کچھ عرصہ تک جاری رہی۔ اور چونکہ یہ اختراع کوئی علمی اختراع نہ تھی اس لئے باقی نہ رہ سکی، نہ اسے کسی نے رواج دینے کی طرف توجہ کی۔

بیشک عربی اور فارسی مسلمانوں کی قدیم قومی زبانیں ہیں۔ جو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں آئی ہیں، اس لئے عقیدت کی طرف سے یہ تنبیہہ کی جا سکتی ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے انہیں زبانوں کی تقلید ہمارے لئے منتہائے سعادت مندی ہے۔ لیکن یہاں

عقیدت کا سوال نہیں، علم و فن کا سوال ہے۔ ہم عقیدتاً اور مذہباً عربی و حجازی مراسم کی تقلید کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں لیکن جب وطنیت کے اعتبار سے لسانی سوال پیدا ہوتا ہے تو ہمیں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہم فنی نقطۂ نگاہ سے اردو شاعری کے قواعد بھی اپنے ہی بنائیں۔ تاکہ ہماری زبان اور ہماری شاعری کسی دوسری زبان کے قواعد و ضوابط کی محتاج اور پابند نہ رہے۔

پھر ہندوستان میں اُردو شاعری صرف مسلمانوں تک محدود نہیں بلکہ دوسری قومیں بھی اُردو میں شعر کہتی ہیں اور اچھے شعر کہتی ہیں۔ تو کیا ضرورت ہے کہ وہ بھی آپ کی عقیدت و ارادت کا اتباع کرکے عربی اور فارسی قواعد کی پابندی پر مجبور ہوں۔

مجھے معاف فرمایا جائے اگر میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں کہ اس مسئلہ کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان شعرا میں بھی آج اکثر ایسے ہیں جو عربی کے منتہی نہیں اور بیشتر ایسے ہیں جو فارسی بھی نہیں جانتے۔ لیکن انہیں شعر کہنے کا فطری ذوق ہے اُنہوں نے میزان و منشعب کا مطالعہ بھی نہیں کیا نہ وہ عربی صرف و نحو سے واقف ہیں۔ اور یہ کمی محض اس لئے ہے کہ ہندوستان میں عربی و فارسی تعلیم کا رواج باقی نہیں رہا ہے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں عربی و فارسی جس طرح تعلیم کی جاتی ہے وہ ایک طالب علم کے لئے فاضل عربی بننے کے لئے ہرگز کافی نہیں اور تبدیلیٔ نصاب سے قدرتی طور پر ان علوم کے ساتھ ایک بے اعتنائی برتی جارہی ہے۔ پھر آپ اُن سے کہتے ہیں کہ

جگا دیتی ہے دُنیا کو صدائے الاماں میری

کی تقطیع یوں کرو "مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن" آپ اُنہیں بتاتے ہیں کہ اس بحر کا نام "ہزج مثمن سالم" ہے۔ وہ ان الفاظ کو طوطے کی طرح رٹ لیتے ہیں۔ لیکن میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اگر اُن سے مثمن اور سالم کے معنی پوچھے جائیں تو وہ منہ تکنے کے سوا اور کوئی جواب نہ دے سکیں یہ اُن مشکلات کا ایک جزوی نمونہ ہے جو عروض کے عربی میں ہونے سے لاحق ہیں۔ اگر نی صدی ایک شاعر ماہر فن ہو تو اس سے ان ہزاروں اُردو شعرا کی دشواریوں کا حل نہیں ہوتا جو شعر

کہتے ہیں۔ مگر شعر کہنے کے قاعدے صرف اس وجہ سے نہیں جانتے کہ وہ قاعدے اُنکی زبان میں نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ عربی عروض میں بعض غیر ضروری قیود ایسی بھی ہیں۔ جو واضع نے کسی وقتی و لسانی ضرورت سے وضع کی تھیں، مگر قواعد کے ساتھ وہ بھی جزو شاعری بن کر ہم تک چلی آئیں، مثلاً ایک ایطا ہی کو لے لیجئے جسے فصاحت کا سب سے بڑا عیب تسلیم کیا گیا ہے۔

ایطا قافئے میں کلمۂ آخر (متحد المعنی) کی تکرار کو کہتے ہیں۔ یعنی اگر اُس کلمۂ متحد المعنی کو قافیوں سے الگ کر دیں تو جو کچھ باقی رہے وہ الفاظ بامعنی ہوں اور اُن میں حرف ردی قائم نہ ہو سکے۔ جیسے مطلع کے ایک مصرع میں "دردمند" ہو اور دوسرے میں "حاجتمند" "مند" جو دونوں قوافی میں ایک ہی معنی رکھتا ہے اگر نکال ڈالا جائے تو "درد" اور حاجت بامعنی الفاظ رہتے ہیں۔ اور ان میں حرف ردی مشترک نہیں ہے۔ اس لئے یہ "ایطا" ہے۔

عربی شعراء ایطا سے بچتے تھے، فارسی شعرا بچتے رہے۔ اور اُردو شعرائے متقدمین و متاخرین بھی اسی احتیاط کے اسیر نظر آتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ایطا سے مطلع کی کیفیات اور معنویت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ردی کے بعد قافیہ بامعنی باقی رہے یا بے معنی۔ آخر اس قید سے اور شاعری سے کیا تعلق؟ مگر نہیں۔ اگر آپ ایسا کوئی مطلع کسی ماہر فن شاعر کے سامنے پڑھیں گے۔ تو وہ آپ کی فنی قابلیت سے ضرور منکر ہو جائے گا۔ اور منہ پر نہیں تو دل میں ضرور سمجھ لے گا کہ "قدر قادر الکلامی معلوم شد"، شاعری کا تعلق حقیقت میں روحانیت سے ہے۔ اس لئے اُسے زیادہ سے زیادہ وجدانی ہونا چاہئے اور اگر وجدانی نہ ہو تو کم سے کم ایسی غیر ضروری قیود اور پابندیوں سے تو اُسے ضرور آزاد ہو جانا چاہئے جو اُس کے پیکر لطیف پر آہنی زنجیروں سے زیادہ گراں معلوم ہوتی ہیں۔

اگر سوسائٹی کا دباؤ تیور بدل کر آنکھیں نہ دکھاتا اور اُردو شعرا کے مذہب کی اساس روشن خیالی پر ہوتی تو میں آج سب سے پہلے اعلان کرتا کہ ایطا کا ترک اختیار کر لیا جائے۔ اور اس غیر ضروری قید کو شاعری سے اُٹھا دیا جائے۔ مگر مجھے اپنے ایک دوست کا یہ قول ہمیشہ یاد رہے گا

کہ "انسان کا ضمیر اُس کے ماحول میں رہتا ہے"۔ مجھے معلوم ہے کہ میرا ماحول ابھی تاریک ہے۔ اور قدامت اپنی تمام سخت گیریوں کے ساتھ ہنوز کارفرما ہے۔ گو ہمارا تمدن ہمارا لباس اور ہماری معاشرت ضروریات زمانہ کے لحاظ سے بدل چکی ہے اور اُسے غیر ملکی تمدن و معاشرت سے اب کوئی تعلق نہیں رہا ہے لیکن اُردو شاعری ابھی اپنے اُسی محور پر ناچ رہی ہے جو آج سے تین سو برس پہلے اُس کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔

گرامی حضرات! میری گزارش کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں کسی نہ کسی طرح تقلید سے اجتہاد کی طرف بڑھنا چاہئے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری جماعت میں فاضل و عالم اور ارباب کمال زیادہ سے زیادہ موجود ہیں۔ جب ان میں سے بعض کو عربی فن عروض پر کامل عبور حاصل ہے تو وہ اُسی سے اُردو عروض کی تخلیق بھی کر سکتے ہیں۔ اور قواعد شاعری اپنی ہی زبان میں مرتب فرما سکتے ہیں۔ ایسے قواعد جو ہندوستان کے ہر طبقہ میں بآسانی سمجھے جائیں جن کے سمجھنے کے لئے ہمیں کسی دوسری زبان کا منت کش نہ ہونا پڑے جو ہماری لسانی اور ماحولی ضرورتوں کے مطابق ہوں۔ اور جن میں ایطا جیسی غیر ضروری قیود قطعاً نظر انداز کر دی جائیں۔

یہ کام کسی ایک شخص کی کوشش سے انجام نہیں پا سکتا۔ اس کی تکمیل کے لئے ایک مجلس شوریٰ کی ضرورت ہے۔ جس کے ارکان باہم تبادلۂ خیال اور آپس کے مشوروں سے اردو بحریں، اُردو اوزان اور اردو اصطلاحات قائم کریں۔ اور اُردو شاعری کی اساس ایسے آسان قاعدوں پر رکھیں جو اس اسکول کے طلبا کے لئے موزوں و مناسب ہوں۔

مجھے تعجب ہے کہ "عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن"، نے بھی اس خصوص میں اب تک کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ منطق۔ فلسفہ۔ ہیئت، طبیعیات اور اکثر علوم و فنون کی کتابوں کے تراجم ہوئے اصطلاحیں وضع کی گئیں۔ لیکن "فن عروض" کی تمام مصطلحات علی الحالہا عربی میں قائم رہیں۔ اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں یا تو اُردو یونیورسٹی کو اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ یا کسی نے اُسے اس طرف متوجہ نہیں کیا۔

عدم توجہ کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ ہندوستان کی شاعری اور شعرا دونوں انحطاط و زوال اور بے قدری و کس مپرسی کی پستی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اردو شاعری محض ذریعۂ تفریح اور شاعر صرف نقال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر آپ کسی شاعر کا تعارف کسی فلاسفر یا فاضل سیاست سے کرائیں تو وہ ایک واضح اور بامعنی تبسم کے ساتھ گردن ہلا کر شاعر سے مصافحہ کرے گا اور اس تبسم کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ اُس کی نگاہوں میں شاعر کی کوئی خاص وقعت و عظمت نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر ایک فلاسفر سے ایک مورخ یا ہیئت داں متعارف ہوگا تو دونوں کے تیوروں سے ایک خاص سنجیدگی برستی ہوئی نظر آئے گی جس کے معنی یہ ہوں گے کہ جانبین کو ایک دوسرے کے کمال کی عظمت و اہمیت کا اعتراف ہے۔

تو کیا واقعی شاعری اس قدر ذلیل اور غیر وقیع چیز ہے؟ ہرگز نہیں، شاعری ایک بہترین عطیۂ فطرت ہے، ایک لطیف ترین روحانی جذبہ ہے۔ جو خصائص السنۂ مغربیہ اور السنۂ مشرقیہ کی شاعری میں جدا جدا موجود ہیں وہ بیک وقت قدرت نے اردو شاعری کو ودیعت فرمائے ہیں۔ عرب اپنی رزمیہ شاعری کے لئے مشہور ہے۔ مغرب اپنی فطرت نگاری پر نازاں ہے۔ ہندی شاعر جذبات کا خالق ہے۔ یونان فصاحت کا مبلغ ہے جرمنی نفسیات کی تحلیل پر حاوی ہے ایران قومیات کی تبلیغ کا علم بردار ہے۔ مگر میں بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ اردو شاعری میں رزم بھی ہے بزم بھی۔ فطرت نگاری بھی ہے۔ رومان بھی ہے۔ تحلیل نفسی بھی ہے اور جذبات کی ترجمانی بھی۔ قومی تبلیغ بھی ہے اور سیاسی تلقین بھی۔ یہ صرف ہماری سہل پسندیاں اور غفلت کاریاں ہیں کہ اردو شاعری روبہ زوال نظر آرہی ہے۔ ہم قافیہ پیمائی۔ معاملہ بندی۔ نبوٹ۔ مبالغہ۔ تکلف اور آورد کی دلدل میں اس طرح پھنس گئے ہیں کہ ہمیں نکلنے کے لئے راستہ نہیں ملتا۔ اگر ہم فکر و تامل سے کام لیں تو اسی خارزارِ قدامت و تقلید سے ایجاد و اختراع کے پُر بہار چمن پیدا ہو سکتے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اب ہمیں تقلید کی تاریکیوں سے نکل کر تجدید کی روشنی میں آجانا چاہیے۔ ہمیں اپنی ایک جمعیتہ جلد از جلد قائم کر لینی چاہیے جو تقسیم کار کے اصول پر کاربند ہو کر اس فنِ لطیف

سے قدامت و عمومیت کے حجابات اُٹھا دے اور ہمارے لئے ایک ایسا لائحہ عمل تیار کر دے جس پر عمل پیرا ہو کر ہم اُردو شاعری کو عصرِ موجود کی سب سے لطیف اور سب سے اہم صنف بنانے پر قادر ہو جائیں۔ اور جب ہمیں۔ ملٹن۔ ہومر۔ شکسپیر اور گوئٹے کا نام لے کر مرعوب کیا جائے۔ تو ہم بجا طور پر کہہ سکیں کہ آج ہندوستان میں بھی اُن کی مثالیں موجود ہیں۔ جب ہمیں۔ اصمعی۔ قیس۔ یوسف معشقہ اور آغنش کے ادبی کارنامے سُنائے جائیں تو ہم بتا سکیں کہ ہندوستان میں بھی اس ذہنیت کے حامل نایاب نہیں ہیں۔ اور جب ہمارے سامنے نظامی۔ فردوسی۔ عرفی۔ قاآنی۔ ظہیری اور خیام کا نام لیا جائے تو ہم یقین دلا سکیں کہ ہندوستان میں بھی اُن کے معنوی جانشین موجود ہیں۔

مشاعروں میں شریک ہونا۔ کسی مصرعِ مطروحہ پر غزل کہہ لینا اور اُس کے صلہ میں "واہ واہ" کی لفظی داد حاصل کر لینا آج ایک مبتدی اور نوسشق طالب علم شعر کے لئے بھی آسان ہے۔ لیکن آپ حضرات میں سے جو لوگ اپنی عمریں اس فن شریف و لطیف کی نشو و نما میں صرف کر چکے ہیں اب اُن کا کام کچھ اور ہونا چاہئے۔ اُن کا کام یہ ہونا چاہئے کہ وہ شاعری اور شعراء کے لئے اجتہاد کے دروازے اپنے آزمودہ کار قلم کی قوت سے کھول دیں۔ اور اُردو شاعری کو اُس ارتفاع پر پہنچا دیں جس کے لئے وہ حقیقت میں بنائی گئی ہے۔

مشرق میں ایران صدیوں انہیں موضوعات شاعری کا مقلد رہا جس پر ہمارے تغزل کا دارومدار ہے۔ لیکن آخر ایک زمانہ ایسا آیا کہ احمد شاہ کجکلاہ کی غفلتوں اور عیش پسندیوں نے ایران کی سیاسی فضا کو تیرہ و تار کر دیا۔ اور یہی وہ وقت تھا کہ ایرانی شاعر کی ذہنیت نے بھی ایک نئے انقلاب کو دعوت دی۔ ایرانی شاعر جدید احساسات اور جذبات زندگی کے ساتھ اپنا قلم لیکر اُٹھا۔ ایک قائد ملک کی طرح گرجا اور ایک الہامی ہادی و مبلغ کی طرح گونجا۔ اُس نے اپنے زائیدہ ہائے طبع سے وطنی سیاست میں ایک عظیم ہیجان پیدا کر دیا۔ جس سے ایران کا بچہ بچہ متاثر نظر آنے لگا آخر اسی روحانی آواز کی قوت سے ایران کی سیاست نے ایک پلٹا کھایا۔ ہر شخص دورِ کجکلاہی کو ختم کرنے کے لئے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ آمادۂ جہد ہو گیا۔ جس کا نتیجہ وہی ہوا جو آج ہمارے

سامنے ہے۔

کیا آج ہندوستان کا کوئی ایک شاعر بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ جس نے موجودہ وطنی تحریک کی موافقت یا مخالفت میں کوئی ایک نظم بھی ایسی کہی ہو جس نے ہندوستان کی سیاسی فضاؤں میں ہیجان پیدا کر دیا ہو اور جو آج بچہ بچہ کی زبان پر جاری ہو اور اگر کوئی ہے بھی تو "النادر کالمعدوم"

حکومت مشوش ہے۔ ملک میں انقلابی آثار نمودار ہو چکے ہیں مگر ہم ہیں کہ شمع کے سامنے دوزانو بیٹھ کر اپنے فرضی موضوعات نہایت افتخار کے ساتھ دوسروں کو سنا کر خوش ہو رہے ہیں، اور ایک فرضی محبوب یا معمول پر جذباتی الفاظ کی قبا راست کر کے کہہ رہے ہیں کہ ؎

مزہ دے رہی ہیں ادائیں تمہاری
ادھر آؤ لیلوں بلائیں تمہاری

صاحبو! زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ اب فرضی عشق و محبت جتانے کا وقت باقی نہیں رہا۔ اب مجازی جذباتِ وصل و فراق کی نقالی کا موقع نہیں رہا۔ حقیقی موضوعات اس قدر کثیر موجود ہیں کہ ہمیں فرضیات اور ظنیات کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت بھی نہ ملنی چاہیئے۔ ہم شاعر ہیں ہمیں فطرت کے الہام گدے سے ایک فلک رس ذہن عطا ہوا ہے۔ ہمیں اپنے خیالات میں ترفع پیدا کرنا چاہیئے۔ ہمیں کاغذ پر ذہن سے وہ چیز لانی چاہیئے جو ہمارے بعد کاغذ سے ذہنوں میں منتقل ہو سکے اور جو ہمارے لئے، ہمارے ملک کے لئے اور فرزندانِ وطن کے مستقبل کے لئے ایک ابدی پیام بن سکے۔

اگر ہم من حیث الشاعر دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہیں، اور اگر ہمیں اپنی شاعری کو ایک زندہ قوم کی شاعری بنانا منظور ہے تو ہمیں اپنی موجودہ ذہنیت، موجودہ تخیل، اور موجودہ قواعد وضوابط میں انقلاب پیدا کرنا ضروری ہے ورنہ موجودہ شاعری اپنے موضوعات، قواعد اور رسمی فوائد و عوائد کیساتھ نہ صرف خود فنا ہو جائے گی۔ بلکہ ایک دن اپنے ساتھ ہمیں بھی فنا کر دیگی۔

مجھے امید ہے کہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ میرے بزرگوں اور دوستوں کے ذہن میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ اور شمالی ہند کا یہ مشہور شہر جو حسن اتفاق سے جناب کیف گنگوہی،

جناب حیا گنگوہی ۔ جناب شوق بریلوی ۔ جناب اخگر صاحب اکبر آبادی جیسے ارباب کمال، صاحب ذوق اور مشاق اہل سخن کا مستقر ہے ۔ اپنی آیندہ روش عمل سے ہندوستان کو ثبوت دے گا کہ اُس کے تعلیم یافتہ اور خوش ذوق باشندوں میں ادبی اصلاح و تہذیب کی بیش از بیش اہلیت موجود ہے۔

پانچواں خطبہ

مشاعرۂ دبائی

۲۶ - دسمبر ۱۹۳۱ء

سپاس و تحدیثِ نعمت معزز حضرات، وارا کینِ بزمِ ادب،

میں آپ کی قوتِ شوق اور کمالِ ذوق کی گیرائیوں کا معترف ہوں، کہ آپ نے مجھے چند در چند مصروفیتوں اور گوناگوں مشاغل کے حصار در حصار موانعات سے کھینچ کر "دبائی" کی مردم خیز و شعر آفریں فضا میں ایک بار پھر حاضر ہونے کی دعوت دی۔ اور آپ کی اس عزت افزائی کا شاکر ہوں کہ "بزمِ ادب" کے سالانہ مشاعرے کی صدارت کا اعزاز بھی اپنے اصرار کی پوری قوتوں سے مجھے عطا فرمایا۔

خطبہ خوانی کا غلط مصرف جب سے مشاعروں میں خطبہ خوانی کی ترویج پر میں نے اپنی علمی و فکری توجہ منعطف کی ہے، یہ میرا دسواں خطبۂ صدارت ہے جسے میں آج ایک علم دوست، روشن خیال، اور اصلاح پسند مجلس کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ مشاعروں کی صدارت کے لئے "قرعۂ فال" "بنامِ من دیوانہ" اس کثرت سے پڑے گا تو شاید میں خطبہ خوانی کی ترویج پر اتنا زور نہ دیتا، مجھے یقین تھا کہ اس تحریک کی کامیابی کے بعد مصلحانِ فن کو اظہارِ خیال کا موقع ملے گا۔ اور شاعری و خطابت کے اتصال سے فنی و

تحقیقی نکات کی نقاب کشائی ہوتی رہے گی۔ مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جن اکابر جماعت کو اس کا موقع دیا گیا اُن میں سے اکثر نے اس وقت تک شاعری کی تاریخ، نشو ونما، اور شہری و صوبوی اختلافات کے افسانوی جھگڑوں کے سوا کوئی ایسی بات نہ کہی جو فنِ شعر کے لئے کوئی اجتہادی یا کم از کم اصلاحی میدان پیدا کرتی۔

مجھے ادبی مجالس میں ترویج خطبہ خوانی کے بعد متعدد خطبے سُننے، اور کاغذ پر پڑھنے کی مسرت حاصل ہوئی ہے۔ میری سماعت ہمیشہ متجسّس رہی کہ میں ذمہ دارانِ صدارت کے لب و دہاں سے کوئی ایسی تحریک، ایسی تجویز، اور ایسا مشورہ سُنوں جو ملک کی موجودہ فضائے شعر و ادب میں ایک مفید انقلاب کا ذریعہ ہو۔ لیکن اسالیب شاعری کے اُلٹ پھیر، زبان کی سادگی و شوکت کی تردید و تائید، اور شاعری کی لطیف و ادیبانہ تعریف کے علاوہ مجھے کوئی نیا درس نہیں ملا۔

اُردو شاعری اُردو شاعری کی دریافت ہمارے دور سے سوا تین سو سال پہلے ہوئی ہے۔ لیکن یہ نتیجہ کس قدر افسوسناک ہے کہ اب تک ہمارے شاعر نے اپنی زندگی و اہمیت کا کوئی نمایاں ثبوت نہیں دیا۔ اگر اس عرصۂ مدید میں دو چار یا دس پانچ شاعر اپنی قوتِ فکریہ کے سہارے اُبھرے بھی تو اُن کی ترقی و تجلّی ملک کی تمام اجتماعی زندگی پر کوئی خاص اثر نہ کر سکی، اور یہ مفکرینِ ملت شہابِ ثاقب کی طرح اپنے انوار کی جھلک دکھا کر ہماری آنکھوں سے روپوش ہو گئے۔

"اردو شاعری" جس کی تخلیق پر اتنا زمانہ گزر چکا ہے۔ آج بھی اپنے قواعد کے لحاظ سے اہلِ عرب کی مرہونِ قلم، موضوع کے اعتبار سے اہلِ فارس کی مقلد، اور امثال و اسالیب کی حیثیت سے مغربی شعرا کی دست نگر ہے۔

غلط نظریہ جب خصوصیاتِ شاعری پر کہیں بحث ہوتی ہے تو ملٹن، شیکسپیر، اور ہومر وغیرہ مغربی شعرا کے نظریات بیشتر ہمارے پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ اور ہم اپنی شاعری کو مغربی شعرا کے اصولِ تنقید پر پرکھنے اور جانچنے کے خوگر نظر آتے ہیں۔ گویا ہمارے یہاں گزشتہ تین یا پانچ صدیوں میں کوئی ایک باکمال شاعر بھی ایسا نہیں گزرا جس کا نظریہ شاعری کے متعلق ہمارا خضر راہ ہوتا

ہم میر و غالب، ناسخ و آتش، اور داغ و امیر کو دنیائے شاعری کا خدا سمجھنے میں اپنے معتقدات کی نشاط سمجھتے ہیں لیکن اُنکے اقوال و ملفوظات پر ہمارا ایمان اتنا بھی نہیں کہ ہم مغربی شعرا کے نظریوں ہی سے کم از کم بے نیاز ہو جائیں۔

حالی و شبلی، جو ہماری قوم اور ہمارے ملک کے علمائے محققین مانے جاتے ہیں وہ بھی جب خصوصیاتِ شاعری کی بحث چھیڑتے ہیں تو ملٹن اور ہومر کے نظریوں کو اپنا موضوعِ بحث بنانے ہی میں اصابتِ رائے کی تسکین پاتے ہیں، اور آج بھی اگر کوئی ادیب اس مبحث پر قلم فرسا ہوتا ہے تو وہ مغربی نظریات ہی کو اساسِ بحث بنانا لیکن خیال سمجھتا ہے۔

غلامانہ ذہنیت جب تک ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت رہی، مغربی شعرا کو ہماری تنقید و تحقیق میں اتنا دخل نہ تھا۔ اور جامی و نظامی، سعدی و عرفی، قاآنی، و خاقانی، حافظ و خیام، اور بیدل و صائب کے مسلّمات ہماری شاعری کے جزو و کل پر حاوی تھے، مگر جب سے ہماری غلامی کا دور آیا، ہماری ذہنیت پر بھی غلامی مسلّط ہو گئی۔ اور ہم فاتح قوم کے شاعروں کو عرب اور ایران کے شعرا پر ترجیح دے کر اُن کی تعلیم و تلقین، تحقیق و توضیح، اور معلومات و تاثرات کے غلام بن گئے، اور مذہب شاعری میں بھی اُنھیں اپنا امام تسلیم کر لیا۔

شاعری اور مصوّری اس غلامانہ اور تقلیدی ذہنیت کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو شاعر مجموعی طور پر آج تین سو سال کے بعد بھی ارتقاء و اجتہاد کی برکات سے محروم ہے، ہماری موجودہ شاعری کو ہماری معاشرت سے دور کا تعلق بھی نہیں، ہم بدستور اپنے اشعار میں دوسروں کے جذبات یا محسوسات کی ترجمانی اور نقالی کر رہے ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ شاعری مصوری ہے، شاعری اور مصوری میں بہت نازک فرق ہے۔ جس طرح ایک مصور مختلف مناظر و مواقع اور محسوسات کی تصویر کھینچتا ہے اور وہ تمام تصویریں اُس کے ذاتی حالات و واقعات سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں اسی طرح ایک شاعر بھی جذبات و حیّات کی ترجمانی میں اپنی ذاتی کیفیات کا مصوّر بہت کم ہوتا ہے۔ اور جب وہ خارجی جذبات و احساسات کی تصویر اپنی فکر کے الہامی مُوقلم سے کھینچتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ تمام کیفیات

اسی پر طاری و ساری ہیں) لیکن میرے بزرگو، اور میرے دوستو، اگر ان الہامی تصادیر میں حقیقت کا عنصر غالب اور یقینی ہو، اور اگر یہ فکری تصویریں ہماری معاشرت، اور ہمارے حالات و واقعات کی اصلی تصویریں ہوں تو کیا ہماری شاعری حقیقی شاعری نہیں کہی جاسکتی۔ اور کیا اسمیں بلحاظ واقعیت زیادہ اثر و قوت پیدا ہو جانے کا امکان نہیں؟

شاعری کے مدارج بلحاظ اثر

شعرائے عرب نے بلحاظ اثر شاعری کو پانچ اقسام پر منقسم کیا تھا۔ مرقص، مطرب، مقبول، مسموع اور متروک، انمیں سب سے بڑا درجہ شعر مرقص کا تھا۔ جس کے سُننے سے انسان وجد و رقص کرنے لگے۔ اس کے بعد شعر مطرب تھا۔ جو سامع کے دل و دماغ کو طرب ناک بنا دے۔ پھر شعر مقبول، جس کا اثر ماہرینِ فن کی داد و تحسین تک محدود ہو۔ اس کے بعد شعر مسموع، جو صرف سن لیا جائے اور کوئی اچھا بُرا اثر نہ کرے۔ پانچواں متروک، جسے سن کر سماعت میں ناگواری پیدا ہو۔

ہندوستان میں جس قسم کی شاعری مروّج ہے، اور صدیوں سے مروّج ہے، اُسے صرف مقبول یا متروک کا درجہ دیا جاسکتا ہے، یعنی عام طور پر ہماری شاعری کا حاصل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ سوسائٹی اُسے سُنے اور "واہ" یا "آہ" کہہ کر بھول جائے۔

مشاعرے اور دورِ آزادی

رہے مشاعرے، تو ان کا رواج ہمیشہ شاعری کے ساتھ ساتھ رہا ہے، لیکن آج کل ہمارے مشاعرے صرف لفظی و ہنگامی تفریح گاہیں بنے ہوئے ہیں۔ ہماری ادبی مجالس، دوسری ملکی و قومی انجمنوں کی طرح بااثر اور مفید نہیں، آج بھی جبکہ ہمارا ملک ایک نئے انقلاب کی طرف بہا چلا جا رہا ہے اور ہر قوم نے اپنی تمام تفریحات و مطالبات کو طاق نسیاں کے سپرد کر دیا ہے، ہماری شاعری کا وہ ہی اسلوب ہے جو ہماری سلطنت کے زمانے میں تھا۔ کالجوں، یونیورسٹیوں اور بڑی بڑی انجمنوں کی طرف سے سالانہ مشاعرے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منعقد ہوتے ہیں مگر کسی انجمن اور کسی مجلس شعر میں کوئی ایسا مشورہ پیش نہیں کیا جاتا جو اردو شاعری اور اردو شاعر کو بھی تاریخ دورِ آزادی

میں جگہ دے سکے۔ اور مورخ کو مجبور کر سکے کہ جب وہ عہدِ موجود کی تاریخ میں اکابر و اعیانِ ملک کا نام لکھے تو کسی "وطنی شاعر" کے لئے بھی اُس میں تھوڑی سی جگہ محفوظ کر لے۔

اسبابِ قبولیت

ہماری قوم اپنی ذہنی و طبعی خصوصیات سے ساعت کی تفریح و شگفت کا سامان آخر کب تک کرتی رہے گی؟ عربی و عجمی شعرا کا نام کیا آج تک صرف اس لئے زندہ ہے کہ وہ لہراتی ہوئی زلفوں اور لچکنے والی کمر کی تعریف میں رطب اللساں تھے؟ کیا مغربی شعرا کی فضیلت آج صرف اس لئے مسلّم ہے کہ وہ ہجر و وصال اور حسن و جمال کی تصویریں کھینچنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ کیا فردوسی و نظامی اور سعدی و عرفی آج ہماری سوسائٹی میں صرف اس لئے مقبول ہیں کہ اُن کا کلام نفسیاتِ محبوب کی ترجمانی تک محدود تھا؟

تاریخ کے صفحات اُلٹئے، عراق و حجاز کے کسی محاذِ جنگ پر تصوّر کی قوت سے کچھ دیر بیٹھنے کی تکلیف کیجئے، اور دیکھئے کہ تلواروں کی چمک، بندوقوں کی گرج، اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز پر غالب آنے والی چیز صرف عربی "شاعر" کی رجز ہے۔ اُس کے دل و دماغ سے نکلے ہوئے کچھ پرجوش اشعار ہیں، جنھیں نقیب رزمیہ لحن میں پڑھ رہا ہے اور اُس کے ہر شعر پر عساکر کا خون سمندر کی طوفان خیز موجوں کی طرح میدانِ جنگ کی وسعتوں کی آبرو ہے۔

مگر کیا آج ہندوستان کا شاعر دعویٰ کر سکتا ہے کہ اُس کے زائیدہ ہائے فکر نے کبھی کسی محاذِ جنگ پر آگ برسائی ہے؟ کبھی کسی قومی میدان میں جذبات کی تلواریں چمکائی ہیں، اور کسی کاروانِ غافل کے سر پر کھڑے ہو کر کوئی نغمۂ بیداری گایا ہے؟

رسمی و نشاطی شاعری

مولانا حالی عمر بھر شعر کہتے رہے، ایک باخبر اُستاد کے شاگرد تھے، کلام میں پختگی تھی۔ مگر ایک متغزل کی حیثیت سے اُنھیں کبھی قبولیتِ عام میسّر نہ ہوئی، یکایک سرسید علیہ الرحمۃ نے ہندوستان میں ایک نیا صورِ عمل پھونکا، شبلی و آزاد نے اُن کی ہمنوائی کی، اور مولانا حالی نے بھی ایک غیر فانی "قومی مسدس"

"کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا"

لکھ کر اپنے لئے حیاتِ ابدی کا سامان کر لیا۔ آج حالی مرحوم صرف اپنے "مقدمۂ شعر و شاعری" اور ایک "مسدس" کی وجہ سے شعرائے ہند میں متعارف و مقبول ہیں، اس کے علاوہ کیا اُن کے تمام سرمایۂ فکر کی کوئی ایک کڑی بھی ایسی ہے جو لوگوں کی زبان پر یا دماغ میں محفوظ کی جا سکتی ہو۔ اسی طرح اور بھی معدودے چند شاعر ایسے ملیں گے جو روایتی و رسمی شاعری کی حدود سے گزر کر تہذیب و اصلاح کی طرف مائل ہوئے۔ مگر ان کے نام صرف انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

ہمارے معزز شعرائے متغزلین آج بھی اپنی اکثریت کے ساتھ تفریحی و نشاطی شاعری کی ترصیع و تہذیب میں بدستور مصروفِ منہمک ہیں وہ شاعری اور شاعروں کو صرف تحفظِ تمدن و زبان کا ذریعہ سمجھ کر اُن کے احیا کی کوشش میں فکر آزما ہیں، مگر اپنے محور و ماحول سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھے۔ وہ ہی اُن کی شاعری ہے۔ وہ ہی مشاعرے ہیں، اور وہ ہی ردیف و قافیہ کی طرف رینگنا ہے۔ ان میں سیکڑوں اپنی عمریں ختم کر چکے۔ ہزاروں ختم کرنے والے ہیں، لیکن اُن کے مدارج و مناصب جہاں تھے وہیں ہیں۔ اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو شعر کہتے کہتے مر گئے لیکن آج کوئی اُن کے نام سے بھی واقف نہیں۔

مشاعروں کی اصلاح حضرات، یہ نتائج ہمارے لئے درسِ عبرت ہیں، ہمنے اپنی عمریں تقلیدی شاعری کی ترویج و تبلیغ میں ضائع کر دی ہیں، اور اگر ہم آئندہ بھی اسی تاریکی میں پڑے رہے تو ہماری آئندہ نسلوں کی عمریں بھی رائیگاں ہو جائیں گی۔ مشاعروں کا رواج شاعری اور زبان کے تحفظ و احیا کا ایک ذریعہ ضرور ہے۔ اور میں بھی اس کے خلاف کوئی آواز بلند کرنا نہیں چاہتا مگر میری یہ تمنا بھی ہے کہ ہماری شاعری اور ہمارے مشاعروں کا موجودہ اسلوب بدل جائے۔ ہمارا تغزل بلند ہو۔ ہمارے خیالات متین ہوں۔ اور ہمارے احساسات پاکیزہ ہوں۔ تاکہ ہماری شاعری فنونِ لطیفہ میں پھر ایک فنِ لطیف و شریف سمجھی جانے لگے اور ہم اپنے افکار و خیالات کو "تفریحِ محض" سے کوئی زیادہ بلند درجہ دے سکیں۔

عام شاعری اور مشاعرے رسائل و جرائد میں ملک کی موجودہ شاعری پر جو تنقیدیں

ہوتی رہتی ہیں، اُن پر نظر رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ آج تعلیم یافتہ اور ترقی پذیر طبقات میں ہماری شاعری پر تخریب کے الزامات لگائے جا رہے ہیں۔ اُسے مخرب اخلاق کہا جا رہا ہے۔ اور تمام ملک سے آٹھ دس شعرا کو مستثنیٰ کر کے عام شاعری کے متعلق اچھے خیالات قائم نہیں کئے گئے ہیں۔ اِس الزام تخریب کا سبب تعصب نہیں بلکہ عام شعرا کی خود روی اور خود پسندی ہے۔ ہماری ادبی دنیا میں کوئی ایسا محکمۂ احتساب قائم نہیں جو عام شعرا کی صحیح رہنمائی کر سکے۔ نہ ہماری جماعت منظم ہے۔ نہ ہماری کوئی مرکزی انجمن ہے۔ جس کی طرف ہم ضروریات کے وقت رجوع کر سکیں۔ اور جو ہمیں غیر جانب دار طبقے کی تنقیدوں، اور تبصروں کی اطلاع دے سکے۔ خود ہمارے صوبہ میں سیکڑوں ادبی انجمنیں موجود ہیں۔ اُن کے کارکن بھی قابل ہیں۔ لیکن اُن کا نصب العین "انتقاد و شاعرہ" کے سوا اور کچھ نہیں۔

سال بھر میں صرف ایک مشاعرہ منعقد کر کے خدمتِ ادب کے فرائض سے سبکدوش ہو جانا ایک عجیب و غریب واہمہ ہے۔ میں ان تمام انجمنوں کو ایک مرکزیت سے وابستہ کر دینے کا حامی ہوں۔ اور میں اس انتشار کو مٹا دینا چاہتا ہوں جو شعرا میں ایک مدت مدید سے موجود ہے۔ نیز اس نظریہ کو منسوخ کرنا چاہتا ہوں کہ شعرا کبھی ایک مرکز پر جمع نہیں ہو سکتے۔ اپنی اِس تمنا کے ماتحت میرا نظامِ عمل حسب ذیل ہے۔

جدید نظامِ عمل (۱) میں چاہتا ہوں کہ ایک آل انڈیا جمعیۃ الشعرا کی تاسیس و تشکیل کی طرف توجہ کی جائے۔

(۲) میں چاہتا ہوں کہ ہمارے معزز شعرا اظہارِ خیال میں متانت و رفعت اختیار کریں اور اپنی قوتِ فکریہ سے وقت کا ساتھ دیں، ملک کا ساتھ دیں، قوم کا ساتھ دیں، اور حالات و واقعات کا ساتھ دیں۔ یعنی بحیثیت شاعر قوموں کو اُبھارنے، ملک کو بیدار کرنے، اور جمود و خمود کے پردے چاک کرنے میں اپنی الہامی قوتوں کو بروئے کار لائیں۔

(۳) میں چاہتا ہوں کہ مشاعروں کو زیادہ مفید، زیادہ دلچسپ، اور زیادہ کارآمد بنایا جائے، اور ادبی مجالسِ ملک کو اہمیت و افادیت کی طرف بڑھنے کا موقع دیا جائے۔

(۴) میری خواہش ہے کہ ملک میں شاعروں کے ساتھ ساتھ "مناظروں" کا بھی رواج ہو۔ اور ہر "مناظرہ" ضرورتِ وقت کے لحاظ سے ایسے موضوعات پر منعقد ہو جو شاعری کو ہماری نظروں میں نہیں بلکہ دوسروں کی نگاہوں میں بھی معزز و مفید بنا دے۔

آپ خود اندازہ فرمائیے کہ سالانہ شاعروں میں معزز سامعین اپنے اماکن و مساکن، راحت و آرام، اور ضروری کام چھوڑ کر شریک ہوتے ہیں، ساری رات شعرا کا کلام سنتے ہیں۔ اچھے اشعار سے متاثر ہو کر داد دیتے ہیں، اُن کے دماغوں پر واہ اور آہ کی ضربیں صبح تک متواتر پڑتی رہتی ہیں، مگر جب وہ اپنے گھر واپس جاتے ہیں تو اُن کے ذہن و خیال میں اس کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا کہ فلاں شاعر نے اچھا شعر پڑھا۔ اور فلاں شاعر کامیاب یا ناکام رہا۔ روپیہ کے صَرف، وقت کے ایضاع، اور بیدار الطبعی کی تکالیف کے مقابلہ میں کیا شاعروں کا یہ نتیجہ گراں معلوم نہیں ہوتا؟

ماضی و حال

برادرانِ گرامی، اب میر و غالب اور داغ و امیر کا زمانہ نہیں رہا۔ حکومت ہماری شاعری کی قدرداں نہیں، امرائے قوم کو اپنی عیش پسندی سے فرصت نہیں کہ وہ اس طرف متوجہ ہوں۔ سوسائٹی کا مذاق روز بروز پست ہوتا جا رہا ہے۔ جس نے ہماری شاعری کو ایک "جنس کاسد" بنا کر تفریح و تفکیک کی پستیوں میں پھینک دیا ہے۔ میر و غالب کے جو اشعار احساس میں آگ لگا دیتے تھے، ساعت پر اثر و کیف طاری کر دیتے تھے، وہ آج صرف ہونٹوں پر تبسم پیدا کر سکتے ہیں، شاعر اس دَور کا وہ بیکس انسان ہے جس کی جگہ قوم و ملک کے کسی ایوان میں نہیں۔ سیاسی اور اخلاقی فضا میں اُس کی آواز دخل در معقولات سمجھی جاتی ہے۔ وہ صرف تفریحی مشاعروں کا ایک آلۂ ناشر الصّوت بن کر رہ گیا ہے۔ اور اُس کا حاصلِ کار صرف یہ ہے کہ مشاعروں میں غزل پڑھے، طرفدارانہ یا رسمی داد و تحسین لے اور اپنے گھر چلا جائے۔

یہی شاعر اپنے گزشتہ دَور میں قوم کا نقیب تھا، ملک کا معتمد علیہ تھا۔ بادشاہ اس کا استقبال کرتے تھے۔ حکومت اس کی عزت کرتی تھی۔ دُنیا اسے نظر وقار سے دیکھتی تھی۔ اس نے اپنی قدرتِ کلام سے عوام و خواص کے قلوب پر اپنا سکہ بٹھا دیا تھا۔ شاعر کی صدائے موزوں ملک کے تمام افراد کی

اجتماعی صدا، اور وقت کی آواز سمجھی جاتی تھی۔ ہمیں غور کرنا چاہئے کہ ہماری گزشتہ عظمتوں میں یہ انقلاب بار بار کیوں رونما ہوا۔ اور ہم سے وہ تمام عظمتیں کیوں چھین لی گئیں جو ہمیں فطرتاً ودیعت ہوئی تھیں؟

انقلابِ حکومت اس کا سب سے پہلا سبب ہے، اُس کے بعد مبصرین کا یہ الزام ہے کہ ہم نے سلاطین کی غلط مدح سرائی کرکے اور اُن کے سامنے نشاط انگیز و ہوس ناک شعر خوانی کرکے انھیں معاقبات کے احساس اور دور اندیشیوں سے غافل کر دیا۔ ہم اس جرم کے مرتکب ضرور ہیں۔ بے شک ہم نے مبالغہ اور تعلّی سے سلاطین و امرا میں قوت و سطوت کا غلط احساس پیدا کیا۔ بے شک ہمنے اُن کے گھوڑوں کو برق رفتار، فلک خرام، اور جبرئیل احتشام کہہ کر اُنھیں آسمان پر چڑھانے کی مجرمانہ کوشش کی۔ بے شک ہم نے اُن کی تلواروں کو کوہ شکن، برق تراش، صاعقہ پیکر اور دستِ قضا کہہ کر اُن کے جنگی انتظامات کو رنگ آلود کر دیا اور اُنکے تخت کو تختِ سلیماں بنا کر اُن میں غرور و نخوت کی ہوا بھر دی، غرض کہ اسی طرح مختلف غلط احساسات پیدا کرکے ہم نے انھیں انتظامِ حکومت، تدبیر مدافعت، اور تہذیب سیاست سے واقعی محروم کر دیا۔

افسوس یہ ہے کہ اگر یہ انقلاب ہماری ہی ذہنی و فکری سازشوں کا نتیجہ تھا، تو آج بھی ہمارا ذہن، ہماری فکر، اور ہمارا خیال انھیں فروعات و معروضات کی جولانگاہ بنا ہوا ہے۔ اور ان کے زہریلے اثر سے اب ہم اپنی تعمیر کے انہدام کا اپنے ہاتھوں سے خود انتظام کر رہے ہیں۔

میں نہایت صاف الفاظ میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب تک ہم اپنی شاعری کو مفید، متین، اور مہذب و بااثر نہ بنائیں گے، جب تک اپنے تغزل میں رفعت، اپنی نظم میں شوکت، اپنے خیالات میں بلندی، اور اپنے ادراکات میں ترفع پیدا نہ کریں گے ہمیں دنیا میں زندہ رہنے، اور اپنی ادبی روایات کو زندہ رکھنے میں کبھی کامیابی نصیب نہ ہوگی۔

شاعر کی عظمت

ابھی آپ کو اپنی عظمت و اہمیت کا صحیح اندازہ و احساس نہیں۔ آپ کی قوم پیغمبروں کی قوم ہے۔ آپ کے دماغ پر خورشیدِ الہام براہِ راست ضیا باری کرتا ہے۔ آپ خدائے سخن آفریں کے شاگرد رشید کہلاتے ہیں۔

ادب آپ کے نفوسِ جاریہ کی صدا ہے۔ زبان آپ کے کلمات و ملفوظات سے عبارت ہے۔ آپکا ایک شعر ہزاروں صاحب دل صوفیوں کو "مُوتو قبل ان تموتو" کا درس دے کر حیاتِ جاودانی سے بہرہ اندوز کر سکتا ہے۔ آپ قوم غالب ہیں، ملتِ داغ ہیں، پھر آپ کو یہ کیا ہو گیا ہے کہ آپ اپنے موجودہ انحطاط اور کس مپرسی کو دور نہیں کر دیتے، ذرا قدامت و تقلید کے حجابوں سے نکل کر باہر تو آیئے آپ کو انسانوں میں فرشتوں کا منصب عطا ہو گا۔ آپ کے بیغامات کائنات کے لئے درسِ عمل ہوں گے۔ اقوام و ملل میں عزت ہو گی، جیوش وعساکر کے آپ مقدمۃ الجیش بنائے جائیں گے۔ اور وہ تمام اقتدارات آپ کو تفویض ہوں گے جو ایک حقیقی شاعر کے لئے ازل سے مقدر ہو چکے ہیں۔

تلخ نوائی کی معذرت

معزز حضرات، میرا آج کا خطبہ فنی و تحقیقی نہیں بلکہ اصلاحی ہے۔ میں شاعرِ حال کی اصلاح کے لئے اپنے دل میں ایک تڑپ اور ایک مسلسل بے چینی محسوس کرتا رہا ہوں۔ میرا اقدام غلط اور ناقابلِ عمل نہیں۔ میری نوائے تلخ ہے مگر اس کے اثرات بہت شیریں نظر آتے ہیں۔ اگر آج آپ نے ایک اصلاحی قدم آگے بڑھایا تو کل آپ کو شعرا کی ایک لاتعداد جماعت میدانِ حیات میں سرگرمِ عمل نظر آئے گی۔ اگر آپ نے آج میری کمزور آواز پر "لبیک" کہا تو کل آپ کی آوازیں الہامی منادین کر ملک کی تمام وسعتوں میں گونجیں گی۔ اور آپ اپنے وطن کے حقیقی شاعر، معزز پیامی، مقدس پیغامبر، اور مبارک معلم سمجھے جائیں گے۔

میرے وطن عزیز یعنی ہندوستان میں اہلِ علم کی کمی نہیں، سخنوروں کا قحط نہیں، ماہرینِ فن کا فقدان نہیں، یہ سب آپ کے رجحان میں ایک انقلاب کے منتظر ہیں۔ اگر آپ نے اپنی شاعری اور اپنے مشاعروں میں انقلاب پیدا کرنے کی ہمت کی تو ان کی مجتہدانہ قوتیں، اور علم و کلام کی قدریں، اس انقلاب کو خوشگوار، مضبوط اور کامیاب بنانے کے لئے ہمیشہ مستعد ثابت ہوں گی۔

چھٹا خطبہ

شاعری اور مشاعرے کی اصلاح

مشاعرۂ انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۷۔ فروری ۱۹۳۲ء

میرے معزز بزرگو، اور دوستو!

مجھے بیحد مسرت ہے کہ آج انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سالانہ مشاعرے کے بعد مجھے "شاعری اور مشاعرے کی اصلاح" پر اظہار خیال کا موقع دیا گیا۔ میں اس موضوع کی مبادیات اور تفصیلات میں پڑ کر آپ کا زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا۔ مختصراً عرض کرتا ہوں کہ شاعری اور مشاعرے ایک رسم جاریہ کی طرح صدیوں سے ہندوستان میں مروج ہیں۔ لیکن فی زمانہ اُن کی اصلاح و تہذیب کی طرف حامیانِ زبان و ادب کی توجہ بہت کم ہوتی جارہی ہے۔ نگارخانۂ ادب جو مختلف النوع تقاضوں سے وقتاً فوقتاً آراستہ ہوتا رہا ہے۔ اب اپنی گراں سامانی اور ہمہ گیری کے باعث اس قابل ہو گیا ہے کہ ہم اس کا تجزیہ کر کے ہر چیز کو سلیقے اور طریقے سے محل اور موقع دیکھ کر ترتیب دیں تاکہ وہ انتشار جو امتداد ایام سے ارژنگِ سخن میں پیدا ہو چکا ہے منظم اور مرتب ہو جائے۔

انجمن "خیابانِ اُردو" کے دعوت نامے کی تمہید ہی موضوعِ زیر بحث کی اساس ہے جس کے

الفاظ یہ ہیں:-

"اُردو زبان جس کو ادبی حیثیت، اور علمی فضیلت محض اہلِ قلم کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔ آجکل"
"بعض غفلت آمیز بے اعتنائیوں کے سبب سے بے وقعت اور جہل مرکب بنتی جارہی ہے"
"ضرورت ہے کہ اُن روایاتِ کہن کو ہمیشہ تازہ رکھا جائے۔ جن کا مٹ جانا چمنستانِ ادب"
"کا پامالِ خزاں ہوجانا ہے"

اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اُردو زبان کو ادبی حیثیت اور علمی فضیلت اہلِ قلم نے دی ہے۔ مگر آج اہلِ قلم ہی اپنی زبان اور اُس کے متعلقات سے اس قدر غافل اور بے پروا ہیں کہ اگر زبان جہلِ مرکب بنتی جارہی ہے۔ تو شاعری بھی یکسر مضحکہ بن گئی ہے۔ علی العموم آج شاعری کا نصب العین صرف تفریح رہ گیا ہے۔ وہ ہی شاعری جو کبھی ملک و قوم کے روحانی سکون کا باعث اور اطمینانِ قلب کا سبب سمجھی جاتی تھی، آج بحیثیتِ مجموعی، بے نتیجہ، بے کار اور بے اثر ثابت ہورہی ہے۔ ہرچند یہ دورِ شاعری کا وہ ارتقائی دور ہے جس کی قوم و ملک کو اس عہدِ زوال میں ضرورت تھی۔ اور ہیں میں چند ایسے آتش نوا موجود ہیں۔ جن کے دل سوز نغموں سے خرمنِ حیات کی دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اُٹھتی ہیں لیکن اس امر کے متعلق صحیح فیصلہ اکثریت اور اقلیت کو پیشِ نظر رکھ کر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اور اُن طریقوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے جن کے ذریعہ سوسائٹی میں اس کی تشہیر ہوتی ہو۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مشاعرے تشہیر لسانی اور ترویج شاعری کے بہترین ذرائع ہیں اس لئے اس خصوصی صورتِ حال کو نظر انداز کرنے کے بعد مجھ کو اکثریت کے نقطۂ نگاہ سے اُس "شاعری" پر رائے دینی ہے جو مشاعروں کے ذریعے عوام تک پہونچتی ہے۔

اصولی طور پر شاعری کا صحیح معیار معلوم کرنے کا ذریعہ ہمارے مشاعرے ہی ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ مشاعروں کے علاوہ کوئی اور عمومی صورت ایسی نہیں جہاں شعرا ایک مرکز پر جمع ہوکر اظہارِ خیال کرسکیں۔

لکھنؤ، دہلی، آگرہ، علی گڑھ اور الہ آباد کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں

میں بھی شاعرے پورے اہتمام و انتظام کے ساتھ منعقد ہوتے ہیں۔ ان تمام شاعروں میں جس قسم کی شاعری ہوتی ہے۔ اُسے مندرجۂ ذیل عنوانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) المیہ شاعری۔ جس میں جذباتِ فراق، غریب الوطنی، آہ و فریاد، حسرت و آرزو، درد و اضطراب، مرض اور موت کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔

(۲) نشاطیہ شاعری۔ جس میں کیف وصال، اذکارِ جمال، شراب و مستی، کامیابی، اور بہار وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے۔

(۳) اعتباری یا تخیلاتی شاعری۔ جس میں صیاد و نشیمن، آشیان و بلبل، باغباں، دام، قفس، اسیری، وحشت وغیرہ، پر شاعرانہ اعتبار سے اظہارِ خیال ہوتا ہے۔

(۴) جذباتی شاعری۔ جس میں مختلف انسانی جذبات کی اثر آفریں طریقوں سے ترجمانی ہوتی ہے۔

(۵) نیچرل شاعری۔ جس میں فطرت کے مشاہدے سے مناظرِ قدرت کی مصوّری کی جاتی ہے (حالانکہ نیچرل یا فطرتی شاعری کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اُسے مناظر نگاری تک محدود رکھا جائے۔ بلکہ نیچرل شاعری کا مفہوم "حقیقی شاعری" سے ادا ہوتا ہے۔ اگر مناظر نگاری کے ساتھ شاعر نے اپنے دل کا تازہ خون صرف نہیں کیا ہے۔ تو اُس کی نظم ایک سفید و سیاہ کاغذ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔)

(۶) قومی شاعری۔ جس میں شاعر اپنی قوم کے ماضی، حال اور مستقبل سے بحث کرتا ہے۔

(۷) مولویانہ شاعری۔ جو صرف خشک پند و نصائح پر مشتمل ہوتی ہے۔

(۸) سوقیانہ شاعری۔ جس میں مبتذل اور رکیک خیالات کا انبار ہوتا ہے۔

(۹) فکاہی شاعری۔ جو ہزل گو حضرات کا مطمحِ نظر ہے۔ اور جس میں صرف عامیانہ مذاق اور بازاری لہجۂ کلام اختیار کیا جاتا ہے (حالانکہ اس قسم کے ماتحت تند و تیز ظنزیات کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا جا سکتا ہے اور مزاح سے تعمیری کام لیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ لسان العصر اکبر مرحوم نے لیا۔

لیکن آج کل اس سے بھی غلط کام لیا جا رہا ہے اور پھکڑ نویسی کو مزاح نویسی سے غلط تعبیر کیا جا رہا ہے)

یہ موجودہ اُردو شاعری کی متداول و متعارف قسمیں ہیں جن سے ہندوستان کے شاعر آئے دن گونجتے رہتے ہیں۔ اور جو شاعر کو "فِی کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْن" کا مصداق بناتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مروجہ اقسام سے ہماری شاعری بے نیاز نہیں ہو سکتی اس لئے کہ شاعری جذبات و احساسات کی ترجمانی ہی کا نام ہے۔ اور جب انسان مختلف جذبات و احساسات کا حامل ہے تو اُس کی شاعری کو بھی تنوع و اختلافِ خیال کا مرکز ہونا چاہیئے۔ لیکن بایں ہمہ یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ موجودہ شاعری کا علمی نتیجہ بجز وقتی تفریح اور ہنگامی نشاط کے اور کچھ نہیں۔

مروجہ اقسام شاعری میں بعض قسمیں بہت اعلیٰ اور ارفع ہیں۔ مگر (وجوہ جو کچھ بھی ہوں) آج کل مذاق اسقدر پست ہو گیا ہے کہ اکثریت کسی ایسے شعر کو سُن کر خوش نہیں ہوتی جو باعتبارِ تخیل بلند اور باعتبارِ ترکیب مرتفع ہو۔ مجھے معاف فرمایا جائے میرے خیال میں مختلف وجوہ کے علاوہ اس کی پہلی اور آخری وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ مشاعروں میں استفادہ کے خیال سے افراد شریک نہیں ہوتے۔ بلکہ تھیٹر اور سینما کی طرح مشاعروں کی شرکت سے تفریح محض ان کا مقصود اصلی ہوتا ہے۔ اور یہی وہ صورتِ حال ہے جسمیں شاعر اور مشاعرہ دونوں کی توہین مضمر ہے۔

فطرتاً ایسے مواقع پر انسانی ذہنیت غور و فکر کی تکلیف اُٹھانا نہیں چاہتی۔ اس لئے پست جذباتی شاعری میں لوگوں کو زیادہ لطف آتا ہے۔ اور سنجیدہ اشعار سے سماعت تکلیف نہیں ہوتی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو شاعری ایک انقلاب عظیم کی طرف رواں دواں ہے۔ اور اس میں بہت کچھ انقلاب ہو بھی چکا ہے تاہم لکیر پیٹنے کا مرض باقی ہے۔ اور ہنوز شاعری کا عام رنگ مذاق عوام سے متوازن ہے۔ یہی سبب ہے کہ بعض اوقات اُردو شاعری کو مخرب اخلاق، اور تہذیب سوز کہنے میں ایک نقاد کو تامل نہیں ہوتا۔

یہ ایک مسلّمہ فیصلہ ہے کہ شاعری زبان و محاورہ کے انضباط و تحفظ کا بہترین ذریعہ ہے مگر میرے خیال میں یہ کام شعرائے متقدمین و متاخرین ایک بڑی حد تک پورا کر چکے ہیں۔ میر سے لیکر مرزا داغ

دہلوی تک کوئی شاعر ایسا نہیں گذرا جس نے زبان کے محاورے اپنے اشعار میں نظم نہ کئے ہوں۔ دورِ آخر میں فصیح الملک مرزا داغ دہلوی، مولانا راسخ دہلوی، مفتی امیر مینائی لکھنوی، اور حکیم ضامن علی جلال لکھنوی نے تو اس قدر اردو محاورے اپنے کلام میں نظم کر دیے ہیں کہ وہ مثال و نظیر کے لئے بہت کافی ہیں۔ ہم انھیں کی تقلید میں ان محاورات کا استعمال کرتے ہیں۔ اِن بزرگانِ فن کے بعد شاید اس وقت تک کوئی ایسا مجتہد شاعر نہیں آیا جس نے فہرستِ محاورات میں اضافہ کیا ہو۔

محاورات، مصطلحات، اور اسالیب بیان کی تکرار و تواتر کے لئے "شاعری" کی بقا ضروری ہے۔ لیکن اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ اکثریت کی بدمذاقی اور طلبائے فن کی کثرت و خودروی سے شاعری میں جو غلط مبحث اور افراط و تفریط پیدا ہو گئی ہے اُس کا انسداد کیا جائے۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ "شعر را بمدرسہ کہ برد" کی حیرانیاں باقی نہیں رہی ہیں۔ آج ہر اسکول، ہر کالج اور ہر یونیورسٹی میں سالانہ مشاعرے ہوتے ہیں جن میں طلبا دلچسپی یا غیر دلچسپی کے ساتھ حصہ لیتے ہیں۔ مگر اُن کے سامنے جو شاعری ہوتی ہے وہ اُن کی اعلیٰ سیرۃ، پاکیزہ اخلاق، بلند نظرت، اور ترقی یافتہ مذاق کے لئے کوئی تعمیری پروگرام پیش نہیں کرتی۔ اگر شعر کا اثر سامع کے قلب و دماغ پر واقعی ہوتا ہے۔ اور شعر کریکٹر کے بگاڑنے بنانے میں ممد ہو سکتا ہے تو مجھے کہنے دیجئے، کہ فیصدی ۹۵ نفسے جو موجودہ شعرا کے ہونٹوں سے نکل کر طلبا کی سماعتِ معصوم میں جذب ہوتے ہیں، وہ کبھی اور کسی طرح طلبا میں اعلیٰ سیرۃ اور بلند مذاق پیدا نہیں کر سکتے۔

اردو شاعری کا بیشتر حصہ ایسے پست خیالات و جذبات کا حامل ہوتا ہے کہ ایک شاعر بیٹا ایک بزرگ باپ اور اپنی محترم ماں کے سامنے اپنے اشعار آزادی سے نہیں سنا سکتا۔ اور رازِ سربستہ کی طرح اپنی بیاضِ شعر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں چھپائے چھپائے پھرتا ہے۔

میں اسے بغیر کوشش تردید تسلیم کرتا ہوں کہ موجودہ شاعری کی اساس، فارسی شاعری کی تقلید میں، اُسی قدیم شاعری کے نقوش پر قائم ہے۔ جو شعرائے سلف کا مایۂ نازش تھی۔ لیکن

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اخلاف نے تقلید میں "خذ ما صفا ودع ما کدر" کو اصولِ عمل نہیں بنایا۔ اور آنکھیں بند کرکے جس کی تقلید چاہی شروع کر دی۔

میر و سودا اور غالب و مومن کے کلام کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے یہاں مذاق کی پستی شاذ پائی جاتی ہے جو الندر کالمعدوم کی حیثیت رکھتی ہے۔

لیکن ان کے کلام کا بیشتر حصہ، روح کو چھونے والے جذبات اور فطرت و حقیقت کو بے حجاب کرنے والے مرتفع خیالات و احساسات سے لبریز نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس مصحفی و انشا اور آتش و ناسخ کے کلام میں دوسری قسم کے خیالات کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں۔ چونکہ پست مذاق عموماً کانوں اور دل کو آسانی سے متوجہ کر لیتا ہے۔ اس لئے بعض متاخرین نے اُن شعرا کی تقلید کرکے اپنے لئے شعر گوئی کو آسان تو کر لیا۔ مگر اس طرح اُردو شاعری کی اساس غلط پڑتی چلی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹ ویں صدی طلبائے فن اسی ابتذال و پستی کو سرمایۂ ادب سمجھنے لگے۔

ضرورت ہے کہ اساتذۂ متقدمین کے تمام دیوان مناسب انتخاب کے بعد از سرِ نو شائع کئے جائیں اور وہ تمام اشعار نکال دیئے جائیں جو سامع کے رجحانات کو عریانیٔ احساس کی طرف رجوع کرکے غلط تقلید و اتباع کی طرف مائل کر دیتے ہیں۔ تقلید اگر کوئی ضروری چیز ہے تو اسے اسلوب بیان اور خصائص زبان تک محدود رہنا چاہئے، لیکن پست جذبات اور معمولی خیالات کی تقلید حقیقت میں ایک ایسی کورانہ تقلید ہے۔ جو مقلد کی علمی و ادبی ذہنیت کی طرف سے ناقد کو مایوس کر دیتی ہے۔ اور اس غلط تقلید کا سلسلہ درجہ بدرجہ استاد سے شاگرد اور معلم سے متعلم پر منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔

میں نہیں کہتا کہ اپنے زمانے کے مذاق اور ماحول سے متاثر و مجبور ہو کر متاخرین میں مرزا داغ، جلال، اور امیر نے بھی ایسی کوتاہیاں نہیں کی ہیں۔ اُن سے بھی یہ کوتاہیاں ضرور ہوئی ہیں۔ لیکن اُنکی اشاعت کا بار الزام بھی ان کا کلام شائع کرنے والوں پر ہے۔ اور یہ حضرات اس لئے قابل درگزر ہیں کہ ان کی کوتاہیوں کے مقابلے میں ان کا تعمیری کام بہت زیادہ ہے۔ جو انھوں نے تحقیق و تدوینِ محاورات اور اصلاحِ زبان کے متعلق کیا ہے۔

۱۳۴۷۲

بہرحال تخریبی مواد اُردو شاعری میں کچھ تو پہلے سے موجود تھا اور کچھ ہمارے سعادت مند شعرا نے اپنی کوشش و محنت سے اب بڑھا لیا ہے۔

یہ حال تو موجودہ اُردو شاعری کا تھا۔ اب مشاعروں کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا ہے "مشاعرے" ایک عرصۂ دراز تک مشرقی روایاتِ قدیم کے مطابق ہندوستان میں منعقد ہوتے رہے ہیں۔ مگر اب اُن میں بھی بہت سی بدعات کا اضافہ ہو گیا ہے۔ مثلاً

(۱) مبتدی و منتہی شعرا کی شرکت۔

(۲) غیر شاعر حضرات کی صدارت۔

(۳) عدم پابندیٔ اوقات۔

(۴) طوالتِ وقت۔

(۵) بسیار خوانی۔

(۶) دادِ بیجا اور بالکنایہ حملے۔ وغیرہ وغیرہ

مندرجۂ بالا نقائص پر اگر میں مفصل تنقید کروں تو مجھے اندیشہ ہے کہ میری تقریر بہت طویل ہو جائیگی اس لئے بالاجمال عرض کئے دیتا ہوں مشاعروں کا نصب العین تفریح اور تضیعِ اوقات کے سوا اور کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اوّل شب سے آخر شب تک مسلسل غزلخوانی اور دماغ کاوی کا کوئی نتیجہ مرتب ہوتا ہو تو مجھے بتایا جائے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہی تحفظِ زبان ان مشاعروں کا مقصد ہے تو میں عرض کروں گا کہ زبان آج کل کے مشاعروں میں بنتی نہیں بلکہ بگڑتی ہے۔ مبتدی شعرا غلط محاورے، غلط بندشیں، غلط ترکیبیں، اکثر و بیشتر نظم کر جاتے ہیں۔ سُننے والے سُنتے ہیں۔ مگر کسی کو اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ ان اغلاط کی اصلاح کی طرف توجہ کرے اور ہمت سے کام لے کر زبان یا محاورے کی غلطی پر روشنی ڈالے عوام کو تو ان باتوں سے کوئی تعلق ہی نہیں، رہے منتہی شعرا، تو وہ اس خیال سے خاموش ہو جاتے ہیں کہ اگر کسی کے شعر میں کوئی نقص نکال دیا جائے تو جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔ اور عیب جو، عیب ہیں، حاسد، کینہ توز، خود پسند، نکتہ چیں، اور خدا جانے کیا کیا گالیاں سرِ محفل سُننی پڑینگی۔

جب سوسائٹی کا یہ حال ہے تو فرمایئے اصلاح کیونکر ہو؟

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دعوتِ اصلاح نعرۂ مصور نہیں ہے۔ صحیح شاعرہ داعی کے لئے دار و رسن کا حکم لے کر نمودار نہ ہوگی۔ اس لئے بلا خوف لومتہ لائم آپ کے سامنے اظہارِ حقیقت کر رہا ہوں۔ میرا جذبۂ اصلاح یہاں تک حوصلہ مند یا گستاخ ہے کہ اگر اس سلسلے میں دار و رسن کا فتویٰ بھی کسی کی طرف سے مل جائے تو میں بخوشی لبیک کہنے کو تیار ہوں۔ لیکن اپنی سالہا سال کی ادبی خدمات کا حاصل یہ ضرور دیکھنا چاہتا ہوں کہ موجودہ شاعری اور شاعروں میں ایک ایسا خوشگوار انقلاب پیدا ہو جائے جو اردو شاعری اور ادبی شاعروں کو ملک اور قوم کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور کار آمد بنا دے۔

بندی و منتی شعرا کی مشارکت پر میں اپنے پہلے خطبوں میں اظہارِ خیال کر چکا ہوں شاعروں میں خطبہ خوانی کی ترویج میرے زیرِ ادارت شائع ہونے والے رسالہ "شاعر" کے ذریعے باحسن الوجوہ ہو چکی ہے۔ اب صوبہ متحدہ میں خصوصاً اور دوسرے صوبوں میں تدریجاً خطبۂ صدارت پڑھنے کا رواج ہوتا جا رہا ہے میری یہ بھی تجویز ہے کہ شاعرے صحیح مشرقی انداز پر منعقد ہوں۔ میں مصرع طرح کے اعلان کا بھی مؤید نہیں ہوں۔ پنجاب نے اس خصوص میں ایک نیا علمی قدم اٹھایا ہے۔ وہاں شاعرے کے لئے کوئی مصرع طرح تقسیم نہیں کیا جاتا۔ مصرع طرح دے کر شاعر کے ذہن و خیال کو مقید کر دینا کوئی مفید طریقہ ثابت نہیں ہوا۔ گو اس طریقہ سے قوتِ فکر کا مقابلہ ضرور ہو جاتا ہے مگر جب تک مصرع میں خاص شگفتگی اور گیرائی نہ ہو یہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ داد دینے اور لینے کا طریقہ بھی قابلِ ترمیم ہے، وقت کی پابندی، اختصارِ کلام، اور طولِ شاعرہ کے متعلق بھی فکر و غور کی ضرورت ہے۔ غرضکہ ایسی ہی بہت سی باتیں ہیں جن کی تہذیب و اصلاح ضروری معلوم ہوتی ہے اور جن پر جریدۂ "شاعر" میں برابر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔ گر شاعری یا شاعروں کی اصلاح، کسی ایک متنفس کا کام نہیں یہ کام پوری جماعت کا کام ہے۔ جبتک کوئی جماعت اپنی اصلاح و تہذیب کے لئے متفقہ کوشش نہیں کرتی اُس وقت تک انفرادی کوششیں کامیاب ثابت نہیں ہوتیں۔ بدقسمتی سے ہمارے شعرا کا یہ حال ہے کہ وہ جتنے نازک خیال ہیں، اُتنے ہی دیر احساس بھی ہیں آج ایک معمولی شاعر سے لے کر متنبی تک موجودہ شاعری اور موجودہ شاعروں

کے رواج سے بددل اور بیزار نظر آتا ہے مگر جذبۂ اصلاح کسی کے دل میں پیدا نہیں ہوتا۔ یا پیدا ہوتا ہے تو کوئی اُس کا اظہار نہیں کرسکتا۔ بس ایک رسم ہے کہ جاری ہے۔ ایک رواج ہے کہ نباہا جارہا ہے۔ اجتہاد کے دروازے چاہے ساری دنیا پر کھلے ہوئے ہوں لیکن ہمارے شعرا پر بند ہیں۔ اگر کوئی نئی اصلاحی آواز کہیں سے اُٹھتی ہے تو اُسے یہ کہہ کر دبانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اساتذۂ متقدمین میں سے کسی نے ایسا نہیں کیا۔ یہ قدامت پسند طبقہ اجتہادی قوتوں سے خود بھی عاری ہے اور دوسروں کو بھی اس میدان میں ترقی کرنے سے روکتا ہے۔

شاعری کے متعلق ابھی عرض کرچکا ہوں۔ مشاعروں کے متعلق میرا خیال آپ پر ظاہر ہوچکا ہے اب سوال یہ باقی رہتا ہے کہ جب انفرادی کوششیں ضرورت اصلاح کی تکمیل نہیں کرسکتیں تو پھر وہ کون سی تدبیر ہے جو ہماری شاعری اور ہمارے مشاعروں میں انقلاب پیدا کرسکتی ہے؟

آپ حضرات میں سے اکثر کو اس کا علم ہوگا کہ میں ایک عرصے سے "جمعیۃ الشعرائے ہند" کے قیام کی بھی تحریک کررہا ہوں۔ اس آل انڈیا ادبی کانفرنس کی تاسیس و تشکیل کے لئے میرا ارادہ یہ تھا کہ ہر صوبے سے دو مشہور شاعروں کو کسی مجلس میں دعوت شرکت دی جائے اور اُنکی موجودگی میں جمعیۃ کی تاسیس کرلی جائے۔ لیکن اب میرا خیال کسی قدر بدل گیا ہے "جمعیۃ الشعرائے ہند" کی تاسیس و تخلیق کے لئے صرف اُن صوبوں کے نمایندوں کی ضرورت ہے جو اہل زبان ہیں۔ یا جنکی علمی و ادبی جدوجہد نے اُنھیں اہل زبان سے قریب تر کردیا ہے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ جمعیۃ کی اساس صوبۂ متحدہ میں رکھی جائے اور پھر اس کے دامن تمام صوبوں کے لئے وسیع کردیئے جائیں۔

بلحاظ موضوع یہاں جمعیۃ الشعراء کے ذکر سے میرا مقصد یہ ہے کہ جمعیۃ کا قیام ہی شاعری اور مشاعروں کی اصلاح کا ایک یقینی ذریعہ ہوسکتا ہے۔ ہم اپنی جمعیۃ کی قوت سے وہ تمام کام لے سکتے ہیں جو افراد کی کوشش سے اس وقت تک انجام پذیر نہیں ہوئے۔ ہم اپنی جماعت کو منظم کرسکتے ہیں۔ اپنی شاعری اور مشاعروں کے لئے اصلاحی و تعمیری پروگرام مرتب کرسکتے ہیں۔ ہم موجودہ روش شاعری کو مرتفع کرکے ایک ایسی بلندی پر پہونچا سکتے ہیں جہاں تخریب و رکاکت،

اور انحطاط و پستی کی گرد پہنچ ہی نہیں سکتی۔ ہم اپنی جماعت کو ایک مرکز پر دعوت اتحاد دے کر، اردو شاعری کو افراط و تفریط کی کشمکش سے نکال کر، اپنے شاعروں اور مناظموں کے لئے صحیح لائحہ عمل بنا کر، اپنا معیار نظم و نثر بلند کر کے، اپنے جذبات کے اظہار میں توازن قائم کر کے، اور اپنی ادبی قوتوں کو بروئے کار لا کر اپنی مجالس کو دوسری ملکی و قومی مجالس کی طرح ممتاز و مفتخر بنا سکتے ہیں۔

میں چاہتا تو اس سے پہلے ہی اپنے احباب و تلامذہ کی اعانت سے ایک جمعیۃ کی بنیاد ڈال دیتا مگر مجھے اس مسئلہ کی اہمیت کا بطور کافی اندازہ ہے۔ میں اس جمعیۃ کو حقیقی معنوں میں "جمعیۃ الشعرائے ہند" بنانے کا آرزومند ہوں۔ اس لئے میری ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ کسی بڑے سالانہ مشاعرے میں جہاں شعرا اور اُدبا کا کافی اجتماع ہو۔ میں یہ تحریک پیش کروں۔

امسال "انجمن خیابان اُردو" کے دعوت نامے میں "شاعری اور شاعرے کی اصلاح" کا عنوان پڑھ کر میرا جذبۂ عمل انگڑائی لینے لگا۔ اور یہاں آنے کے بعد میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے خیالات پریشاں کو آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ اور ایک خادم ادب ہونے کی حیثیت سے عرض کروں کہ انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ" کے آخری سالانہ مشاعرے میں میری اس تحریک کی اساسی تمہید ڈال دی جائے تاکہ جمعیۃ الشعرائے ہند" کی تاسیس کا سہرا اسی مرکز علوم و فنون کے سر رہے جو ہمیشہ ایسی تحاریک و تجاویز کا مرکز رہا ہے۔ در اصل جمعیۃ الشعرا کی تاسیس و ترتیب کوئی ایسا امر دشوار نہیں لیکن جمعیۃ کے قیام کے بعد اُسکی قوتوں کو بروئے کار لانا واقعی مشکل کام ہے۔ اراکین جمعیۃ کا انتخاب، مجلس عاملہ کی تعیین، نظام عمل کی تدوین، ملک کی تمام ادبی مجالس کا مرکزی "جمعیۃ الشعرا" سے الحاق، شعبوں اور اداروں کی تقسیم، شاخہائے جمعیۃ کا قیام، غرض کہ ایسی ہی بہت سی باتیں ہیں جن کی تکمیل کے لئے وقت اور مردان کار کی ضرورت ہے اگر آج علی گڑھ کی سرزمین فضل و علم میں "جمعیۃ" کے ابتدائی مراحل طے ہو گئے تو میں اسے "شاعری اور شاعروں کی اصلاح" کا ایک اہم ترین عملی اقدام سمجھوں گا۔ کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کچھ لوگ اُسے خیال سے عمل میں لانے کے لئے اپنی ہمدردانہ اور پُرخلوص کوششوں کے ساتھ آمادہ نہ ہو جائیں اسی طرح "شاعری اور شاعروں کی اصلاح" دس ہزار تقریروں اور

تحریروں سے بھی نہیں ہو سکتی جب تک قول و فعل کے امتزاج سے ایک نیا مزاج پیدا کر کے اس ہیولے میں نئی جان نہ ڈالی جائے۔ بس یہی مجھے عرض کرنا تھا اور اسی معروضہ کی تکمیل کے لئے میں آپ کی زبان کی جنبشوں، منصب کی ذمہ داریوں، اور علمی و عملی قوتوں سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ حضرات اپنی امکانی اعانت سے اس تحریک میں آج ایک ایسی روح پیدا کر دیں جو اس تحریک کی زندگی اور اردو شاعری کی معنوی بقا کی ضامن ہو۔

ساتواں خطبہ

مشاعرۂ بزمِ ادب جہلم (پنجاب)

۱۶۔ اپریل ۱۹۳۳ء

گرامی حضرات!

آج میں بیحد مسرور ہوں کہ صوبۂ پنجاب کے مشہور شہر جہلم کے ایک ادبی و علمی اجتماع میں مجھے بحیثیت صدر اپنے ہزریانات پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔ اور میں اُن تمام حضرات کا بے حد ممنون و شاکر ہوں جو اپنا قیمتی وقت صرف فرما کر میری یاوہ گوئی کی سماعت کے لئے یہاں تشریف لائے ہیں۔ صوبۂ پنجاب سے میرا معنوی تعلق ہے اور اس حیثیت سے میں جہلم کو جہاں میرے تین عزیز شاگرد موجود ہیں اپنا گھر سمجھتا ہوں، اس لئے میں جو کچھ عرض کروں گا اُسے "حکایتِ بیگانہ" نہیں بلکہ "حدیثِ خانہ" سمجھنا چاہیے۔

مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں "علم و ادب" پر کچھ اظہار خیال کروں،

علم و ادب علم، اصل ہے اور ادب فرع ہے، علم سرچشمہ ہے اور ادب اُس کی ایک لطیف موج، علم ایک چمنستان غیر محدود ہے اور ادب اُس کی بہارِ معطر۔ علم کے معنی "دانستن" یعنی جاننا ہیں۔ موجودات کی گوناگوں نوعیات کے لئے گوناگوں علوم بھی ہیں۔ مثلاً علم الاشیاء، علم الانسان، علم اللسان وغیرہ وغیرہ۔ یہاں نفسِ موضوع علم اللسان سے متعلق ہے اور ادب اُسی کی ایک شاخ ہے۔ علم اللسان، ہر ملک کی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اسے درسگاہوں، یعنی مکاتب اسکولوں،

کالجوں، اور یونیورسٹیوں میں حاصل کیا جاتا ہے۔ مگر ادب ذہن و دماغ کا وہ جوہر گرانمایہ ہے جو اکتسابِ علوم و فنون کے بعد صرف ادراک و معارف کی قوت سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔

ہمیں درسگاہوں میں ادب لالسنہ کے نمونے تو مل سکتے ہیں مگر وہ دماغ، جو ادب کا خلاق ہو، صرف فطرت کی ودیعت ہی کا رہینِ منت ہے۔ اور کسی نوعیت سے بھی اکتسابی نہیں کہا جا سکتا۔

زبان کی دو قسمیں ہیں۔ تحریری و تقریری۔ تقریری زبان علمی زبان سے وابستہ ہے۔ علم جتنا وسیع ہوگا تقریر میں اُتنی ہی قوت ہوگی۔ تحریری زبان کی پھر دو قسمیں ہیں۔ رسمی اور ادبی۔ رسمی تحریر، تجارت، مکاتبت اور روزانہ زندگی کی ضرورتوں میں کام آتی ہے۔ اور ادبی تحریر صرف شاعری یا انشائے لطیف کے لئے مخصوص ہے۔

ادب ہر زبان میں موجود ہے۔ انگریزی، لاطینی، یونانی، فارسی، عربی، سنسکرت، ہندی، غرض کوئی زبان ایسی نہیں جس کا ایک حصّہ فائقہ، عام اور معمولی زبان سے علیحٰدہ کر کے "ادب" کے نام سے موسوم نہ کر دیا گیا ہو۔ چنانچہ جب ہم "اُردو ادب" کہتے ہیں تو ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم اُردو کے اُس اختراعِ فائقہ یا لسانی ارتقا کا ذکر کر رہے ہیں جو اُردو کے ایک خاص اسلوب سے متعلق ہے۔

کسی زبان کا ادب، زبان کے ساتھ عزتِ تخلیق نہیں پاتا۔ بلکہ زبان جس قدر منجھتی اور سُلجھتی جاتی ہے، اور اُس میں جس قدر قوت و وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اُس میں اُتنا ہی ادبی سامان پیدا ہوتا جاتا ہے۔ الفاظ کی فراوانی، محاورات کا انضباط، اسالیب کا تعیّن، فصاحت و بلاغت کی تحدید، ہر زبان کے ادب کے لئے ضروری اجزا ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اسباب کسی زبان کے ساتھ پیدا نہیں ہوتے بلکہ پیدا کئے جاتے ہیں۔

ادبِ اردو

مثلاً ادب اُردو کو لے لیجئے۔ ۷۰۵ھ سے ہندوستان میں اُردو کی تخلیق ہوتی ہے۔ اور حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ اُردو کے سب سے پہلے شاعر مانے جاتے ہیں۔ اہلِ دکن و جدی کو اُردو کا سب سے پہلا شاعر تسلیم کرتے ہیں جس کا

زمانہ ۱۰۱۵ھ ہے۔ لیکن چونکہ حضرت امیر خسروؒ کا زمانہ ساتویں صدی ہجری ہے۔ اور اُن کا کلام فارسی آمیز اُردو میں یا ہندی آمیز اُردو میں ملتا ہے۔ اس لئے ہم وجدی کو سب سے پہلا اردو شاعر ماننے کے لئے تیار نہیں، لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو ۱۰۱۵ھ سے ۱۳۵۱ھ تک ساڑھے تین سو برس ہوتے ہیں، جنھیں سات دوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ان ادوار کی تفصیل اس جدول میں ملاحظہ فرمائیے۔

مشہور شعرائے اُردو کے چھ دَور

بہ لحاظ ترقیٔ زبان

تخلص	سالِ ولادت	سالِ وفات	کیفیت
امیر کاروانِ سخن حضرت امیر خسرو دہلوی رحمۃ اللہ علیہ	۶۵۱ھ	۷۲۵ھ	

پہلا دَور

(عہد سلاطین لودی سے آخر عہدِ اورنگ زیب عالمگیر تک)

نوری دکنی	۹۱۶ھ	۱۰۹۸ھ	وجہی اور جنیدی وغیرہ شعرا بھی اسی دَور کے شاعر تھے
غواصی دکنی	۱۰۱۴ھ	۱۰۳۷ھ	
ابن نشاطی دکنی	.	۱۰۷۶ھ	
نصرتی دکنی	.	۱۰۹۵ھ	

تخلص	سالِ ولادت	سالِ وفات	کیفیت

دوسرا دَور

(آخر عہدِ اورنگ زیب سے عہد عالمگیر ثانی تک)

ولی دکنی	۱۰۶۹ھ	۱۱۵۵ھ	
مضمون اکبرآبادی	.	۱۱۵۸ھ	
شاہ مبارک آبرو	.	۱۱۶۱ھ	ناجی اور یکرنگ بھی اسی عہد کے شاعر تھے
داؤد دکنی	.	۱۱۶۸ھ	
خان آرزو اکبرآبادی	۱۱۰۲ھ	۱۱۶۹ھ	
سراج دکنی	.	۱۱۷۷ھ	
فغاں	.	۱۱۸۶ھ	
مرزا مظہر	۱۱۱۰ھ	۱۱۹۴ھ	تیسرے دور میں انتقال ہوا
حاتم	۱۱۱۱ھ	۱۱۹۶ھ	

تیسرا دَور

عہدِ شاہ عالم

مرزا سودا دہلوی	۱۱۲۵ھ	۱۱۹۵ھ	
خواجہ میر درد دہلوی	۱۱۳۳ھ	۱۱۹۹ھ	
قائم	.	۱۲۱۰ھ	

تخلص	سالِ ولادت	سالِ وفات	کیفیت
تاباں دہلوی	.	۱۲۱۱ھ	تک زندہ تھے۔
میر سوز دہلوی	۱۱۳۳ھ	۱۲۱۳ھ	
میر تقی میر اکبرآبادی	۱۱۳۷ھ	۱۲۲۵ھ	چوتھے دَور میں انتقال ہوا
میر حسن دہلوی	۱۱۴۰ھ	۱۲۰۱ھ	

چوتھا دَور

(عہدِ شاہ عالم)

جرأت لکھنوی	.	۱۲۲۵ھ	منت اور ممنون بھی اسی عہد کے شعرا ہیں
انشا لکھنوی	.	۱۲۳۳ھ	
مصحفی امروہوی	۱۱۶۴ھ	۱۲۴۰ھ	
نظیر اکبرآبادی	.	۱۲۴۶ھ	پانچویں دَور میں انتقال ہوا
رنگین	۱۱۶۹ھ	۱۲۵۱ھ	

پانچواں دَور

(عہد اکبر شاہ ثانی سے عہد بہادر شاہ ظفر و زمانۂ ایسٹ انڈیا کمپنی تک)

شاہ نصیر	.	۱۲۵۴ھ	
ناسخ لکھنوی	۱۲۰۴ھ	۱۲۵۴ھ	

تخلص	سالِ ولادت	سالِ وفات	کیفیت
آتش لکھنوی	.	۱۲۶۳ھ	
ذوق دہلوی	۱۲۰۴ھ	۱۲۷۱ھ	شیفتہ، اسیر، امانت - خواجہ وزیر - صبا
غالب اکبرآبادی	۱۲۱۲ھ	۱۲۸۵ھ	قلق، رند اور منیر شکوہ آبادی بھی اسی
نسیم دہلوی	۱۲۱۴ھ	۱۲۷۹ھ	دور کے شاعر تھے
مومن دہلوی	۱۲۱۵ھ	۱۲۶۸ھ	
میر انیس لکھنوی	۱۲۱۷ھ	۱۲۹۱ھ	
مرزا دبیر لکھنوی	۱۲۱۸ھ	۱۲۹۲ھ	

چھٹا دور

(عہد کوئن وکٹوریہ سے عہد جارج پنجم تک)

تسلیم لکھنوی	۱۲۳۹ھ	۱۳۲۹ھ	
امیر مینائی لکھنوی	۱۲۴۴ھ	۱۳۱۸ھ	ظہیر، انور، رسا، مجروح، سرور جہان آبادی،
داغ دہلوی	۱۲۴۶ھ	۱۳۲۲ھ	شاد عظیم آبادی - ریاض خیرآبادی، محسن کاکوروی
جلال لکھنوی	۱۲۵۰ھ	۱۳۲۵ھ	اور مضطر خیرآبادی مرحوم کا بھی اسی دور سے تعلق
حالی پانی پتی	۱۲۵۳ھ	۱۳۳۳ھ	تھا
اکبر الہ آبادی	۱۲۵۶ھ	۱۳۴۰ھ	

ساتواں دور، موجودہ دور ہے۔ جس کے متعلق ہنوز کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی تاآنکہ فضائے ادب و شعر حشو و زوائد سے پاک ہو کر صرف ایک حقیقت رہ جائے۔ اور اس پر مستقبل قریب میں کوئی فیصلہ کن محاکمہ کیا جا سکے۔

اب خیال فرمائیے کہ اُردو زبان کی اساس گو ساتویں صدی ہجری میں پڑ چکی تھی۔ تاہم اُسکی ادبی حیثیات کا ارتفاع بارہویں صدی ہجری سے پہلے نہ ہو سکا۔ یہ خصوصیت بھی صرف اُردو ہی کو نصیب ہے ورنہ دوسری زبانوں کے ادبی زبان بننے میں اس سے بھی زیادہ وقت صرف ہوا ہے۔

اُردو کو شاعر تو عالم طفلی ہی میں مل گئے، مگر محقق بہت عرصے میں ملے چنانچہ لغت اُردو کی تدوین سب سے پہلے سترھویں صدی عہد عالمگیر میں (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) ہوئی۔ جس کا سہرا مُلّا عبدالواسع ہانسوی کے سر رہا اور اُس پر نظر ثانی سراج الدین علی خاں آرزو نے کی۔

میں آپ حضرات کے سامنے ادب اُردو کی تاریخ بیان نہیں کروں گا اس مختصر تمہید سے میرا مقصد صرف یہ دکھانا تھا کہ زبان و ادب کی تعمیر و تدوین میں کتنا عرصہ درکار ہوتا ہے اور اُس کے لئے کس قدر سامانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

تمام السنۂ عالم کے ادبیات کی ابتدا شاعری سے ہوئی ہے۔ شعر ایک وہبی قوت ہے جس کا وجود نثر سے بہت پہلے ملتا ہے۔ انسانی جذبات کا مظہر اتم دماغ ہے۔ پہلے انسان سوچتا ہے۔ پھر بولتا ہے یا لکھتا ہے۔ جب تک فنِ تحریر منضبط نہ تھا۔ خیالات کے اظہار و تحفظ کے لئے صرف شعر ہی سے کام لیا جاتا تھا۔ اس لئے شعر کو بھی ادب میں جگہ ملی۔ گو ادبی نثر کا رواج بھی اس کے بعد ہو گیا جس کو ادبِ لطیف سے موسوم کیا گیا لیکن عروسِ شعر کی چہرہ کشائی آئینہ خانۂ ادب ہی میں ہوئی اور اسی آئینہ خانے میں ادب کے بوقلموں نوادر کا صحیح عرفان و ادراک ہو سکا۔

فارسی کا اثر اُردو پر

علم جس قدر بڑھتا گیا، معلومات میں جس قدر اضافہ ہوتا گیا، ادب پر بھی جلا ہوتی گئی۔ اُردو شاعری میں ادب کی تخلیق عربی اور فارسی الفاظ کی سب سے زیادہ منت پذیر ہے۔ عہدِ عالمگیر میں جب اُردو شاعری نے ترقی پائی تو سب سے

پہلے فارسی شعرا نے ادھر توجہ کی۔ موسوی خاں فطرت۔ مرزا عبدالقادر بیدلؔ، مرزا عبدالغنی قبولؔ وغیرہ فارسی کے مستند اور مشہور شعرا نے اردو میں شعر کہنے شروع کر دئے اور اس طرح فارسی ادب رفتہ رفتہ اردو کے قالب میں منتقل ہو گیا۔

اردو شعرا کو تجزیۂ ادب کا خیال تو چوتھے ہی دور میں ہو چکا تھا لیکن زبان پر صیقل فی الحقیقت چھٹے دور میں ہوئی۔ مرزا داغ دہلوی نے باہمادرہ سلیس اردو جس میں فارسی کے الفاظ بہت کم اور آسان تھے اختیار کی۔ اور فارسی الفاظ کا وہ شکوہ جو میر کے زمانے سے اردو شاعری پر مسلسل مسلط تھا۔ کمزور ہوتا گیا۔

اگرچہ اردو شاعری کی خصوصیات ایہام وغیرہ میرؔ، سوداؔ، مظہرؔ اور قائم نے ترک کر دی تھیں لیکن تخیل کی پیچیدگی، ادق عربی اور فارسی الفاظ کا انتراک، میر کے زمانے سے ناسخ و آتش کے زمانے تک موجود تھا۔ مثلاً ناسخ کے یہ اشعار

غیر کو تر کسی دریا کا میں سباح نہیں　　بیشۂ شیر خدا ابن کہیں سیاح نہیں
ظلم طولِ شب فرقت کے تطاول نے کیا　　داد رس کوئی بجز فالق الاصباح نہیں

پانچویں دور میں مرزا غالب نے مرآۃ النظیر کی تقلید ترک کر کے جو لکھنوی دبستانِ شاعری کی خصوصیت تھی اور مومن نے علی قدر مناسب، اس رنگ کو نبھایا۔ جلال و امیر نے دونوں رنگ حسبِ ضرورت اختیار کئے۔ اور اس طرح ادبِ اردو کا تجزیہ اس صورت سے ہو گیا کہ اس میں وہ ژولیدگی و پیچیدگی باقی نہ رہی جو پانچویں دور تک موجود تھی۔

ادب کا مواد اور مقصد و منشا

ادبیات کا مواد من حیث المجموع وہ تمام الفاظ و محسوسات ہیں جو انسان کے دماغ میں جلوہ افگن اور زبان پر جاری ہوتے ہیں۔ اس کا وسیع میدان کسی خاص زمانے سے وابستہ نہیں اور نہ کسی انسانی جماعت کے خاص طبقے یا حصے سے مخصوص ہے۔ جب اور جہاں لبِ انسان سے کوئی صدا ایسی نکلی جو اُس کی وجدانی کیفیات، مناسب اور خوبصورت الفاظ میں دوسروں پر ظاہر کر سکی۔ اس نے اس خیال سے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا کہ اس کا بھی غور و فکر سے مطالعہ کیا جائے گا۔ میرے سب سے چھوٹے لڑکے مظہر سلمہٗ پر ایک دن اُسکی

والدہ مسلسل اظہارِ عتاب کر رہی تھیں، اور وہ خاموشی سے کھانا کھانے کیلئے ہاتھ دھو رہا تھا۔ اثنائے عتاب میں کوئی زیادہ سخت جملہ اُسکی والدہ کی زبان سے نکلا تو اس نے بجائے کدورت متاثر ہونے کے سر جھکائے بلند آواز سے کہا "سبحان اللہ کیا شعر کہا ہے"؟ ہم سب اُس کا یہ فقرہ سن کر ہنس پڑے اور میں نے دیکھا کہ اُس کی والدہ بھی جن کی نگاہوں سے ابھی غصّے کی چنگاریاں اڑ رہی تھیں، مسکرانے لگیں۔

ادبیات کا منشا و مقصد یہ ہے کہ وہ تمام مظاہر لسانی میں ایک ندرت، ایک مناسبت، اور ایک ترتیب پیدا کردے۔ ادبیات کی حدود ایک طرف تو لسانیات سے ملتی ہیں دوسری طرف انسانی جذبات و احساسات سے ایک ادب ناآشنا صرف زبان کو ذریعۂ اظہارِ خیالات تصور کرکے بحث کرتا ہے، مگر ایک ادیب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ زبان کی حیاتِ باطنی اور جذبات کی غیر آشکارا گہرائی کا بھی پتہ لگائے۔

موضوع کے ماخذ کو الفاظ کے طلسم سے ڈھونڈ نکالے۔ اس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ وہ زبان کی ماہیت بحیثیت وصفِ انسانی سمجھ سکے اور معلوم کرسکے کہ خیال سے اس کا کیا تعلق ہے۔ اور ترقی و ترویجِ دماغ و علم پر اس کا کیا اثر ہے۔

قدیم و جدید ادب ابھی تک دنیا کی تاریخ میں ادبیات کے تحفظ کا اثر عام طور پر ایک ہی طبقے میں محفوظ رہا ہے۔ ازمنۂ قدیم سے علما اور پجاریوں کا گروہ قومی ادبیات کا والی و وارث اور قومی زبان کی حفاظت کا ٹھیکہ دار بن بیٹھا۔ مگر عوام اس سے بیگانہ اور ناآشنا ہوتے چلے گئے۔ تائید عوام سے محروم ہوتے ہی تعلیم و تعلّم کی زبان اپنی قوتِ حیات زائل کرنے لگتی ہے کیونکہ جب ادب کا استعمال عام طور پر نہیں ہوتا اور وہ ایک خاص فرقے کی ملک بن جاتا ہے تو اس کی طبعی اور ضروری نمو کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔ اس کا اثر زبان پر بھی پڑتا ہے۔ اور اس طرح ایک ہی قوم میں دو زبانیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک تو وہ جو ماضی سے ورثے میں ملتی ہے۔ یہ روز بروز دشوار ہوتی جاتی ہے اور اس میں تصنع کا سا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور دوسری کو حال پیدا کرتا ہے اس میں ابتداءً غلطیاں اور خرابیاں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ لیکن اس کی حیات تندرستی اور قوت سے معمور ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ یہ اس قابل ہو جاتی ہے کہ عالمانہ اور مقدس ادب کو جس سے یہ نکلی ہے جڑ سے اُکھاڑ دے

اور اس کی جگہ خود لے لے۔

اصلی حفاظتِ زبان و ادب یہ ہے کہ ایک تعلیم یافتہ اور ارتقائے تہذیب انسانی سے آشنا جمہوریت قائم کی جائے۔ اور کامل و ہمہ گیر تعلیم کے ذریعے تمام جماعت کو اس امر میں ہمنوا بنا لیا جائے کہ ادبِ صحیح کے مسلّمات کا مناسب اور مفید تحفظ کیا جائے گا۔ اس کے بعد اگر کوئی تغیر ناگزیر ہو تو اس سے بھی تعرض نہ کیا جائے۔

ٹکسالی زبان کے حامیوں کا ایک گروہ ہے جو چاہتا تو یہ ہے کہ زبان کی سالمیت پر حرف نہ آئے مگر فی الحقیقت اس کی ترقی کی راہیں بند کرنے کا خواہشمند ہے۔ نئے الفاظ، نئے معنی، اور نئے اسالیب بیان سے حد سے زیادہ ڈرنا ایک زندہ زبان کے لئے اس سے کچھ کم ہی مہلک ہے جتنا کہ ان خطرات کی قطعی روک تھام نہ کرنا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ مناسب شرطیں عہدِ قدیم کی ترقی یافتہ اور ادبی زبانوں کے مقابلے میں عصرِ حاضرہ کی ترقی یافتہ اور ادبی زبانیں قریب قریب بالکل پوری کر رہی ہیں۔ اول الذکر کا جو حشر ہوگا وہ آخر الذکر کا نہ ہوگا۔ ہندوستان کی تعلیم یافتہ اور ادبی سوسائٹیوں میں خالصیتِ زبان کی حفاظت کرنے والی قوتیں جس درجۂ ارتقا پر پہونچ چکی ہیں۔ زمانۂ قدیم میں بہت ہی موافق کیفیات و حالات کی صورت میں بھی اس درجہ پر نہ پہونچی تھیں۔ زبان کا سوچ سمجھ کر غور و فکر کیساتھ استعمال کرنے والوں کا، اور خیالات کو مناسبت و مطابقت کے ساتھ ضبطِ تحریر میں لانے والوں کا ہر جگہ اور ہر شہر میں ایک گروہ بن چکا ہے۔ جس کے افراد کی تعداد کثیر اور جس کا اثر غالب ہے۔ تعلیم اب اعلیٰ طبقے ہی میں محدود نہیں۔ بلکہ عوام میں بھی پھیل گئی ہے۔ مشاعروں کی ترویج، ادبی انجمنوں کے انعقاد، اور ادبی رسائل کے شیوع نے تحریر و تقریر نیز نظم کے اصول قائم کر دئے ہیں۔ عام گفتگو کی وہ ہیئت جس کے بہترین دماغ اور شیریں کلام و خوش نوا اصحاب حامی و مددگار ہیں اردو پر غالب آ رہی ہے اور مجھے ادبِ اردو کا مستقبل حال سے بھی کچھ زیادہ روشن اور اُمید افزا نظر آ رہا ہے۔

نموئے ادب کے وسائل ادب میں نشو و نما کی قوت فی نفسہٖ موجود ہے۔ کسی خارجی کوشش

کی چنداں ضرورت نہیں۔ جب تک انسان کی گردن پر سر اور سر میں دماغ موجود ہے۔ الفاظ و خیال کی ہیئت ترکیبی سے ادب کی تخلیق ہوتی رہے گی۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اپنی نثر و نظم میں ادبی حدود کے نگراں رہیں۔ مالی کا کام صرف یہ ہے کہ وہ صحیح زمین اور صحیح تخم کاری کا خیال رکھے اور اس کی پروا نہ کرے کہ پودا کیسا نکلے گا اور پھول کس قسم کے کھلیں گے۔ پھولوں کے رنگ و بو کی نفاست، آب و ہوا کی مطابقت اور فطرت کی تخلیقی ترکیب پر چھوڑ دینی چاہئے۔

علم اور انسانی دماغ کی کارفرمائیوں کے امتزاج سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے ہم اُس پر کسی طرح قابو یاب نہیں ہو سکتے۔ الفاظ اُس کیفیت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ زبان اس نوائے بے نوا کی ترجمانی نہیں کر سکتی۔ روح اُس کے کیف سے سرشار ہو سکتی ہے لیکن نطق صرف اس کا دھندلا سا نقش صفحۂ قرطاس پر مرتسم کر سکتا ہے۔ اُس کی صحیح تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ ایک ایسی روحانی اور لاہوتی کیفیت کے ارتسام کے لئے ہمارے مادّی وسائل کیا کام آسکتے ہیں؟۔

علم کی قوت سے ہماری روح جس قدر عرفان و حقیقت اور آگاہی و ادراک حاصل کر یگی اتنا ہی ہمارے ادب میں علو اور ارتفاع پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ادب کی نشو و نما کیلئے صرف علم و دماغ ہی وسیلہ ہو سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور قاعدہ نموئے ادب کے لئے نہیں بنایا جا سکتا۔

شعر میں ادب کی جگہ شعر میں ادب کی جگہ بہت نازک اور بہت لطیف ہے۔ شعر اور ادب کی مثال تصویر اور رنگ سے ایک حد تک سمجھی جا سکتی ہے۔ تصویر میں رنگوں کا امتزاج اگر غلط اور غیر مناسب ہے تو تصویر کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو نظر فریب نہیں ہو سکتی۔ ادب کے لئے نظر فریبی بھی کوئی چیز نہیں۔ ادب وہ ہے جو دلنشیں اور روح فریب ہو۔ اس اعتبار سے ادب کی اہمیت ایک مصور کے شاہکار سے بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ شعر اگر ادب سے خالی ہے تو ایک بے رنگ تصویر سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور اگر خیالات کیساتھ بندش بھی سست اور ترکیب بھی کمزور ہے تو پھر شعر ایک ایسی بگڑی ہوئی اور فرسودہ تصویر ہے جس کی کم عیاری مصور کو

مصور کہلانے کا مستحق بھی نہیں رکھتی۔ جو شعر ادب سے خالی ہے ہم اُسے شعر کہنے میں علمی و ادبی اور لسانی گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر ؎

آؤ آؤ تمہیں خدا کی قسم مان جاؤ تمہیں خدا کی قسم

یہ اعتبارِ فن عروض شعر کہا جا سکتا ہے لیکن شرطیتِ ادب کے مطابق ایسا شعر کہنے والا سنگسار کرنے کے قابل ہے۔ جہلا کا مذہب یہ ہے کہ وہ ہر ایسے شعر کو جو سلیس اور صاف اردو میں ہو، خواہ اُسمیں جذبات کی بلندی، مفہوم کی ندرت، تخیل کی رفعت، اور دلنشینی کی قوت نہ ہو، بہت اچھا سمجھتے ہیں میں نہیں کہتا کہ زبان کی سلاست و فصاحت فنِ شعر میں امرِ معیوب ہے۔ لیکن کیا سلیس زبان میں رفعتِ تخیل کارفرما نہیں ہو سکتی۔ سنئے یہ شعر۔

کوئی اُس وقت برہمن کی صباحت دیکھے نکلے جب رات کا جاگا ہوا بتخانے سے

پہلا شعر سن کر آپ کے ہونٹوں پر ایک مضحکہ آفریں تبسم کیوں پیدا ہو گیا تھا، اور یہ شعر سن کر آپ کی روح کیوں جھومنے لگی؟ معلوم ہوا کہ شعر وہ ہی ہے جو سماعت سے گذرتے ہی روح کو چھو لے۔ اور جسے بار بار سننے کے بعد بھی سماعت کی تشنگی باقی رہے۔

کوئی اس وقت برہمن کی صباحت دیکھے نکلے جب رات کا جاگا ہوا بُت خانے سے

اس شعر میں ادب کی جگہ کہاں ہے؟ "برہمن کی صباحت" اور "رات کا جاگا ہوا" "بت خانے سے نکلے" یہ تین مقامات ادب کی بلند نشستیں ہیں۔ اگر کسی شعر میں ایک لفظ بھی ادبی چاشنی کے ساتھ موجود ہو تو ادب کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ پھر جائے کہ تین محاذوں سے ادب نشتر افگن ہو۔

میں پوچھتا ہوں کیا یہ شعر زبان میں نہیں ہے؟ اور کیا اس کا کوئی ایک لفظ، ایک جملہ، اور ایک ترکیب بھی ایسی ہے جسے حدودِ زباں دانی سے خارج کیا جا سکتا ہے؟ اور لیجئے۔

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے اک ذرا آپ کو زحمت ہو گی

اس شعر میں ادب مفقود ذہنی ہے۔ کہنے والا یہ نہیں کہتا کہ ذرا سرک جائیے۔ ذرا ہٹ جائیے۔ ذرا پاؤں ہٹا لیجئے۔ بلکہ ادبی لہجے میں یوں کہتا ہے "اک ذرا آپ کو زحمت ہو گی" ——— سننے والے کے

ذہن میں شاعر کا مفہوم فوراً جاگزیں ہو جاتا ہے۔ پھر کیا یہ شعر زبان کا سیدھا سادہ شعر نہیں ہے اور کیا اس میں بھی کوئی لفظ ایسا ہے جسے تکسال کا سکہ نہیں کہا جا سکتا؟ اور سنئے۔

تنگ آ گئے ہیں اُس بُتِ نا آشنا سے ہم فریاد برہمن سے کریں یا خدا سے ہم

ادب جہاں ہے، وہیں سے پکار رہا ہے کہ میری یہ جگہ ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح فریاد کرنے والے کے ذہن میں بھی خدا تو پہلے ہی سے موجود تھا مگر "برہمن" کا نام لے کر "بُتِ نا آشنا" سے جو نفسیاتی مناسبت پیدا کر دی بس اسی کا نام ادب ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ تشبیہ اور استعارے سے "ادب" کی قوت شعر میں کم ہو جاتی ہے میں کہتا ہوں یہ خیال بھی غلط ہے۔ جہاں تشبیہ محض اور استعارۂ محض استعمال کیا جائے وہاں یہ دشواری پیش آ سکتی ہے لیکن اگر تشبیہ اور استعارے کے ساتھ جذبات کو شریک کر دیا جائے تو "ادب" اپنی جگہ پر ضرور قائم رہتا ہے۔ یہ شعر سنئے۔

بکھرا کے زلف کو نہ جھٹکنے پر آئے اس تیرگی میں نشتر نہ اُٹھ گی جائے

یہاں تیرگی کا استعارہ زلف کے رنگ سے کیا گیا ہے۔ لیکن جذبات کے ساتھ ہے اس لئے شعر کو ایک ادبی شاہکار کا درجہ یقیناً دیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان کی سلاست اور شوکتِ الفاظ یہ سب فروعی سامانِ شعر ہیں۔ اصل چیز خیال اور اُس کے بعد الفاظ کا بر محل استعمال ہے۔ خیال جس قدر بلند اور اچھوتا اور الفاظ جس قدر چست اور بر محل ہوں گے اُسی قدر شعر کا ادبی پہلو زیادہ نمایاں ہوگا ——— میر و غالب اور مومن کے یہاں بیشتر اشعار ایسے ہیں جن میں زبان کا چٹخارہ نہیں۔ اور الفاظ کی شوکت نمایاں ہے مگر آج دنیائے شاعری ان پر ایمان لائے ہوئے ہے۔ میر کا شعر ہے ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

اور غالب کا یہ شعر ؎

بساطِ عجز میں اک دل ملا ایک قطرہ خوں وہ بھی سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

اور مومن کا یہ شعر ؎

نقدِ جاں تھا نہ سزائے دیتِ عاشق چیف خونِ فرہاد سرِ گردنِ فرہاد رہا

سن کر یوں کہہ دینا کہ ان میں صرف الفاظ ہی الفاظ ہیں اپنی کم علمی اور بے مائگی کا اعلان کرنا ہے۔ اگر ادب فہمی کا مذاق ہے تو پہلے علم حاصل کیجئے ادب کا عرفان خود بخود ہو جائے گا۔

ملک کی اجتماعی زندگی پر ادب کا اثر

مادی ہاتھوں میں فنونِ لطیفہ کی جیسی مٹی خراب ہوئی ہے ناقابلِ بیان ہے۔ خصوصاً شعر و موسیقی کے لئے ہندوستان کا موجودہ دورِ حیات بہت زیادہ صبر آزما ثابت ہو رہا ہے۔ شعر و موسیقی سے ذہن و دماغ کو محفوظ رکھنے کا وعظ مادیت میں لتھڑے ہوئے طبقات کی خوئے قدیم ہے۔ حکومت کی طرف سے آج تک کسی ایسی درسگاہ کا افتتاح نہیں ہوا جو شعر و موسیقی میں تدریسی شان پیدا کر دیتی۔ قوم کی طرف سے کوئی ایسا مستند اور باقاعدہ مدرسہ اب تک نہیں بنا جو صرف ادبی نشو و نما کے لئے مخصوص ہوتا۔ ان تمام موانعات کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ملک پر ادب و شعر کی حکومت ہے۔ کوئی شہر خواہ اُس کا عمرانی اقتدار کتنا ہی کم کیوں نہ ہو، ایسا نہیں جہاں ایک "بزمِ ادب" قائم نہ ہو چکی ہو۔ مشاعروں کی کثرت، شعرا کی مانگ کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ وہ لوگ، جو ادب و شعر کی علی رُس الاشہاد تکذیب و تضحیک کرتے رہتے ہیں، ادبی اجتماعات میں اُن کی نشست سب سے آگے ہوتی ہے۔ اگر کسی ملک کی صحیح کیفیت عوام کے طبعی و ذہنی رجحانات کا مظاہرہ کر سکتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ آج کوئی حقیر سے حقیر جریدہ بھی ایسا نہیں جو ادبیات کی نشر و اشاعت سے بے نیاز ہو۔ کوئی اخبار اُٹھا لیجئے، کوئی رسالہ لے لیجئے، نثر میں یا نظم میں ادبیات کی جلوہ افروزی ضرور ہوگی۔ معلوم ہوا کہ ہماری اجتماعی زندگی ادبیات کے اثر سے محور ہے۔ اور ہم باوجودِ موانعات و مشکلات ادب کی پذیرائی و گیرائی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ادب ہمارے دماغ اور ہماری روح پر اپنی فطری قوتوں کے ساتھ مسلط معلوم ہوتا ہے۔

حیاتِ قومی میں ادبیات کا حصہ

کسی قوم کی اخلاقی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور اجتماعی زندگی کا پتہ ہمیں صرف اُس کے ادبی کارناموں سے ملتا ہے۔ جن قوموں کا ادب زندہ ہے وہ قومیں آج بھی زندہ ہیں۔ ہم اُن کے ادب سے اُن کی ذہنی کیفیات

اور جذبات کا پتہ لگا سکتے ہیں۔

زندگی کا کوئی شعبہ لے لیجئے، وہ سیاست ہو یا مذہب، ادب موجودہ کے اثرات سے معرّا نہیں ہو سکتا۔ ادب زندگی کے ہر پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ ادبِ اردو کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گذرا جس میں مطربانِ ادب نے ملک کی ہر جیتی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالکر نغمۂ بیداری نہ گایا ہو اور سوئی ہوئی قوم کو جگا نہ دیا ہو۔ ایک ہندوستان کیا عرب و مصر اور یونان و روما کے ایوانوں اور دیوانوں میں تہذیب و تمدّن اور ارتقائے انسانیت کے جو غیر فانی نقوش بنائے جاتے ہیں وہ بھی ادبی کاوشوں ہی کا نتیجہ ہیں۔ جس قوم نے اپنی زبان کے ادب کو محفوظ رکھا اُسکی روایات محفوظ رہیں اور جس نے ادب سے بے اعتنائی کی اُن کا نام و نشان بھی صفحۂ ہستی پر باقی نہ رہا

ادب نہ صرف قومی خصوصیات و روایات کے تحفظ کا ضامن ہے بلکہ ماحول اور واقعات و حالات کی تصویریں بھی نگارستانِ ادب میں صدیوں محفوظ رہتی ہیں۔ سنسکرت جو ہندوستان کی قدیم ترین زبان ہے اور جو آج بھی پاٹھ شالاؤں اور بعض یونیورسٹیوں میں ثانوی زبان کا درجہ رکھتی ہے اپنی ہمہ گیری سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہو جائے لیکن ہندوستان کے عہدِ عتیق کی فضائیں اُس کے ادب میں اس طرح متجلی ہیں گویا اُن کی تصویریں ابھی کھینچی گئی ہیں۔ اور ہم اُن سے بعید ترین آریہ قوموں کے جذبات و احساسات کا صحیح علم حاصل کر رہے ہیں۔

علم و ادب کی تبلیغ و خدمت کے ذرائع

علم و ادب کی خدمتِ تبلیغ و ترویج کی ذمہ داری جہاں خود علما، ادبا، اور طالبانِ علم و ادب پر عائد ہوتی ہے وہاں اُس حکومت پر بھی عائد ہوتی ہے جو کسی ملک و قوم کے اجتماعی انتظام کی ذمہ دار ہو۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہمیشہ حکومتوں نے علم و ادب کے شعبوں کو اپنی نگرانی و انتظام میں رکھ کر نئی نوعِ انسان کی عظیم الشان ادبی و علمی زندگی کے احیاء و بقا کی مستقلاً کوشش کی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ایران میں ایرانی، ترکستان میں ترکی، مصر میں مصری، اور حجاز و عرب میں عربی، یونان میں یونانی، انگلستان میں انگریزی اور ہندوستان میں آریہ حکمرانوں نے علوم و فنون

کی گہری دلچسپی کے ساتھ سرپرستی فرمائی، اپنی اپنی زبانوں کے تحفظ و ترفع کے لئے بڑے بڑے علمی و ادبی مراکز قائم کئے۔ اور ادیبوں اور علما کو وظائف دے کر انھیں فکرِ زندگی سے آزاد کیا۔

ابھی تاریخ کے صفحات نے عباسی خلیفہ مامون رشید کے اُس عظیم کارنامۂ علمی اور ذوقِ ادب کو فراموش نہیں کیا ہے جو ایک طویل شدید جنگ کے فیصلے کی صورت میں قیصرِ روم سے اس سمجھوتے پر منتج ہوا تھا، کہ قیصر روم یونانی فلسفے کی تمام کتابیں اُس کے سپرد کردے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور مامون نے سلطنت روم کو محاصرے سے آزاد کرکے صلح کرلی۔

اگر مامون اور اُس کا ذوق اس جذبے کا حامل نہ ہوتا اور اگر وہ بہ اعتبار ذوقِ علم اتنا عظیم انسان نہ ہوتا تو کون کہہ سکتا ہے کہ یونانی فلسفہ اس درجہ اکملیت کے ساتھ عربی زبان میں منتقل ہوجاتا۔ مامون نے اس کی تکمیل کے لئے ایک عظیم الشان دارالترجمہ قائم کیا تھا جس میں عہد مامون کے تمام سربرآوردہ علما اور ادبا تصنیف و تالیف کا کام کرتے تھے۔

ابھی تاریخ نے امیر اکبر اعظم کے اُس قابلِ رشک ذوقِ ادب کو نہیں بھلایا ہے جس نے فیضی اور ابوالفضل کو سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لئے مجبور کیا۔ اور جس کے ذریعے فارسی اور سنسکرت علم ادب میں ایک ایسا تبادلۂ علمی ہوگیا جس نے ہندوستان میں متحدہ قومیت کی مضبوط بنیاد ڈال دی۔

میرا مطلب یہ ہے کہ کسی حکومت پر جہاں اپنے مقبوضہ ممالک کی حفاظت کے لئے کثیر التعداد فوج رکھنے کی ضرورت ہے، وہاں بطورِ فرضِ ملکی زبان و ادب کی ترویج و اصلاح اور ترقی و فلاح کی طرف متوجہ ہونا بھی لازمی ہے۔

چنانچہ آج روسیا نے اس اندیشے اور ضرورت کو محسوس کرلیا ہے۔ اُس نے اپنے ادبا، شعرا اور صناعوں کے لئے ایک علٰحدہ مستقر بنا دیا ہے جہاں وہ آزادانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور اُن کے اخراجات کا تمام بار سلطنت برداشت کرتی ہے۔

ادب و شعر کی یہ گرم بازاری، کہ آج بیشتر افرادِ ملک شعر کہتے ہیں اور شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں

خدمتِ ادب سے ہمیں ذرا بھی بے نیاز نہیں کرتی۔ یہ افراط نہ خود اُن کے لئے مفید ہے نہ ادب کے لئے فائدہ مند کہی جا سکتی ہے۔ جب تک کہ تقسیم کار کے اصول پر ہماری شاعرانہ جماعتوں کو تقسیم نہ کر دیا جائے اگر صحیح اعداد و شمار سے کام لیا جائے تو تمام ہندوستان میں کئی ہزار نفوس ایسے نکلیں گے جو خود کو شاعر سمجھتے ہیں اور جو شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت اُنھیں عہدِ حاضر کا شاعر نہیں کہا جا سکتا، ہزاروں ایسے بھی ہیں جن کی تمام عمر مشقِ سخن اور خدمتِ ادب میں گذری ہے لیکن اب تک باوجود دیرینہ مشق و کہنہ سالی اُن کا کوئی خاص درجہ تاریخ ادبِ اُردو میں قائم نہیں ہوا ——— میری رائے میں ایسے لوگوں کو اپنا راستہ بدل دینا چاہئے۔ اور تنازع للبقا کے اصول کے مطابق زندگی کے ایسے نئے محاذ پر نمودار ہونا چاہئے جہاں وہ اپنی عملی کوششوں سے بقائے دوام حاصل کر سکیں۔ بقائے شعر و حیائے ادب کے لئے لازمی نہیں کہ تمام ملک شاعر بن جائے۔ مسندِ شاعری صرف اُسی کے لئے مخصوص ہے جو فطرتاً شاعر ہے، جسے شاعر بنکر جینا، شاعر بن کر مرنا اور شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ باقی رہنا مقدر ہو۔

میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ مجھے ادبِ اُردو کا مستقبل نہایت زرّیں نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں حقیقی خدمتِ ادب کا ذوق برابر بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ملکی صحافت ادبی جواہر ریزوں سے مستقلاً مالا مال ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کیا عجب ہے کہ انھیں نوجوانوں میں سے چند نفوس میرؔ و سوداؔ، اور داغؔ و غالبؔ کی فطرت لے کر پیدا ہوئے ہوں۔ اور اُن سے یہ دور ایک غیر فانی ادبی دور بن جائے۔ میں تمام ملک سے بآوازِ بلند اپیل کرتا ہوں کہ اُردو ادب کے تحفظ اور روایاتِ ادب کی نگرانی میں کشادہ نظری اور وسعتِ ذہن سے کام لینے کی ضرورت ہے ہم موجودہ دور کے شاعرانہ عروج و زوال کے ضامن ہیں۔ ہمیں مادیات میں گھر کر ایسی غفلت اور بے اعتنائی سے کام نہ لینا چاہئے جو آئندہ نسلوں کی نگاہوں میں ہمیں مطعون و ذلیل کر دے۔ ہمیں اپنے ادبا اور ادب کی سچائی کے ساتھ خدمت کرنی چاہئے تاکہ ہمارا دور، دورِ پیشین و عہدِ آئندہ کیلئے ایک قابلِ تقلید دور ثابت ہو سکے۔

آٹھواں خطبہ

مشاعرۂ بزمِ ادب کاندھلہ ضلع مظفر نگر

۲۸ر اکتوبر ۱۹۳۳ء

تحدیثِ نعمت معزز اراکینِ بزمِ ادب، وگرامی شرکائے مشاعرہ!

فی الحقیقت وہ تفوق و اعزاز ایک نعمت ہے جو کسی کو کسی جماعت یا مجلس کی طرف سے عطا کیا جائے۔ اسلئے اس تفویض صدارت کا شکریہ ادا کرنا تحدیثِ نعمت ہی کے مترادف ہے۔ اور "وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" کی نیازمندانہ تعمیل۔ پھر اُس کے جذبۂ تشکر کا کیا پوچھنا ہے جو اپنی ناچیز ہستی پر ایسی نعمتوں اور سرافرازیوں کا نزول صرف عطائے ایزدی اور خدا کا کرم سمجھتا ہو۔

اردو شاعری کی ترقی اور معیار حضرات! اردو شاعری مختلف انداز و طراز کے ساتھ ہر زمانے میں کچھ نہ کچھ ترقی ضرور کرتی رہی ہے۔ السنۂ مشرقیہ میں اردو کی ہمہ گیری کے باوجود ادب اردو کی ترقی کا کوئی معیار ذہنی متعین نہیں۔ اس لئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ آج اردو شاعری ترقی کی کس منزل پر ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ترقی کی رفتار عروج کی طرف ضرور ہے بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری میں میر و غالب نے ایک خاص معیارِ شاعری معین کر دیا تھا۔ لیکن تیرہویں صدی کے اختتام اور چودھویں صدی کے آغاز میں وہ معیار قائم نہ رہ سکا۔ اور ملک کا اقبال مند و عیش پسند طبقہ اپنے مذاق کے مطابق شاعری کو کہیں سے کہیں کھینچ لے گیا۔ پھر بھی

ماضی کا مجوزہ و مقررہ معیار، اپنی شوکت و متانت کے اعتبار سے اتنا بودا اور کمزور نہ تھا کہ اس کشمکش سے اس کا اعادہ ناممکن ہو جاتا۔ بالآخر چودھویں صدی ہجری کے ربع ثانی میں، جب ہندوستان مغربی دمشرقی علوم کا گہوارہ بن چکا تھا۔ وہ ہی میر و غالب کا معیار بروئے کار آیا۔ اور آج اعلیٰ علمی سوسائٹی میں اسی معیار کی پرستش جاری و باقی ہے۔ جن حاشیہ نشینانِ بزم ادب نے افراط و غلو سے کام لیا وہ بدمست ہو کر محفل سے رخصت ہوئے اور اعتدال پسند جماعت اپنی سرمستی کے نغمے بلند کرنے کے لئے اپنے پیش رو بادہ گساروں کی صحیح جانشیں سمجھی گئی۔

مشاعرے

اس طرح اردو شاعری تو کسی نہ کسی درجہ ترقی پر فائز رہی۔ لیکن مشاعروں کی اصلاح و تہذیب کی طرف دماغ و ذہن شاید کبھی متوجہ نہ ہوا۔ مشاعروں کی وابستگی، شاعری کے ساتھ ازلی اور ابدی ہے۔ لیکن مغربی تہذیب و تمدن کے ورود سے جہاں مشرق کی بیشتر روایاتِ قدیم میں اضمحلال پیدا ہو گیا، وہاں "مشاعرہ" بھی قدیم روایات کا زیادہ پابند نہیں رہا۔ اوّل اوّل مشاعرے قلعۂ شاہی میں ہوتے تھے، اس کے بعد امرا بادشاہ کی خوشنودی کے لئے مشاعرے منعقد کرتے رہے۔ اس کے بعد بعض دیگر خواص نے مشاعروں کے انعقاد میں حصہ لیا آخر آخر یہ ایک رسم عام ہو گئی۔ اور اب تو یہ حال ہے کہ معمولی ترین خرچ کر کے بھی مشاعرہ منعقد کیا جا سکتا ہے۔ اور بعض اوقات بغیر خرچ بھی مذاقِ غزلخوانی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

مشاعرے کا رواج، اپنے نقطۂ آغاز سے جس قدر دور ہوتا گیا اُسی قدر اُس کی عظمت، اہمیت اور افادیت میں کمی ہوتی گئی۔ چنانچہ آج اکثر مشاعرے صرف تفریحی، رسمی اور قطعاً دماغ فرسا ہوتے ہیں۔ جن میں چند تفریح پسند افراد جمع ہو کر رات کا ایک بڑا حصہ تالیوں اور قہقہوں میں سیاہ کر دیتے ہیں۔ یہ ایسے ہی مشاعروں کا نتیجہ ہے کہ مشاہیر اور ثقہ شعرا نے مشاعروں میں جانے سے قدم روک لیا ہے۔ ورنہ پہلے یہی مشاعرے تھے جن میں اساتذہ اور منتھی شعرا سر آنکھوں سے شریک ہوتے تھے۔ اور مشاعروں کے انعقاد کا انتظار "شامِ عید" کی طرح کیا جاتا تھا۔

مشاعرے کا مقصدِ اقصیٰ صرف یہ ہے کہ ایک عہد کے قابل اور دیرینہ مشق شعرا ایک جگہ جمع ہو کر تبادلۂ

کلام کریں اور اس تبادلۂ کلام سے مبتدی اور طلبائے فن فائدہ اٹھائیں یعنی ایک اجتماعی حیثیت سے ادب کی رفتارِ ترقی کا اندازہ ہوتا رہے اور اس کے ساتھ ہی ترقی کی طرف عملی قدم اٹھتا رہے لیکن جہاں اُدبا اور فضلا کا پتہ بھی نہ ہو اور تفریح پسند طبائع زمین و آسماں کے قلابے ملا رہی ہوں، وہاں ادب کی رفتار و معیار کا اندازہ کرنا، اور ترقی کی طرف کوئی متحسن اقدام کرنا، نقار خانے میں طوطی کی آواز سن لینا ہے۔

اگر مشاعروں سے احیائے ادب اور ترویج و تشویقِ زبان مقصود نہ ہوتی تو دورِ حاضر میں سب سے پہلے ایک دیرینہ خادمِ ادب کی حیثیت سے میں ہندوستان سے بہ منت عرض کرتا کہ مشاعرے قطعاً بند کر دئے جائیں۔

شعرا کی بے قدری و کس مپرسی

عصرِ موجودہ کے مشاعرے نہ صرف ناموسِ ادب کے لئے ننگ و عار ہیں بلکہ ان کے ذریعے ہمارے نام نہاد شعرا کی جیسی مٹی پلید ہو رہی ہے وہ بھی ناقابلِ بیاں اور قابلِ ماتم ہے۔ جو محشر خود ان کے ناخواندہ اور ناخواستہ اجتماع سے برپا ہوتا ہے۔ اس میں ان کی ذرا بھی پرسش نہیں ہوتی۔ ان کا قیام اکثر ایسی کاروانِ سرائے میں ہوتا ہے جہیں برابر برابر بہت سی شکستہ و ریختہ چارپائیاں پڑی ہوتی ہیں اور یہ شہسوارانِ عرصۂ سخن، مشاعرے کی مہم سر کرنے سے پہلے اور سر کرنے کے بعد اُن پر آرام فرماتے ہیں۔ کھانا انھیں جیسا ملتا ہے غالباً سرائے کے کھانے سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد تو ان غریبوں کو پھر کوئی پوچھتا بھی نہیں جو سادہ لوح کرایۂ ریل اپنی جیب سے خرچ کر کے "آل انڈیا مشاعروں" کے فریب میں آجاتے ہیں اُنھیں واپس ہونے کے لئے اکثر اپنی کلاہ دستار کا رہینِ منت ہونا پڑتا ہوگا۔ اس لئے کہ مشاعرے کے بعد بانیان و منتظمانِ مشاعرہ کو اپنی واماندگی و سرخوشی سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ ان ناخواندہ مہمانوں کی واپسی کا انتظام کریں۔ اس تمام مصیبت و زحمت کے باوجود کوئی مشاعرہ ایسا نہیں ہوتا جہاں یہ شہرت پسند جماعت "تو مان نہ مان میں ہوں تیرا مہمان" کا نغمۂ انانیت الاپتی ہوئی نہ پہونچ جاتی ہو۔ ظاہر ہے کہ اب مشاعرے قلعۂ معلیٰ میں تو ہوتے

نہیں۔ مختلف شہروں میں چند ادبی انجمنیں قائم ہیں۔ وہ بھی چندے کر کے مشاعرے منعقد کرتی ہیں بیشک جب مرجوعہ اس قدر خطرناک ہو تو بدنظمی کا سارا بار الزام بانیانِ مشاعرہ کے سر نہیں تھوپا جا سکتا۔

اس کا علاج لیکن جب روایاتِ مشرق کو پس پشت ڈال کر مشاعرے بجائے مسند و بساط کے کرسیوں اور اسٹیجوں پر ہونے لگے ہیں اور جب شمع محفل کی جگہ برقی قمقمے آتش محفل سمجھے جا رہے ہیں تو اس روز افزوں انحطاط کو روک دینے کے لئے بھی کسی مغربی طریقۂ انتظام سے کام لیا جا سکتا ہے۔ ورنہ سب سے بہتر ترکیب یہ ہے کہ ہر مشاعرے میں صرف مخصوص و منتخب شعرا کو دعوتِ شرکت دی جائے۔ اور دعوت ناموں میں صاف لکھ دیا جائے کہ غیر مدعو حضرات کے قیام وطعام یا غزلخوانی کی کوئی ذمہ داری بانیانِ مشاعرہ پر نہ ہوگی۔ اس طرح نام نہاد شعرا کی یہ ہنگامہ آرائی خود بخود کم ہو جائے گی۔ اور مشاعروں میں سنجیدگی پیدا ہو جائے گی۔

کسی مشاعرے کی کامیابی کا انحصار کم سواد و بد مذاق شعرا کی کثرت اور نااہل سامعین کی ہنگامہ آرائی پر کبھی نہیں ہو سکتا۔ جس میں دو چار ادیب و مشاہیر شریک ہو کر ہمیں اپنے کلام سے مستفیض کریں وہ مشاعرہ یقیناً کامیاب ہے۔ جب ارباب علم و کمال کی کمی نہیں تو کیا ضرورت ہے کہ بدنام کنندگانِ ادب کو ایوانِ ادب میں اذنِ باریابی دے کر اشاعتِ فن کے مقصدِ عظیم کو پراگندہ کیا جائے، اور ایک سکون آفریں فضا کو شورش پسند افراد کا اکھاڑا بنا دیا جائے۔

مشاعروں کے مطروحہ مصرعوں کے متعلق بھی مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ اکثر مصرعے مذاقِ سلیم سے قطعاً گرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور مشاہیر شعرا کی عدم شرکت کی ایک بڑی وجہ مصرع کا بیکار ہونا بھی ہوتا ہے۔ اس لئے مصرع کی تجویز ہمیشہ صدر مشاعرہ کی رائے سے ہونی چاہئے۔ تاکہ وہ اپنے مذاق و ذوق کے مطابق مشاعرے کا ماحول مرتب کر سکے۔ اور ادبی اجتماع کے لئے ایسا مصرع تجویز کرے جو عظمتِ ذوق، اور رفعتِ خیال سے متوازن ہو کر ایک ادبی مجلس میں بار آور ہونے کے شایاں ہو۔

صدارتِ ناقص میں ہمیشہ اس کے خلاف رہا ہوں اور اب بھی بزور احتجاج کرتا ہوں کہ مشاعروں یا ادبی مجالس کی صدارت کبھی کسی غیر شاعر کو تفویض نہ ہونی چاہئے

ہماری ادبی مجالس میں کوئی "سر" اور کوئی "آرزبل" کسی خادمِ ادب پر قابلِ ترجیح نہیں ہو سکتا۔ ایک غریب خادمِ ادب جس نے سالہا سال ادب و شعر کی خدمت کی ہو اِن خطاب یافتہ غیر ادبی شخصیتوں سے بہر حال ممتاز ہے۔ کسی غیر شاعر صدر کی صدارت میں شاعرہ پڑھنا، شاعر اور شعر دونوں کی توہین ہے۔ ایسے شاعروں کی شرکت سے اگر ہمارے وطن کے متقدر شعرا احتجاجاً انکار کر دیا کریں تو یہ بدعتِ جاریہ بھی مسدود ہو سکتی ہے۔

صدرِ مشاعرہ اگر شاعر نہ ہو تو ادبیاتِ مشرق کا ماہر یا اُن سے وابستہ تو ہو۔ سچ پوچھئے تو ہندوستان کے شاعر نے اپنا وقار خود کھو دیا ہے۔ وہ چاہے تو اب خود ہی اُسے حاصل کر سکتا ہے۔ میں صاف اور صریح الفاظ میں یہ پیش گوئی کرنے کے لئے مجبور ہوں کہ اگر شاعروں کی موجودہ روش و رفتار کی جلد اصلاح نہ کی گئی تو مستقبل قریب میں کوئی مستند شاعر اور معتبر ادیب کسی مشاعرے میں کبھی شریک نہ ہوگا۔ اور مشاعرہ صرف بھنڈ ئی یا تھیٹر بن کر رہ جائے گا۔

میں تمام ہندوستان کے ادب دوست نوجوانوں اور ادیب بزرگوں سے التجا کرتا ہوں کہ اگر اُنھیں فنِ شاعری کا تحفظ اور احیائے ادب مقصود و منظور ہے تو موجودہ افراط و بدعات کا تجزیہ لازمی و ضروری ہے۔ ورنہ یہ فنِ شریف اس قسم کی بھگتر بازیوں اور مضحکہ انگیزیوں کے ہاتھوں ذلیل تر ہو جائے گا۔ اور شاعروں سے جو توقعات قائم کی جا سکتی ہیں وہ سب مجروح و معدوم ہو کر رہ جائیں گی۔

مشاعرے کا غلط ماحول مشاعرے میں شعرا کی طرح سامعین کا بھی کوئی خاص معیار نہیں۔ آنے جانے اور اُٹھنے بیٹھنے کا کوئی طریقہ مقرر نہیں ہوتا۔ جب جس کا جی چاہا اُٹھا اور چلا گیا، جس کا دل چاہا آیا اور بیٹھ گیا۔ اس ہڑبونگ کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سخن فہم و داد آشنا حضرات شعرا کی نگاہ سے دور رہتے ہیں اور ایک قسم کا انتشار پیدا ہو جاتا ہے اس سلسلے میں بھی فطرت و ضرورتِ اصلاح بزم کی تنظیم چاہتی ہے۔ شاعر کا دل، جو فرشتوں کی ہم نشینی و ہم مجلسی کا خوگر ہے، ربطِ غیر جنسی اور اختلاطِ نارا سے اور بھی اُلجھ جاتا ہے۔ اور صرف "سکوتِ سخن شناس" ہی کا آسرا نہیں ہوتا بلکہ "تحسینِ ناشناس" سے بھی اُسے محروم رہنا پڑتا ہے۔ آگے بڑھ کر بے محل بیٹھنے والے محلِ داد

اور موقع تحسین سے ناواقف ہوتے ہیں اس لئے اُن کی نافہمی بھی سکوتِ مطلق بن جاتی ہے۔ ہاں اگر کوئی شعر انتہائی رکاکت و ابتذال کی وجہ سے اُن کی سمجھ میں آجاتا ہے تو خوب تالیاں اور سیٹیاں بجتی ہیں، اور ایک ایسی فضا خراش چیں پکار، شاعر کے ماحول میں گونجنے لگتی ہے کہ گویا کسی بند مکان میں کبوتروں کی کئی ٹکڑیاں لڑ رہی ہیں اور "گبوتر باز" "ہاؤ ہو" میں مصروف ہیں۔

مشاعروں میں جب تک سخن شناس اور تعلیم یافتہ ذی فہم حضرات کی شرکت کا بطورِ خاص انتظام نہیں ہوتا، مشاعروں کا صحیح ماحول قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کی صورت بھی یہی ہے کہ اعلیٰ طبقے کے ادب دوست افراد کو دعوتِ شرکت دی جائے اور اُنکی نشست کا خاص اہتمام کیا جائے، اب رہے دوسرے لوگ تو ان کو درجاتی طور پر بزمِ سخن میں جگہ دی جا سکتی ہے۔

خود رَو شعرا کی اصلاح ہندوستان میں ایک طبقہ شاعروں کا تو وہ ہے جو کسی استادِ فن یا میر کامل کا پیرو اور تابع ہے۔ اس کی روش افکار محتاط، اور عیوبِ استعمال سے منزّہ ہوتی ہے۔ لیکن ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو خود بینی و خود روی کے زعم میں کسی کا اتباع اور کسی کی اصلاح پسند نہیں کرتا۔ اس طبقے کے افراد گمراہ ہونے کے باوجود، خود کو خضرِ راہِ ادب سمجھتے ہیں، اُنکی کجروی کی ایسی مکروہ مثالیں ملتی ہیں کہ بے اختیار شاعری سے تائب ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ مثلاً ابھی ۲۰، ۲۱ اکتوبر کو میرٹھ کے آل انڈیا مشاعرے میں ایک صاحب نے علیٰ رؤس الاشہاد پڑھ دیا۔

"میرا جبیں رہے نہ تری آستاں رہے"

ماتم گسارانِ ادب کی نگاہیں نیچی ہو گئیں، اہلِ علم مسکرا کر رہ گئے، اور تعلیم یافتہ نوجوانوں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ لیکن اس پر خود غلط شاعر نے آخر تک نہ سمجھا کہ یہ مختلف النوع مظاہرِ تضحیک کیوں ہو رہا ہے؟ مشاعرے کے یکایک بے معنی صداؤں سے لبریز ہو جانے کو ہما را خود رَو شاعر اپنے شعر کا معجزہ سمجھتا ہے۔ لیکن اس شورِ بے جا، اور داد بے ہنگام کی غایت نہ اُس کی سمجھ میں آتی ہے نہ اُسے کوئی سمجھاتا ہے۔ اسی طرح ایک اور صاحبزادے نے اسی مشاعرے میں یہ شعر نہایت آزادی سے پڑھا ؎

ہے دخل غیر، غیر ضروری شبِ وصال تکیہ بھی میرے آپ کے کیوں درمیاں ہے

استغفر اللہ! اگر ہماری شاعری کا معیار یہ شعر ہو سکتا ہے تو ایسی شاعری قابلِ نفرین و لعنت ہے یہ شاعر ایسا شعر کہہ کر لاتعداد گناہوں کا مرتکب ہوا ہے۔ اخلاقی گناہ۔ تمدنی گناہ، مجلسی گناہ، ادبی گناہ، اب اگر اتنے گناہوں کی پاداش اسے بصورتِ عذاب برداشت کرنی پڑے تو کیا اس کی نجات کی وہ جماعت ضامن ہو سکتی ہے جس نے اس شعر پر داد و تحسین کا طوفان برپا کر دیا۔ اور جس کی طبیعت باوجود اعادہ و تکرار بھی اس شعر سے سیر نہ ہوئی؟ معلوم ہوا کہ جہاں ہندوستانی شاعر امرد کا مذاق شعر پست اور ذلیل ہو گیا ہے وہاں سامعین کا مذاق بھی گرتا چلا جا رہا ہے۔ اور اگر اس کی روک تھام نہ کی گئی تو پھر شاعر اور شاعر نواز سامع دونوں کا کہیں ٹھکانہ نہیں۔

محاکمے کی ضرورت

یہ فرض ناگوار بھی صدر مشاعرہ کو ادا کرنا چاہیئے۔ اگر وہ اس قسم کی لغزشیں، غلطیاں اور بے عنوانیاں مشاعرے میں دیکھے تو بعد مشاعرہ اُن پر محاکمہ کر کے بتائے کہ "جبیں" مونث اور "آستاں" مذکر ہے۔ اور نہایت نرم الفاظ میں آگاہ کر دے کہ اس قسم کے رکیک ایہام کی اردو شاعری متحمل نہیں ہو سکتی جس کا مظاہرہ شعر مذکور میں کیا گیا ہے۔ بغیر محاکمہ غلطی اپنی جگہ باقی رہتی ہے۔ اور غلطی کرنے والا اپنی جگہ لاعلم و بے خبر پھر اصلاح ہو تو کیونکر؟۔ محاکمے سے پہلا فائدہ تو یہ ہو گا کہ غلطی کرنے والا آئندہ اس غلطی کا اعادہ نہ کرے گا۔ اور دوسرا یہ کہ عوام بھی اس غلطی سے واقف ہو کر اُس کے ارتکاب سے باز رہیں گے۔ محاکمہ بیشک ایک جامِ تلخ ہے جسے کوئی آسانی اور خوشی سے گوارا نہیں کر سکتا۔ لیکن بغیر اس تلخی کے اصلاح بھی کسی طرح ممکن نہیں۔ اس لئے میری رائے ہے کہ مشاعروں میں رفتہ رفتہ محاکمے کا بھی رواج ہونا چاہیئے۔ جس کا پیرایہ ایسا ہو کہ باوجود تلخ ہونے کے تلخ معلوم نہ ہو۔ جس طرح کنین کی گولی پر اگر شکر کی تہ چڑھا دی جائے تو اُسے مریض گوارا کر لیتا ہے اور گنین کی ماہیت و اثر میں کوئی فرق نہیں آتا۔

غزل کا معیار

جب ہنوز اردو شاعری ہی کا کوئی معیار معین نہیں تو ظاہر ہے کہ غزل کا معیار بھی مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً اسلوبِ بیان کے لحاظ سے اردو شاعری اس قدر متنوع المعیار ہے کہ اگر پانچ غزلیں یہ یک وقت دیکھی جائیں تو اسلوبِ بیان سب کا جدا ہو گا۔ جب زبان کا

اپنے الفاظ اور محاورات کے ساتھ ساتھ تمام ہندوستان میں عموماً اور اہلِ زبان میں خصوصاً یکساں بولی اور سمجھی جاتی ہے تو پھر اسالیب بیان کا یہ اختلاف شاعری ہی سے وابستہ کیوں ہے؟ یقیناً اس کے کچھ اسباب ہیں۔ اُن میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ بعض لوگ صرف روزمرّہ کی ترویج کے حامی ہیں۔ اور متانتِ خیال و الفاظ کے مخالف۔ وہ کسی شرط پر یہ نہیں چاہتے کہ اصنافِ سخن میں جس چیز کا نام "غزل" ہے وہ تغزلِ محض سے سرمو بھی تجاوز کرے یا اسکے اسالیب و موضوعات میں فلسفہ و تصوف کی گنجائش پیدا ہو۔ غالباً اُن کا یہ اصرار صرف اس لئے ہے کہ وہ "غزل" کے لغوی معنی کی تحدید چاہتے ہیں۔ اور "بازناں سخن گفتن" سے زیادہ غزل کو کوئی اور حیثیت دینا نہیں چاہتے۔

میری رائے میں غزل کے لغوی معنی واضع نے جو کچھ رکھے ہوں، مگر اصطلاحی معنی کی وضع موجودہ زمانے میں ہمیں ضرور بدلنی پڑے گی۔ اُردو شاعری میں جو انقلاب رونما ہوا ہے اسکے اثرات سے غزل محفوظ نہیں رہی ہے اور ایک عجیب و غریب مجموعہ بن کر رہ گئی ہے۔ مرزا داغ کے پیرو، اور امیر کے بعض متبعین، غزل کو زبان کی شوخی، خیالات کی عمومیت اور چلبلے پن تک محدود سمجھتے ہیں۔ لکھنؤ اسکول غزل میں آشیان و جنازہ، میّت، گل و بلبل، ماتم و سینہ کوبی وغیرہ کو تغزل صحیح سمجھتا ہے۔ اور وہ نوجوان جن کے پیشِ نظر مستقل طور پر کوئی خاص راستہ معلوم نہیں ہوتا، غزل کو محض اظہارِ خیال و بیانِ جذبات کا ایک ذریعہ خیال کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غزل جس چیز کا نام ہے وہ بہت محدود اور بہت ہی مشکل صنف ہے۔ اسکی ترقی کی بھی دنیا میں زیادہ گنجائش نہیں، متقدمین میں میر و غالب اور مومن و داغ ہر ایک کا تغزل علیحدہ علیحدہ درجہ رکھتا ہے۔ موجودہ زمانے میں اکثر شعراء "تغزلِ صحیح" کے پیرو نہیں ہیں۔ صبر کر لیا جاتا اگر وہ غزل میں کسی اسکول کی صحیح تقلید بھی کرتے مگر ایسا نہیں ہے بلکہ آج ہر اُس نظم کو غزل کہدیا جاتا ہے جو ۷ یا گیارہ اشعار کا مجموعہ ہو اور جس کے اشعار مختلف مضامین پر مشتمل ہوں

دراصل شاعری، جس کی تحلیل اس مختصر سے خطبہ میں ممکن نہیں بہت ہی اہم اور مشکل ترین فن ہے جو ظنیات کو علیحدہ کر کے صرف شاعر کے باطن سے تعلق رکھتا ہے۔ شاعر جس جس روحانی منزل

سے گذرتا چلا جائے گا اُس کی شاعری بھی اتنی ہی ترقی کرتی جائے گی، غزل جو روحانیت کے بلند ترین تخیل کے مقابلے میں بہت بڑی حد تک مادی یعنی مجازی دنیا سے تعلق رکھتی ہے اُسی وقت کہی جا سکتی ہے جب کہ شاعر کی روح سوزِ محبت سے خاکستر ہو چکی ہو اس کے بعد وہ جس طرح محبت اور اُس کے ارتقا کی منزلیں طے کرتا چلا جائے گا اس کی شاعری بھی بلند ہوتی جائے گی اور اس بلندی کے ساتھ ساتھ تصوف و توحید اور دوسرے مسائل کی جھلک اس کے کلام میں نظر آتی جائے گی

حقیقی شاعر اپنے تغزل میں ان مدارج اور مراتب پر پہونچ کر ایسا لطیف چھٹینا دیتا ہے کہ سارا عالم محسوس اس کے رنگ کا پرتو معلوم ہونے لگتا ہے۔

یہ تو ہے شاعری اور اسکی ایک صنفِ تغزل کا اصلی روپ، مگر اب یہ بھی تو دیکھئے کہ اکثریت اس پر کہاں تک عمل کر رہی ہے، افسوس میرے پاس وقت نہیں ورنہ میں تجزیہ و تحلیل کے بعد اسکی تصریح کرتا۔ اجمالی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ غزل اپنی اصلی صورت میں باقی نہیں رہی ہے۔ جب یہ حال ہے تو اصلاح کی کوشش کا خیال یہ صورتِ جواز پیدا کرتا ہے کہ اس کو "بازنانِ سخن گفتن" تک محدود نہ رکھا جائے اور جہاں تک ہو، لطیف و رنگین متین اور اعلیٰ خیالات و جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا جائے فنی طور پر میں "تعین" کا قائل و حامی ہوں، لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اگر کوئی شخص صحیح غزل کہہ سکتا ہے یا کہتا ہے تو اُسے بھی مندرجۂ بالا نظریہ کا پابند یا عامل ہونا ناگزیر ہو۔ جو طبقے صحیح غزل نہیں کہہ سکتے وہ اگر نظریۂ مذکور کو اختیار کر سکتے ہیں تو انھیں اختیار رہے۔

غزل کی زبان

جو طبقات غزل کو صرف بازاری خیالات اور چونچلہ نگاری تک محدود سمجھتے ہیں، وہ اس کے بھی حامی ہیں کہ غزل میں روزمرہ استعمال ہونا چاہئے میرا مذہب یہ نہیں ہے، میں زبان کی سادگی کو خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کی بلندی کی عدم موجودگی میں غلط خیال کرتا ہوں، غزل کی صحیح زبان اور صورت یہی ہو سکتی ہے کہ زبان علمی، الفاظ مضبوط و لطیف، پر شوکت و نغمہ بار ہوں اور خیالات و جذبات بلند و پاکیزہ ہوں۔

سادگی کے ساتھ مناسب فارسی تراکیب اگر بے تکلف استعمال کی جائیں تو یقیناً غزل میں بلندی

پیدا ہو سکتی ہے، وہ شعرا جن کی زبان اور خیال کمزور اور بے جان ہیں۔ اس ترقی یافتہ دور میں کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ زمانہ اُن کو پیچھے ڈھکیل رہا ہے اور مجھے افسوس ہے کہ اُنکی ترقی کے امکانات مسدود ہوتے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے اندر لسانی و ذہنی انقلاب کے متوازن انقلاب پیدا کرنے سے قاصر ہیں، یاد رکھئے، زبان کی بلند پائیگی و متانت، الفاظ کی مناسب سوکت، خیالات کی بلندی، تراکیب کی چستی اور جذبات کا اچھوتا پن ہی ادب کی جان اور شاعری کی روح ہے۔

غزل کا ایک شعر تو یہ ہے:۔

آئے گا نہ تو رات کو، کب مجھکو یقین تھا　　شاید کہ ترا وعدۂ وصل اور کہیں تھا

اور ایک شعر یہ ہے:۔

کیا میں بھی پریشانیٔ خاطر سے قریں تھا　　آنکھیں تو کہیں تھیں دلِ غمدیدہ کہیں تھا

دونوں شعر، شعر ہیں۔ اور دو غزلوں میں موجود۔ پھر کیا سبب ہے کہ ہم مذاقِ عامّہ کی پرورش و نوازش کرتے ہوئے پہلے شعر کو صرف اس لئے غزل کی تعریف میں داخل کر لیں کہ اس میں ایک پست، رکیک، اور غیرت و حمیت سوز خیال آسان الفاظ میں نظم ہوا ہے۔ اور دوسرے شعر کو محض اس لئے کہ اُس میں خیال کے ساتھ الفاظ بھی متین اور گراں ہیں، تغزل کی حدوں سے نکال دیں؟

"پریشانیٔ خاطر"۔ "قریں" اور "دلِ غمدیدہ" فارسی کے الفاظ اور ترکیبیں سہی، لیکن کیا یہ الفاظ اُردو زبان میں مروج اور مستعمل نہیں؟ اگر ہیں، تو ہم انھیں اُردو شاعری سے یعنی ادبِ اُردو سے کسطرح خارج کر سکتے ہیں؟۔ غرابت البتہ ایک عیب اور قابلِ ترک چیز ہے۔ لیکن سہل الاستعمال اور مروج الفاظ فارسی ہوں یا عربی جو ہماری زبان میں رس بس گئے ہیں کسی نوعیت سے بھی ترک نہیں کیے جا سکتے۔

جب تک ہم اپنی شاعری کی زبان کو، جہلا اور عوام کی زبان سے ممیز نہ کر دیں ہمیں کوئی تفوق اور ادبی امتیاز حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہر زبان کا علمی اور ادبی حصّہ، عوام کی زبان سے فائق ہوتا ہے جب ہماری شاعری رفعتوں کی حامل ہوگی تو ہمارے ہم آہنگ و ہمنوا بھی مجبور ہو جائیں گے کہ وہ ہمارے

معیار تک پہونچنے کی کوشش کریں۔۔۔ جو لوگ کم مائگی و کم سوادی سے ہمارے معیار تک پرواز نہ کرسکیں گے اُنھیں فطرت خود آگاہ کردے گی کہ وہ "شاعر" نہیں۔ اور اُنھیں اس میدانِ وسیع میں اپنی تگ و تاز ختم کردینی چاہئے۔

نواں خطبہ

غزل

محررہ دسمبر ۱۹۳۵ عیسوی

غزل کی صنفی خصوصیت غزل کو عوام اس عنوان سے جانتے ہیں کہ جب یہ نام اُن کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو خیال میں اشعار کا ایک مجموعہ آجاتا ہے لغوی حیثیت سے غزل کے معنی عورتوں سے گفتگو کرنا۔ یا عورتوں کا ذکر کرنا اور حدیثِ شراب وشباب بیان کرنا ہیں۔ جس شخص نے سب سے پہلے اس چیز کا نام غزل رکھا اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ عورتوں سے جو گفتگو نثر میں نہیں کی جاسکتی وہ نظم میں کی جائے۔ لیکن بہت تھوڑے زمانے کے بعد ہی "غزل" کی یہ لغوی یا معنوی خصوصیت جاتی رہی۔ خود عرب میں جہاں یہ عنوان وضع کیا گیا تھا شاعری نے دو صورتیں اختیار کرلیں۔ ایک یہ کہ مرد اپنے جذباتِ محبت عورتوں کو مخاطب کرکے ظاہر کرنے لگا دوسری یہ کہ عورت اظہارِ جذبات کے وقت مرد کو مخاطب صحیح سمجھنے لگی۔

عرب کی عورتیں بھی شاعری کے ذوق سے آشنا تھیں۔ اس لئے شاعر مردوں اور شاعرہ عورتوں نے ان دونوں خصوصیات کو نباہا۔ دونوں قسم کی شاعری عرب میں مروّج رہی اور دونوں قسم کے اشعار کو "غزل" کا نام دیا گیا۔

عرب کے بعد عجم میں یہی شاعری عربی عروض اور علمِ کلام کے ساتھ جب عجم کے بعض مشہور

شہروں میں پہنچی تو وہاں اُس کا رنگ متصوفانہ ہو گیا۔ گرا سرارِ تصوف کی ترجمانی بھی اسی عنوان سے ہوئی فارس بت المذاہب تھا اس لئے تصوف اور خدا شناسی۔ حقیقت اور پارسائی کے جذبات عوام میں جذب ہو چکے تھے۔ شاعری ہر دور میں مذاقِ عامّہ سے وابستہ رہی ہے۔ فارسی شعرا نے اسی مذاق کو ملحوظ ذہن رکھتے ہوئے اپنی شاعری کا دامن مذہبیات، اخلاقیات اور الٰہیات سے بھر دیا۔

ہندوستان اردو شاعری سے پہلے ہندوستان میں جب تک اردو شاعری مروّج نہ تھی سنسکرت اور بھاشا میں جذبات کی ترجمانی ہوتی تھی۔ اور یہاں وہ ہی ایک صنفی خصوصیت شاعری کا نصب العین تھی۔ جسے عرب کے واضعانِ غزل نے قائم کیا تھا یعنی عورت متکلم اور مرد مخاطب صحیح تھا۔ ہندی شاعری میں غزل گوئی کا رواج نہ تھا۔ بلکہ منفرد اشعار میں جو "دوہے" کہلاتے تھے۔ مختلف جذبات و کیفیات کا اظہار کیا جاتا تھا۔

غزل ہندوستان میں ایران و افغانستان کے شعرا عہدِ سلاطینِ مغلیہ میں یا اس سے پہلے ہندوستان آئے تو "غزل" بھی اُن کے ساتھ آئی۔ ہندوستانی شاعر ہندی شاعری کے اسلوب سے واقف تھا۔ اس لئے غزل کے وضعی و اساسی مقصد کو اول اول خوب سمجھا۔ یعنی اس نے "غزل کے عنوان سے صرف صنفِ نازک کو مخاطب کیا اور غزل کو صرف انھیں موضوعات تک محدود رکھا۔ جن کا تعلق عورت اور صرف عورت سے تھا۔ سلاطین قطب شاہیہ میں سلطان محمد قلی صفِ اوّل کا شاعر تھا۔ اُس کا یہ شعر اس بیان کا پورا ثبوت ہے:۔ ؎

عشق کی پتلی ہے گوری رنگیلی چترناریاں میں متی ہے چھبیلی

خلطِ مبحث لیکن مطالعۂ تاریخ سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ صنفی خصوصیت عنوانِ "غزل" کے ساتھ بہت عرصہ تک باقی نہ رہی۔ اردو میں شعر کہنے والے مجبور تھے کہ فارسی شعرا کی غزلیں سُنیں اور ویسے ہی جذبات کا اظہار اپنی غزلوں میں بھی کریں۔ فارسی زبان میں ضمائر کی وحدت اور تذکیر و تانیث کے فقدان نے ذہن کو ایک نئی صنف کی طرف رجوع کر دیا۔ اور رفتہ رفتہ دستخانی، گیسوئے دراز، دوپٹہ، لمبے پائنچے، لبِ گل رنگ اور وہ تمام باتیں جو عورتوں کے جسم و لباس سے مخصوص

تھیں۔ مردانہ خصوصیات میں بدل گئیں۔ اور انکی جگہ کاکل، بند قبا، اور خطِ رخسار نے لی۔ یہاں تک کہ آگے چل کر خواجہ آتش لکھنوی نے تو صاف صاف کہدیا۔ (ع):۔

مدعائے سخت جانی کر کہ قاتل ہے مرا کا

اس دور میں "غزل" کے لغوی معنی بدل کر "لڑکوں سے اظہارِ محبت" ہو گئے۔ اس کے بعد ہر دور میں مخلوط جذبات کی ترجمانی ہوتی رہی۔ یعنی غزل کے کسی شعر سے یہ ثابت ہوتا رہا کہ شاعر کا محبوب صنفِ نازک سے ہے اور کسی شعر سے یہ واضح ہوتا رہا کہ مطمحِ شاعر کوئی طفلِ کمسن ہے۔

اس خلط مبحث کا سبب ایک نہیں دو ہیں۔ مغل سلاطین[1] کی خواتین قریب قریب سب شاعرہ اور صاحبِ علم و کمال تھیں۔ اردو شعرا دربار رس تھے۔ جب وہ شعر پڑھتے تھے اور موضوعِ شعر نسائیت سے متعلق ہوتا تھا تو اکثر امرا خواتین شاہی کو شاذ ایسا سمجھ کر اس قسم کی شاعری کو ادب و احترام کے خلاف سمجھتے تھے۔ دوسرا سبب یہ کہ عہدِ سلاطین مغلیہ میں "مغبچوں" کو کافی باریابی و قبولیت حاصل تھی۔ جو اپنے حسین کاندھوں پر سیاہ گیسو ڈالے ہوئے نشیلی اور سرمہ آلود آنکھوں میں ستیاں بھرے ہوئے، اور رنگ رنگ ہونٹوں میں تبسم جھلکائے ہوئے بادشاہ اور امرا کو شراب پلانے پر مامور تھے۔ درباری شعرا انکی زاہد فریب اور زہد شکن اداؤں کی تعریف کر کے بادشاہ کو خوش کرتے تھے۔ شراب و کباب۔ رندی و مستی، شیخ و واعظ۔ اسی راستے سے بزمِ شعر میں داخل ہوئے۔ شراب کی شان میں اس قدر آزادی کے ساتھ قصیدہ خوانی ہوئی کہ شاعری شراب نوشی کا فتویٰ بن گئی۔ اور شیخ و واعظ پر طعن و تشنیع کی ایسی بوچھار ہوئی کہ بے چاروں کو اپنی وضع کا تحفظ مشکل ہو گیا۔ اس بیجا ئیت کی اوّلیت کا سہرا بھی فارسی شاعری ہی کے سر ہے۔ اردو شاعری پر اگر کوئی جرم عائد ہوتا ہے تو وہ صرف جرمِ تقلید ہے۔

اقدامِ اصلاح فارسی اور اردو شاعری کا یہ اسلوب مدتوں یوں ہی جاری رہا۔ آخر سا لہا سال کے بعد میر نے اس بے راہ روی کی ایک حد تک روک تھام کی۔ اور غزل میں

---

[1] سفرنامہ ڈاکٹر لیٹنر گورج مطبوعہ لندن

سوز و گداز کا نیا رنگ بھر کر متانت و سنجیدگی اور قبولیت و اثر کا اضافہ کیا۔ میر سوز نادر خواجہ درد نے بھی فضا کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ لیکن جب آتش و ناسخ کا زمانہ آیا تو شاعری پھر خرافات کا مجموعہ بن گئی۔

حکومت کا اثر غزل پر دہلی اور آگرہ شاہانِ مغلیہ کے دارالسلطنت تھے۔ علما اور فضلا کی نگاہِ حقیقت شناس نے اس دماغی سمیت کا احساس کر لیا تھا۔ اس کی مدافعت کیلئے مذہبی اور اخلاقی قوتیں حرکت میں آچکی تھیں۔ لیکن ملک میں یکایک طوائف الملوکی پھیل جانے سے امکانِ مدافعت کمزور ہو گیا۔ لکھنؤ میں نواب شجاع الدولہ، نواب سعادت علی خاں اور خصوصاً نواب واجد علی شاہ کی رنگ رلیاں ناقابلِ انسداد تھیں۔ مصحفی اور جرأت نے میر کا تتبع کیا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔

اب عام طور پر غزل میں متصوفانہ مضامین بھی ہوتے تھے۔ اور سوقیانہ بھی۔ نوابی دربار دں کی عیش پسندی ثقاہت و تصوف کی خشکی کو کب گوارا کر سکتی تھی۔ انشا نے تغزل کے پردے میں نسائیت کی وہ عریانیاں دکھائیں کہ زاہدانِ گوشہ نشیں اُچھل اُچھل پڑے۔ اُن کے بعد امانت نے شاعری کی سبھا پر اُستادی کا سکہ جما کر شعر کو خیال سے عمل میں منتقل کر دیا۔ اور اندر سبھا لکھ کر دادے، ٹھمریاں لاؤنی اور غزل کو اندر کے اکھاڑے کی تصویر بنا دیا۔

ثقہ اور سنجیدہ شعرا سے یہ دور خالی نہ تھا۔ سودا۔ خواجہ وزیر۔ صبا۔ رنگ۔ بحر۔ لکھنؤ میں، مومن۔ آزردہ۔ خواجہ نصیر وغیرہ دہلی میں "غزل" کے بادشاہ مانے جاتے تھے۔ لیکن مزاجِ حکومت میں جو رنگ مستقل اور مستحکم ہو چکا تھا اُسے کوئی مٹا نہ سکا۔

دورِ غالب (اکبر آبادی) اب وہ زمانہ آیا کہ شاہ عالم اور محمد شاہ کی رنگ رلیاں ختم ہو چکی تھیں تا واجد علی شاہ کے حریم عشرت و جمال میں فرسودگی و افسردگی پیدا ہو چکی تھی سلطنتِ مغلیہ کی اُجڑی ہوئی محفل کا آخری چراغ دہلی میں ٹمٹما رہا تھا۔ ایوانِ ظفر بہار دوش کی ایک بے رنگ تصویر تھا۔ آثارِ زوال در و دیوار سے نمایاں تھے۔ تاہم قلعۂ معلیٰ میں عہدِ ماضی کی صدائے بازگشت گونج رہی تھی۔ امارت باقی نہ تھی۔ لیکن رگ و پے میں امارت کا نشہ باقی تھا۔ شہنشاہی کی شہنائی کی آواز بیٹھ چکی تھی

لیکن نغمۂ زندگی کبھی کبھی سازِ تکتہ کو متحرک کر دیتا تھا۔ مشاعرے ہوتے تھے، مجلسیں ہوتی تھیں۔ ذوق استاذ السلطان تھے۔ ظفر کے لئے جو کچھ کہتے تھے اس میں رنگِ تغزل اور تفریحی معیار کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھتے تھے۔ مگر پھر بھی فضا کی المناکی سے مفر نہ تھا۔ اور وہ اس غزل میں بھی جھلک جاتی تھی۔ جو بادشاہ کے لئے بڑی احتیاط و اہتمام کے ساتھ کہی جاتی تھی۔

مرزا غالب نے اس انقلاب پر بطور خاص غور کیا تو اُن کی سمجھ میں آگیا کہ سامانِ غزل غزالانِ حرمِ شاہی کے ساتھ رخصت ہوا۔ اب غزل میں چھیڑ چھاڑ، معاملہ بندی، بوس و کنار، اور "ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیشدستی ایک دن" لکھنے کا وقت گیا، انتہی اور رانشائی رنگ کی گنجائش نہیں، صبح قریب طلوع ہے، محفل قریب الختم ہے۔ پروانوں کی خاک، شمع کی اُداسی، سامانِ نشاط کی برہمی، فضا کی گرفتگی، ماحول کی المناکی، یاس و قنوط کی فراوانی صاف کہہ رہی ہے کہ اب عالمِ خیال میں کامرانی کے دوپٹے سجانے، اور بال بال میں موتی پرونے کے دن نہیں ہے۔ حال مستقبل کا آئینہ بنا ہوا ہے۔ اور مستقبل حدیثِ حزن و ملال اور حکایتِ تاراجی و بربادی کا سلسلہ کر رہا ہے۔ اس لئے لکھنؤ اور دہلی کے رنگِ غالب سے بچ کر مرزا غالب اکبر آبادی نے ایک نیا اور متین و سنجیدہ راستہ غزل کیلئے اختیار کر لیا۔ جو گو اُن کے زمانۂ حیات میں حبۃ حبۃ مقبول ہوا۔ لیکن اُن کے بعد جو زمانہ آیا اُس میں کافی قبولیت و شہرت اور تائید و تقلید کے قابل سمجھا گیا۔ اب غزل کا رنگ یہ تھا:۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں — روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں؟ — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

مرزا داغ اور امیر مینائی جلال کا زمانہ

فصیح الملک مرزا داغ دہلوی مرحوم بھی قلعۂ معلی کے شاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ ذوق کے شاگرد تھے۔ اور بادشاہ ظفر کے منہ لگے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ مرزا غالب کی تقلید غزل میں نہ کر سکے۔ لیکن اتنا اثر ان پر بھی پڑا۔ کہ رفتہ رفتہ معاملہ بندی اور واقعات نگاری میں زبان و محاورات کے ساتھ معتدل سنجیدگی اختیار کر لی:۔

تنگ ہے دل وسعتِ دامانِ محشر دیکھ کر — اے جنوں ہم پاؤں پھیلاتے ہیں چادر دیکھ کر

اب کیوں نہ کریں نالہ ہمیں ڈر تو نہیں ہے — یہ عرصۂ محشر ہے ترا گھر تو نہیں ہے
کرتا ہے امام آج بہت سہو کے سجدے — پوشیدہ جماعت میں وہ کافر تو نہیں ہے

منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنوی، حکیم ضامن علی جلال، منشی امیر اللہ تسلیم بھی مرزا داغ ہی کے زمانے اور ماحول میں نشو نما پا رہے تھے۔ ان میں سے بعض نے اساتذۂ دہلی و لکھنؤ کا تتبع سمو کر غزل کیلئے ایک نیا رنگ بنانا چاہا۔

"ہندی لگائی جاتی ہے پائے نگاہ میں"

گروہ مقبول نہ ہو سکا۔ جلال نے غزل میں میر کا سوز، مرزا غالب کی شوکت اور مرزا داغ کی زبان کا اہتمام کیا۔ مگر خیالات جدید اور بلند نہ مل سکے اس لئے وہ بھی تغزل میں کوئی نئی زندگی پیدا نہ کر سکے۔ آج اگر ان کا نام زندہ اور باقی ہے تو صرف علمی و ادبی تحقیق و تصنیف کی وجہ سے ہے۔

مرزا داغ نے دیکھا کہ غالب، مومن کے بعد شوکتِ الفاظ اور فارسی تراکیب کی داد دینے والا کوئی نظر نہیں آتا، صاف اور شستہ غزلیں زیادہ قبول عام حاصل کرتی ہیں۔ اور رامپور سے دکن تک دہلی کی فصاحت و زبان کا سکہ بیٹھا ہوا ہے تو وہ محاورے اور روزمرہ لکھنے میں اور زیادہ مستعد ہو گئے۔ ادھر دربارِ رامپور نے ان کی قدر افزائی کی، پھر نظام دکن نے نواز لیا، تلامذہ کی تعداد بڑھنے لگی اور روزمرہ لکھنے کی طرف لوگوں کا رجحان زیادہ ہو گیا۔ معنی مرزا داغ کی عام فہم غزلیں گا کر اہلِ محفل کو دعوتِ وجد دینے لگے۔ دہلی کی زبان کا یہ عروج اور طنطنہ دیکھا تو امیر و جلال بھی اس طرف متوجہ ہو گئے۔ اور اب غزل کا رنگ خالص اردو بول چال اور روزمرہ تک محدود ہو گیا۔ گروہ رکاکت و ابتذال جواب سے بہت پہلے جزوِ غزل ہو گیا تھا۔ باقی نہ رہا۔

(داغ دہلوی)

غم سے کہیں نجات ملے چین پائیں ہم — دل خون میں نہائے تو گنگا نہائیں ہم
لپٹے ہوئے ہیں کسی زلفِ مشکبار سے ہم — داغ کیوں نہ کریں نکہتِ بہار سے ہم
یہ نازِ عشق سے کہتے ہیں افتخار سے ہم — جو تم ہزار سے اچھے تو سو ہزار سے ہم

(امیر مینائی)

پڑھے میں بھی منہ سوت دکھاتی نہیں مجھکو کافور سے بوئے کفن آتی نہیں مجھ کو

(جلال لکھنوی)

نہ چلّا کے رو قبر پر رونے والے بدلنے لگے کروٹیں سونے والے

مجھے خوب یاد ہے کہ ۱۸۹۶ء تک اس رنگ میں ہندوستان کی شاعری تمام تر رنگین رہی۔ مرزا داغ کے شاگردوں میں، احسن مارہروی، نسیم بھرتپوری، فتح ناروی، سائل دہلوی، بیخود دہلوی، آغا شاعر دہلوی امیر مینائی کے شاگردوں میں ریاض خیرآبادی، جلیل مانکپوری، مضطر خیرآبادی اور جلیل لکھنوی، اور حکیم جلال کے شاگردوں میں آرزو لکھنوی وغیرہ شعرائے اس رنگ میں غزل کا ایک خاص معیار قائم کر لیا۔

اب غزل گوئی میں کسی دربار یا حکومت کی پسند اور نوازش کا سوال باقی نہیں رہا تھا۔ مرزا داغ دکن میں استاذ السلطان تھے۔ اور دکن کے سوا ہندوستان میں کوئی دوسری عظیم شخصیت یا مرکزیت ایسی موجود نہ تھی جس سے معیارِ غزل گوئی کے متعلق استمزاج کیا جاتا۔

حالی و آزاد کا اثر غزل پر

لیکن پانی پت سے مولانا حالی اور دہلی سے مولانا آزاد اس رنگ کے خلاف علمِ بغاوت لیکر اٹھے۔ اُن کا خیال تھا کہ موجودہ رنگِ تغزل قوم و ملک کی ذہنی و اخلاقی تخریب کا باعث ہے۔ گو اس سے پہلے وہ خود بھی اسی رنگ میں شعر کہتے تھے۔ مگر جب دونوں نے لاہور کو اپنی ادبی مساعی کا جولانگاہ بنا لیا۔ تو کوشش کی کہ غزل کے لئے کوئی نئی داغ بیل ڈالی جائے۔ شاعروں میں مصرع طرح دینے کا رواج اٹھا دیا۔ اور غزل میں قومی و ملکی حالات کی ترجمانی کرنے لگے۔

مگر غزل میں معاملہ بندی، واقعات نگاری اور حسن و عشق کا رنگ اس قدر مستحکم ہو چکا تھا کہ تجدید کا موقع ہی نہ تھا۔ مجبوراً مسدس اور مثنوی کو قومی تعمیر کا ذریعہ بنایا گیا۔ تاہم عوام کی طبیعتیں "غزل" سننے کیطرف زیادہ مائل رہیں۔ اس لئے تغزل کا جو رنگ ایک اسلوب اختیار کر چکا تھا۔ وہ نہ بدل سکا۔

غزل کا ارتقا

۱۹۱۶ء عیسوی سے غزل اور تغزل میں خود بخود ایک تغیر پیدا ہونے لگا اس کا

سبب تھا کہ یکایک اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقوں میں شعر گوئی کا رجحان پیدا ہوا۔ یہ وہ طبقہ تھا جسنے مغربی شاعری کا بہ امعانِ نظر مطالعہ کیا تھا۔ اور جس کے ذہن میں میر و غالب اور مومن کے سیر حاصل مطالعے سے ایک حد تک اعتدال بھی پیدا ہو چکا تھا۔ جب غزل اس طبقے کے دماغ و ذہن کی گرفت میں آئی تو اس نے غالب اور داغ کا رنگ ملا کر جدید رنگ اختیار کر لیا۔ اس طبقے میں ڈاکٹر سر اقبال، فانی بدایونی، حسرت موہانی، عزیز لکھنوی، اور حشر کاشمیری، وغیرہ چند لکھے پڑھے ہوشمند شاعر تھے۔ جن کی صلائے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بہت زیادہ مقبول و مسموع ہوئی۔ ادھر کثرتِ تعلیم نے عام طبائع کو زیادہ مستعد اور سنجیدہ بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ پھر میر و غالب کی سوز آہنگی کے سامنے داغ اور امیر کی معاملہ بندی پھیکی نظر آنے لگی۔ اور وہ اقبال جس کا رنگ تغزل کبھی یہ تھا:۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی — گر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی؟
تمھارے پیامی نے سب راز کھولا — خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی؟
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا — تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی؟

اب اس رنگ میں غزل خواں تھا:۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں — کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
طرب آشنائے خروش ہو تو نوا بھی محرمِ گوش ہو — وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوت پردۂ ساز میں
دمِ طوف کرکبِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن — نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

فانی بدایونی:۔

ذرہ ذرہ تربتِ فانی کا شیون جوش ہے — اس صفِ ماتم میں اک شمعِ لحد خاموش ہے
پھیر لے میت کی جانب سے نگاہِ التفات — سیکڑوں سکتوں کے نرغے میں لبِ خاموش ہے
وصل ہو یا ہجر دونوں ہیں مرے مشرب میں کفر — شوقِ وحدت آشنا بیگانۂ آغوش ہے

رازِ آزادی فقط تیرے اسیروں پر کھلا
جو ترے قدموں پہ سر ہے بے نیازِ دوش ہے

حسرت موہانی :- ؎

دل اور تہیۂ ترکِ خیالِ یار کرے
کسے یقین ہو کون اس پہ اعتبار کرے

قرارِ جاں کے لئے اس نے شیوۂ تسکین
کبھی جو اور کیا ہو تو اختیار کرے

شبِ وصال ہے کوتاہ۔ نازِ یار دراز
ہجومِ شوق سے کہدو کہ اختصار کرے

گذر چکی ہے تمنا کی حسرت دشواری
کہاں تک اور کوئی تیرا انتظار کرے

عزیز لکھنوی :- ؎

بنا دیا نہ زمانے کو داستاں جب تک
ملی نہ عشق کو فرصت فسانہ سازی سے

بتا دے اے مجھے محفل میں چھیڑنے والے
ہے بہتر اور کوئی ساز دلنوازی سے؟

یہ وقت کونسا آیا ہے اے خدا مجھ پر
کہ چارہ ساز لرزتے ہیں چارہ سازی سے

دراصل یہی وہ صحیح رنگِ تغزل تھا۔ جس کی اس دور میں ضرورت تھی۔ مگر ابھی لکھنؤ اور دہلی کی زبان کے چٹخارے لینے والے، روزمرہ پر مرمٹنے والے، معاملاتِ وصل و ہجر پر سر دُھننے والے ہندوستان میں موجود تھے۔ اس لئے اگر نجیدہ اور تعلیم یافتہ طبقوں میں یہ رنگِ جدید مطبوع ہوا تو عوام میں وہی رنگ پسند کیا جاتا رہا۔ جو انشا اور امانت سے مذاقِ عامہ کو وراثتاً دلعیت ہوا تھا :- ؎

کسی کا ہائے شبِ وصل اس طرح آنا
کڑے چڑھائے ہوئے پائینچے اٹھائے ہوئے

باایں ہمہ لکھنؤ کے اکثر ثقہ شعرا نے متانتِ خیال کو اب بھی ہاتھ سے نہ دیا۔

ایک مترنم انقلاب یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ ملک کا مذاق کسی ایک معیار پر آکر ٹھہر جاتا۔ لہذا ایک انقلاب اور پیدا ہوا۔ یعنی غزل خوانی کے ساتھ ترنم کا رواج بھی ہو گیا۔ غزل خواہ کتنی ہی ناکام ہو۔ لیکن اگر غزل خواں خوش الحاں ہے تو اس کی غزل پر مشاعرے میں قیامت برپا ہو جانا یقینی سمجھئے۔ اب عوام غزل کے مضامین اور معیار کو نہیں دیکھتے بلکہ آواز کے اُتار چڑھاؤ پر اُن کے کان لگے رہتے ہیں۔ یوں تو ڈاکٹر اقبال، سائل دہلوی، اور مضطر خیر آبادی مترنم غزل پڑھنے میں اب سے بہت پہلے میدان مار چکے تھے مگر موجودہ زمانے میں آواز کے ساتھ کسی اور چیز کا بھی مطالبہ ہے جس کے پورا کرنے

کے لئے کافی کاوش و کاہش کی ضرورت ہے۔ تاہم اب یہ حال ہے کہ ہر خوش الحاں غزل گو خواہ وہ کتنا ہی تبدی کیوں نہ ہو "جانِ شاعرہ" سمجھا جاتا ہے۔ پھر جب غزل عام فہم اور عامیانہ خیالات کا مجموعہ ہو تو غزل گو کی لے کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے

جو نوجوان شعرا نہایت متین غزل کہتے تھے۔ اب ترنم کی ترویج و تشویق نے انھیں بھی مجبور کر دیا ہے کہ وہ اتنی آسان زبان اور مذاقِ عوام سے ہموار و ہم سطح غزل کہیں کہ ایک جاہل بھی اس کے سمجھنے سے محروم نہ رہے۔ مثلاً جگر مرادآبادی کا رنگِ تغزل تعلیمی و ادبی ماحول کے اثر سے کبھی یہ تھا۔ ؎

منزلِ غم میں کہاں وقفۂ راحت مجھ کو ہر نفس تازہ ہے درپیش قیامت مجھ کو
گر پڑی روح تعین کدۂ ہستی میں کاش ہوتا ہی نہ احساسِ محبت مجھ کو

نغمہ ہوں، نالہ ہوں، کیفِ شوق ہوں، فریاد ہوں مختصر یہ ہے کہ اک مجموعۂ اضداد ہوں
عشق بے پروا مرا کافی حقیقت ہے مری کچھ سمجھ کر میں ہلاکِ حسنِ بے بنیاد ہوں
مائلِ فرزانگی ہے اب مزاذوقِ جنوں آجکل میں محوِ تعمیرِ خرابِ آباد ہوں

مگر وہ کیفِ ترنم اور دادِ عوام سے سرخوش ہو کر اب یوں کہنے لگے ہیں :-

نظر ملا کے مرے پاس آکے لوٹ لیا نظر بچی تھی کہ پھر مسکرا کے لوٹ لیا

یہ ہیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا۔ ان خوش نوایانِ وطن کو کون سمجھائے کہ میاں، شعر کی حقیقی داد، "مشاعرے" میں نہیں "مطالعے" میں (یعنی کاغذ پر) ملتی ہے۔

فانی اور اُنکے معاصرین مگر فانی، عزیز، حسرت، اور اقبال نے مذاقِ عامہ میں انقلاب بتدریج پیدا ہو جانے کے باوجود اپنے رنگ کو سنبھالے رکھا۔ فانی جہاں اپنے رنگِ خاص سے الگ ہو کر عام رنگ کی طرف مائل ہوئے وہاں اُن کا بحیثیت شاعر کوئی درجہ نہیں رہا مثلاً

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے موت ملے تو مول نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

لیکن رنگِ محفل معلوم کرنے کے بعد وہ فوراً چونکے اور پھر وہیں آ گئے جہاں اُن کا حقیقی مقام تھا۔ ؎

دل رہے آلودہ دامن اور ہم دیکھا کریں آج اے اشکِ ندامت آ تجھے دریا کریں
ظرفِ دیرانہ لقدرِ تہمتِ وحشت نہیں لا ذرا ذرّے میں پیدا وسعتِ صحرا کریں

جوان شعرا میں جوش ملیح آبادی کو میں بہت متقل مزاج دیکھ رہا ہوں۔ دورِ حاضر جوش کے کلام اور رنگِ تغزل کو ہنوز مسلمات کا درجہ دے یا نہ دے مگر اُن کا رنگِ تغزل بھی وہ ہی ہے جسکی اس وقت ضرورت ہے

۵۔ سمجھے گا اُس کا درد کون شورشِ کائنات میں تو نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں
سانس میں بو ہے بادہ کی سجدے میں یادِ حسن ہے اب بھی دماغِ زہد کو شک ہے مری نجات میں

غزل کے قدیم موضوعات

غزل کا قدیم پیرایہ لاتعداد موضوعات وجذبات کا حامل رہا ہے۔ مثلاً شوق، نامہ و پیام، تمنائے ملاقات، ملاقات، اقرار کا خوف، اخفائے راز کی کوشش، اغیار کا خیال، رشک، رقابت، بہتان، شکوۂ فلک، شکایتِ تقدیر، وصل، ہجر، موافقت ناموافقت، منتِ پاسباں، نباہ، خفگی، جنگِ محبت، محبوب کی بے اعتنائی، استغنا، وفا، جفا، جوابِ صاف نامہ بر پر خفگی، پارسائی، ترکِ عشق، انتقام، شرم، حجاب، بے توجہی، منت خوشامد، سخت کلامی، رنج، ناامیدی، شب بیداری، اختر شماری، بیقراری، اضطراب، انتظار، دردِ فراق، شوقِ وصال، بدگمانی، نازو انداز، عشوہ و ادا، دشت پیمائی، آوارگی، دیوانگی، چاکِ گریبانی، نالۂ و آہ، شکوہ و فریاد، وحشت، تنہا پسندی، گوشہ نشینی سیرِ باغ، شبِ ماہ، ہم آغوشی، بے تکلفی، بوس و کنار، چھیڑ چھاڑ، ہاتھا پائی، شراب و کباب، جوش شباب صحبتِ احباب، جلسے، محفل آرائی، مستی، راگ، رنگ، بربط و چنگ، دنیا و مافیہا سے بے خبری، سامانِ تعیش محتسب کا اندیشہ، واعظ سے نفرت، شیخ و زاہد سے بغاوت۔

موسم بہار، سبزہ زار، بارش، بوچھار، بجلی۔ قوسِ و قزح، جھولا، کالی گھٹا، بھیگی ہوئی رات، کوئل کی کوکو، پپیہے کی پی کہاں، بلبلوں کا ہجوم، تمرّیوں کا شور، صبا کی روانی، ہوا کی بادہ چکانی، نہر کی لہر، دریا کی موج خیزی، فوّارے کی کوثر افشانی، پرندوں کا ہجوم، لہار کی دھوم، مرغانِ چمن کی نواسنجی، نسیم کی مست خرامی، سرو کی قطار بندی، چنار کی بلندی، خوشبو کا انتشار، پھولوں کا مہکنا، شاخوں کا لچکنا، سبزے کی لہک، چنبیلی کی مہک، بلبل کا برزخ، یاسمن، آشیاں، قفس، خوفِ صیاد، شکایتِ گلچیں،

خزاں۔ پتوں کی زردی۔ ہوا کی پریشاں رفتاری، بلبل کی اسیری، پھولوں کی پژمردگی، تنہائی کا سناٹا، شاخوں کی برہنگی، سبزے کی پامالی، سردی کا جوش، ژالہ باری۔

گل و بلبل، شمع و پروانہ، قیس و لیلےٰ، شیریں فرہاد، طور و کلیم، یوسف زلیخا، رندانہ خیالات۔ ماضی و مستقبل فراموشی، سیر و شکار۔

طفلی۔ جوانی۔ پیری، دنیا کی بے ثباتی، دوست کی بے وفائی، دوست کی کمیابی، موت کا خیال، مرض، علاج، موت، نثارِ قبر، گورِ کفن، گورِ غریباں، اندیشۂ حشر، زیارت و فاتحہ، قبر کی شکستگی، پرسشِ اعمال کی فکر، اقربا کی جدائی، سوگ۔ عزاداری، گناہوں پر ندامت، معاصی پر خجالت، توبہ، شکست توبہ، گناہ پر اصرار، یادِ الٰہی، روزہ، نماز، دیر، حرم، کلیسا، جنت دوزخ، کوثر سلسبیل، خوشی، غم، حسرت۔ تمنا۔ ندامت، شکر و شکایت۔ عبرت۔ صبر و رضا۔ توکل۔ رغبت، نفرت رحم، انصاف، تعجب، غصہ۔ امید۔ یاس۔ ذوق و شوق۔ حبِ وطن، ہمدردی، دین و مذہب کی ترجمانی وغیرہ وغیرہ۔

یہی وہ موضوعات ہیں جو تین صدیوں سے غزل میں کھپائے جا رہے ہیں۔ طرح اور زمین کا اختلاف صرف اتنا ہی فرق پیدا کر سکتا ہے جیسے ایک بہروپیا نئے روپ بھر کر آئے۔ یا جیسے شکر کے کھلونوں کا سانچہ مختلف شکلوں میں بدل دیا جائے۔ مگر مادّہ اور مزہ نہیں بدل سکتا۔

غزل کا جدید رنگ

مشکل یہ ہے کہ اس تمام عرصے میں مقلدین کی تخلیق تو برابر ہوتی رہی لیکن جہانِ شعر میں کوئی مجتہد پیدا نہ ہوا۔ ایک حمام میں سب ننگے تھے۔ کسی کو اپنی برہنگی نظر نہ آئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدامت و فرسودگی کے ساتھ عمومیت نے غزل میں جگہ پالی۔ اور ہر موضوع جس کا زندگی سے ذرا سا بھی تعلق تھا، غزل کے سازیں نغمہ بن کر گونجنے لگا۔ مرزا غالب اور مومن نے جدید موضوعات کی طرف قدم بڑھایا۔ تو وہ اہلِ فارس کے ماحول میں پہونچ گئے۔ مطلق اردو داں طبقہ اُنکی بلندیٔ تخیل اور ندرتِ فکر کو سمجھ نہ سکا۔ اور اُن پر مہمل گوئی کا فتویٰ صادر کر دیا۔

آخر دورِ حاضرہ نے اعتدال و متانت کے ساتھ اس مسئلہ پر غور کر کے ایک نیا راستہ دریافت کر ہی لیا۔

جن موضوعاتِ قدیم کا تعلق شاعری یا غزل سے نفسیاتی تھا۔ انھیں قطعاً نظر انداز کر دینا تو ایک مافوق الفطرت جسارت تھی۔ لیکن جہاں تک تجزیہ و ایجاز کا سوال ہے۔ رنگِ قدیم اور کہنہ تغزل میں اب بہت کچھ ترمیم ہو گئی ہے۔ اب موضوعاتِ غزل میں فلسفۂ حسن و عشق، عرفان و حقیقت شناسی، اسرار کشائی، درس و پیغام، واردات و جذبات اور محاکات کے علاوہ دوسرے موضوعات کی گنجائش بہت کم ہے۔ میری رائے میں یہ دور بہت کامیاب دور ہے۔ اور یہ رنگ بہت کامیاب رنگ ہے۔ اور اسی اسلوب و رنگ کا آگرہ اسکول مبلغ و ناشر ہے۔

غزل اور واردات و جذبات

صحیح تغزل کی روح واردات و جذبات ہیں۔ جو کیفیت حقیقتاً ہم پر طاری ہو۔ اور جو واقعات ہمارے مشاہدے اور مطالعے میں آئیں وہی ہماری غزل کا اصلی موضوع ہیں یہ لازمی نہیں کہ اگر ایک شاعر کسی کے فراق میں مضطرب الحال نہیں ہے تو وہ فراقیہ اشعار ضرور ہی لکھے۔ اور ایک دولت مند فارغ الافکار شاعر بھی ایک گدائے کاسہ لیس کی طرح فقر و فاقہ کے مضامین لکھ کر لوگوں کو اپنی تضحیک کا موقع دے۔ اس قسم کی شاعری یا غزل گوئی "تقالی" سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اور اگر قائل کی حالت اس کے قول کی تکذیب بھی کر دے تو سمجھئے کہ نقل بھی میں بھی نقص ہے۔

تاثیر صرف اُسی شعر میں پیدا ہو سکتی ہے جو شاعر کے دلی جذبات کا آئینہ اور اُس کی کیفیاتِ حقیقی کا ترجمان ہو۔ جب تک کہنے والا اپنے کلام کا اثر خود اپنے دل اور دماغ پر محسوس نہ کرے۔ اس وقت تک وہ دوسروں کی سماعت کو متاثر نہیں کر سکتا۔ ہمیں محسوس شاعری کی ضرورت ہے۔ مفروضہ خیالات کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ طرزِ پُر اثر، پیرایہ متین، اسلوب نیا، طریقہ اچھوتا زبان نہ ملایانہ، نہ بازاری، روزمرہ درست، محاورات برمحل، ترکیب چست، الفاظ بے ساختہ اور جملے شستہ ہوں کہ نہ حرف دبے۔ نہ زبان اُلجھے۔ نیز تقلیدی مضامین اور عام موضوعات سے احتراز ہونا چاہئے مختصر یہ کہ ہمارے ہونٹوں سے وہی صدا نکلے جو ہمارے دل سے اُٹھی ہو اور ہم ایک ایسا گنبد بنکر نہ رہ جائیں جسمیں صرف دوسروں کی آواز گونج سکتی ہے۔ اگر ہماری آواز دل سے نکلی ہوئی نہیں ہے۔ تو کم از کم دل سے نکلی ہوئی معلوم تو ہونی چاہئے۔

ایک ضروری مشورہ

جن لوگوں کو شاعر بن کر جینا اور شاعر بن کر مرنا ہے وہ ان حدود متعارفہ سے تجاوز کر ہی نہیں سکتے۔ یہاں اُن برخوردارانِ وطن کا ذکر نہیں جو محض نام نمود اور وقتی تفریح و نشاط کے لئے رسماً غزل کہہ لیتے ہیں۔ اور جن کی مثال اُس ناکام کگڑی بیچنے والے کی سی ہے جو اپنی جلیبی اور کامیاب کگڑی والی کی اس دلکش صدا کے بعد "مجنوں کی پسلیاں ہیں، لیلیٰ کی انگلیاں ہیں کیا خوب کگڑیاں ہیں"۔ یہ کہہ کر گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی کہ "میری بھی ایسی ہی ہیں"۔

اس بڑھتی ہوئی وبا اور چڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لئے اخلاقی جرأت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ یہ کام کوئی انجمن یا سوسائٹی انجام نہیں دے سکتی بلکہ تمام والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کا فطری رجحان اور ذہنی میلان معلوم کریں اور جب انھیں یقین ہو جائے کہ صاحبزادے "شاعری" کے لئے پیدا نہیں کئے گئے ہیں تو حکماً روک دیں۔ اور قدغن کر دیں کہ وہ کسی ضرورت کے ماتحت بھی شعر نہ کہیں۔

یہ ایک مسلّمہ ہے کہ جس قوم کے زوال کا عہد قریب آتا ہے۔ اُس قوم میں شاعر بکثرت پیدا ہو جاتے ہیں آج یورپ میں دو چار سے زیادہ شاعر نہیں مل سکتے۔ اسی طرح ایران اور افغانستان میں بھی شعرا کی کثرت نہیں مگر ہندوستان میں ہر چار قدم پر ایک تک بند کامل جانا بدیہیات سے ہے۔ اس مخترع کو روک دینے کی کوئی تدبیر ضرور ہونی چاہیے۔ تاکہ یہ بھیڑ چھٹ جائے۔ اور حقیقی و فطری شعرا کو بڑھنے اور کام کرنے کا یقینی موقع مل سکے۔

دسواں خطبہ

موجودہ اردو شاعری پر ایک تنقیدی نظر

آل انڈیا مشاعرہ کانپور

۲۔ دسمبر ۱۹۳۵ء

شاعری کا معیار اس سے پہلے کہ موجودہ اردو شاعری پر تنقید کی جائے۔ میری رائے میں شاعری کا ایک معیار مقرر کر لینا ضروری ہے۔ اس لئے کہ اگر شاعری کا کوئی معیار مقرر نہ کیا جائے تو موجودہ عہد کی صد رنگ شاعری پر تنقید کرنا ایک ایسے وسیع باغ کا تجزیہ کرنا ہے جس میں مختلف اللون پھول اور کانٹے موجود ہوں۔

شاعری کا معیار قائم کرنے کے لئے ایک متحد نقطۂ نگاہ کی ضرورت ہے۔ اردو شاعری آج ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر شہر میں رائج ہے، سمندر کے ساحلوں، اور میدان کے گوشوں پر آباد ہونے والے مقامات بھی اردو شاعری سے نابلد نہیں ۔ کاٹھیاواڑ، گجرات، اور مدراس، جہاں گجراتی، مدراسی، مرہٹی، اور کاٹھیاواڑی زبانیں مادری ہیں۔ وہاں بھی میں نے اردو شاعری کا رواج دیکھا ہے۔ خاندیش ممالک متوسط اور برار میں اردو نہ تو تعلیمی زبان ہے نہ مادری، لیکن اردو شاعری سے دلچسپی لینے والے وہاں بھی موجود ہیں۔ ادھر سندھ، اور بلوچستان سے لے کر پنجاب اور سرحدی علاقوں تک اردو شاعری مروج ہے، ادھر دامنِ نیپال سے جیبِ بنگال تک اور اس سے آگے برہما تک اردو شاعری

کا سلسلہ پایا جاتا ہے۔ دکن کا نام میں نے ارادتاً نہیں لیا۔ اس لئے کہ دکن میں تو دہلی اور لکھنؤ کی طرح اردو کی پرورش ہوئی ہے۔ اور ہو رہی ہے۔ پھر وہاں اردو شاعری کے عروج و صعود کا کیا پوچھنا ہے!

دہلی، یوپی، اور بہار کو لسانی اعتبار سے میں اردو شاعری کے جغرافئے میں ایک ہی صوبہ قرار دیتا ہوں بہار میں زبان کا لہجہ کسی قدر بدل جاتا ہے، لیکن یوپی کے اکثر شمالی اضلاع میں اردو کا یہی حال ہے۔ پھر جب انھیں یوپی کی حدود سے خارج نہیں کیا جاسکتا تو میں بہار کو بھی اردو کے انھیں مشہور مراکز میں شریک سمجھتا ہوں۔ خصوصاً اس لئے کہ لسانی لہجے اور بعض صوبوی محاورے شاعری میں حارج نہیں۔ اور وہاں بھی شعرا انھیں لسانی حدود میں کہا جاتا ہے۔ جن میں اردو شاعری محدود ہے۔

ادارہ ہائے شاعری اور اُنکی شاخیں

اردو شاعری اس وسعت کے ساتھ ہندوستان بھر میں آج صرف دو اسکولوں کی مقلد ہے۔ ایک اسکول مرزا داغ کا ہے اور دوسرا مرزا غالب کا آپ ہندوستان کے کسی صوبے میں تشریف لے جائیں اور وہاں کی شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ فرمائیں آپ کو یہی دو رنگ کارفرما نظر آئیں گے۔

مرکزی تقسیم کے اعتبار سے ان دونوں اسکولوں کے تتبع میں جو ادارۃ الانکار قائم ہیں انھیں مندرجۂ ذیل تحتی نمبروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) دہلی اسکول
(۲) لکھنؤ اسکول
(۳) آگرہ اسکول

یوپی میں صرف یہی تین ادارے ہیں، جو اساتذۂ فنِ شعر کے مستقر ہیں۔ ان کے علاوہ ہر ادارہ یا تو ان کا تابع ہے یا مقلد۔ اساتذۂ دہلی اور اُن کے مقلد، سادہ اور عام پسند زبان کی ترویج کے ہمیشہ معاون رہے ہیں۔ لکھنؤ اسکول نے پانچویں دور میں اپنا رنگ بدلنا چاہا اور غالب و مومن کی تعلید سے خیالات کے ساتھ الفاظ میں بھی شوکت پیدا کی۔ مگر مرزا داغ دہلوی کی شاعری کا ستارہ عروج پر تھا۔ اُن کے زمانے میں امیر مینائی اور جلال و تسلیم لکھنوی کو بھی مجبوراً دہلی کا رنگ اختیار

کرنا پڑا۔ لیکن لکھنؤ کی شاعری اپنے اس دور سے بہت زیادہ متاثر ہوئی جو دبیر و انیس سے شروع ہو کر مونس، اوج اور پیارے صاحب رشید وغیرہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ اُنکی شاعری بھی اردو شاعری ہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ حضرات صرف مسدس اور رباعی کو اپنا مظہر موضوع و خیال بنائے ہوئے تھے؛ اور غزل کی جگہ سلام کہتے تھے۔ اُن کے اسلوب افکار نے لکھنؤ کی غزل گوئی کا رنگ بڑی حد تک بدل دیا۔ اور گو یہ دور اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ باقی نہیں رہا۔ تاہم لکھنؤ کی شاعری میں یاس و قنوط، سوز و درد، شور و بکا، سوگواری اور المناکی اسی دور کا ورثہ ہے۔ جس کا اثر لکھنؤ کی شاعری میں ہنوز باقی ہے۔

آگرہ اسکول آگرہ، لکھنؤ اور دہلی کے بین بین خاموش ترقی کرتا رہا ہے۔ شعرائے متقدمین کو چھوڑ کر عہدِ متوسط کے شعرائے مرزا غالب مرحوم سے اُن کی زندگی تک افادہ کیا۔ لیکن آخر آخر یہ خارجی اثر آگرے سے کم ہوتا گیا۔ اور طالبانِ فن کسی مقامی ماہرِ فن کے علاوہ دوسروں کے ممنونِ اصلاح نہیں ہوئے۔

وہ سرزمین جس کی خاکِ پاک سے میر و غالب کے سراپا شعر مجسّمے بنے تھے ناممکن تھا کہ دورِ تعلیم و اصلاح میں میر و غالب کی صدائے بازگشت سے نہ گونجتی۔ گونجی اور پوری قوت کے ساتھ گونجی۔ ۱۹۱۲ء سے علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ ساتھ مرزا غالب کا رنگِ تغزل یکایک ہندوستان میں چمک اُٹھا۔ تعلیم یافتہ اور ترقی مآب طبقوں میں دہلی و لکھنؤ کے تصنع و تکلف کی زیادہ قدر نہ رہی۔ کچھ افراد ملک میں ایسے پیدا ہو گئے جو ان دونوں اسکولوں سے الگ ایک جدید رنگ کے علمبردار ہوئے۔ یہ وہ رنگ تھا جو مرزا داغ اور مرزا غالب کے رنگِ تغزل کے امتزاج سے بقدرِ معتدل پیدا ہوا تھا۔ "آگرہ اسکول" بھی آج اسی رنگ کا متبع و مؤید ہے۔ اور یہی وہ اسلوب و روش ہے جسے ہم اردو شاعری کے لئے بطورِ معیار پیش کر سکتے ہیں۔

عام اردو شاعری پر تنقید اس معیار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس جدید دورِ علم و فلسفہ میں اگر ہندوستان کی عام شاعری کو بنگاہِ تنقید دیکھا جائے تو وہی

بوسہ گیری، ہمکناری و ہم آغوشی، عالمِ وصل و ہجر کی جھوٹی عکاسی، لب و رخسار کی ہیجان آفریں مصوری، وعدہ اور ایفائے وعدہ کی لاطائل داستانیں، قیس و لیلیٰ اور شیریں فرہاد کے افسانوں کی جگالی، زاہد شیخ پر دشنام طرازی، شراب و کباب کی علیٰ رؤس الاشہاد تبلیغ، اور رکیک و مبتذل جذبات کی ترجمانی حاصلِ فکر سمجھی جاتی ہے۔

تقلید یا قدامت پرستی اس دورِ جدید میں ہمیں کبھی ترقی کے اُن راستوں سے متعارف نہیں کرسکتی جو صحیح منزل کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ آداب و آئین تقلید میں سب سے پہلی خرابی یہ ہے کہ ہمارا دماغ، ہمارا خیال، اور ہمارا آلۂ فکر دوسروں کا غلام رہتا ہے۔ ہم لکیر کے فقیر بنے رہیں۔ اور جدت و اجتہاد سے ہمیں دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔

آگرہ اسکول کی خصوصیات

ان تمام تقلیدی یا قدامت زدہ اسالیب شاعری کی حدیں توڑنے کے بعد، بہت دُور چل کر جو منزل شروع ہوتی ہے وہ ہی ترقی یافتہ اور حقیقی شعر کی منزل ہے۔ اور وہیں آگرہ اسکول کی بھی بنیاد رکھی گئی ہے۔

آگرہ اسکول کا ایک طالب علم اپنی غزل، والدین، استاد، بہنوں، بیٹیوں، اور ملک کی تمام خواتین کے سامنے بے تکلف پڑھ سکتا ہے۔

اس رنگ کے علاوہ موجودہ اردو شاعری جس رنگ میں بھی پیش کی جائے زندہ رہنے والی نہیں جس شعر کے سننے سے طبیعت میں اتنا غلط کتنا دیدا ہو کہ سامع کو بے اختیار ہنسی آجائے وہ غزل کا شعر نہیں، ریختی کا کوئی ٹکڑا ہو سکتا ہے۔ شعر وہ ہے جو ساعت میں کیف اور دل میں اہتزاز پیدا کردے۔ شعر وہ ہے جس کے سمجھنے کے بعد روح میں ایک روشنی اور معلومات میں ایک اضافہ محسوس ہو۔ شعر وہ ہے جو باوجود کوشش جاہل یا کم علم موزوں طبع شخص نہ کہہ سکے۔ اور شعر وہ ہے جو زبان سے زیادہ کاغذ پر موثر ثابت ہو۔

آج اردو شاعری خراب افراط ہے۔ اس میں تفریط کی بہرحال ضرورت ہے۔ اہلِ کمال اور کم علم لوگوں کی شاعری میں کوئی وجہ تفریق ہونی چاہئے۔ ردیف اور قافیہ اور بحر کی پابندی کے ساتھ ایک خیال موزوں کرلینا کوئی معجزہ نہیں۔ ہر موزوں طبع بہرحال شعر کہہ سکتا ہے۔ لیکن کاغذ اور اذہان

پر صدیوں باقی رہنے والے شعر دماغ کی جودت اور روح کی قوت سے کہے جاتے ہیں۔ صرف بحر اور قافیہ ردیف کے بوتے پر نہیں کہے جاتے۔

لیکن اس کا کیا علاج کہ آج فیصدی ۵ ۷ شاعر اُسی رسمی اور قدیم شاعری کے دلدادہ ہیں۔ جو ایک طرف سوسائٹی کے لئے مخرب اخلاق اور دوسری طرف خود فن کے لئے سببِ زوال ہے۔ شاعر میں صرف وہ شعر گو نہیں ہے جو عام پسند ہونے کے ساتھ ساتھ ذہنیتِ عوام سے متوازی بھی ہو۔ لیکن ایسے شعر کی عمر کا اندازہ کیجئے، تو لب و دہن سے نکلنے اور سماعت کو چھو کر ایک بے معنی شور اور ہونٹوں پر وقتی تبسم پیدا کرنے کے بعد اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔ شاعر، جو فطرت کا رازداں ہے، جو مرنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ اُس کے سب نہیں، کچھ اشعار تو ایسے ہوں جو صرف شاعر کے بعد نہیں، خود شاعر کے بعد بھی لوگوں کی زبان پر باقی اور دماغوں میں مرتسم رہیں۔

حریفانِ کم مایہ بلند رنگِ تغزل کا مضحکہ اُڑانے والے اپنی کم مائگی اور عجزِ طبیعت سے مجبور ہیں۔ چونکہ وہ خود بلند شعر نہیں کہہ سکتے اس لئے اس رنگ کو ہوّا بنا کر پیش کرتے ہیں اور جہلا کی تائید اُن کے ساتھ ہوتی ہے۔ ورنہ جدید رنگِ تغزل کوئی ایسا عجیب و غریب رنگ نہیں جو ان قدامت پرست حضرات کیلئے اس درجہ خطرناک ہو۔ موجودہ زمانے کا رنگ، موجودہ تعلیم کا رنگ، موجودہ تہذیب کا رنگ، اور موجودہ تمدن کا رنگ جس رنگ میں جھلکے وہ ہی جدید رنگِ تغزل ہے۔ اور جس رنگ میں دو چار سو سال پہلے کی جھلک ہو وہ قدیم، پھر کیا عقلِ سلیم گوارا کر سکتی ہے کہ آج چودھویں صدی ہجری کے نصف حصۂ آخر میں بھی ہماری شاعری کا وہ ہی رنگ ہو جو دسویں صدی ہجری کے نصف اول میں تھا؟ اسکی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے ایک فاضل و ماہر السنہ کو مجبور کیا جائے۔ کہ وہ اُسی زبان میں گفتگو کرے جس کا استعمال آغوشِ مادر میں کرتا تھا۔ یا اگر ویسی زبان اختیار نہ کر سکے تو اس کی نقل ہی کرے۔ اور اگر نقل بھی نہ کر سکے تو کم از کم خیالات وہ ہی ہوں جو عہدِ مہدِ طفلی میں تھے۔ یہ عروج کی طرف سے زبردستی کھینچ کر پستی کی طرف لے جانا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟۔

اردو شاعری، کبھی عروج و ترقی کی آخری منزل تک نہیں پہونچ سکتی، جب تک اس میں بلندی،

استحکام، روحانیت، اور شائبۂ الہام نہ ہو۔ بے شک ایسے حقیقی شاعر بہت کم ہیں۔ لیکن ان کی پیروی کرنا اور اُن کے نقوشِ قلم پر چلنا بھی صرف شاعری کا کام ہے۔ شاعر ہر دور میں گنتی کے ہوتے ہیں۔ گو ہر دور میں شعرا کی کثرت شمار و اعداد سے بالاتر ہوتی ہے۔

اُردو شاعری کا ایک اور نقص

باستثنائے چند، اُردو شاعری کا موجودہ دَور مہمل و باطل ہونے کے علاوہ ملکی و قومی زندگی سے وابستہ نہیں۔ حالانکہ ازمنۂ قدیم میں "شاعر" زندگی کے ہر شعبے پر حاوی اور زندگی کے ہر شعبے کا جزوِ لاینفک تھا۔

میں زیادہ دُور نہیں جاتا۔ جنگِ بلقان کے زمانے میں، باوجود ادعائے اخوتِ اسلامی، ہندوستان کے کتنے شعرا نے ٹرکی کی حمایت میں بلند نوائی کی؟ جنگِ طرابلس پر ہندوستانی شعرا کی کتنی نظمیں آج محفوظِ تاریخ ہیں؟ مسئلۂ فلسطین پر ہندوستان کے کتنے شعرا نے اظہارِ خیال کیا ہے؟ بلقان، طرابلس، اور فلسطین کو جانے دیجئے۔ بغاوتِ افغانستان کے موقع پر ہمارا "شاعر" کہاں تھا؟ کتنے شاعر ہیں جنھوں نے امان اللہ خاں کی بیکسی پر آنسو بہائے اور افغانستان میں قیامِ امن کے لئے اپنی نفیرِ فکر سے کام لیا۔ کتنے شاعر ہیں جنھوں نے حامیِ انسانیت کی حیثیت سے یورپ کی جنگِ عظیم کے خلاف جنگ کی؟۔

یورپ اور افغانستان کو بھی چھوڑیے۔ خود اپنے ملک میں موجودہ دور کے شاعر نے کتنا اور کیا کام کیا؟ تحریکِ آزادی، تنظیمِ ملت، ہتکِ کشمیر، توہینِ اسلام، مولانا محمد علی کی وفات، فرزندانِ وطن کی شہادت، غرضکہ گذشتہ پندرہ سال میں ایک دو نہیں سیکڑوں تاریخی حادثے رونما ہوئے۔ ہندوستان کے کتنے شعرا نے انھیں عنوانِ فکر بنا کر نظمیں کہیں اور اپنی شاعری سے درسِ اصلاح یا تلقین و پیام کا کام لیا؟۔

فرزندانِ وطن جیل خانوں میں ٹھونسے جا رہے تھے۔ اکابرینِ وطن دنیا سے رخصت ہو رہے تھے، بہادرانِ وطن سرفروشی کا عملی جذبہ دکھا رہے تھے، رہنمایانِ وطن قید و بند کے بعد انتشار و اضطراب میں مبتلا تھے۔ مگر شاعرانِ وطن، مکلف مسندوں پر تکیے لگائے، شمع کافور کی روشنی میں، اپنی بساط

انبساط و استغنا پر بزمِ مشاعرہ منعقد کئے بیٹھے رہے۔ اور اس جنوں خیز سیاسی موسم میں بھی ہمارا شاعر شبِ وصل کے جھوٹے خواب دیکھتا رہا اور بڑاتا رہا ؎

بند آنکھیں کئے بندہ تصور میں پڑا ہو چھم سے کوئی اس وقت جو آجائے مزا ہو

بیشک لاکھوں مدعیانِ شاعری میں دس بیس شعرا کا دردِ ملک و قوم سے متاثر ہو کر نظمیں کہہ لینا باقی تمام شعرا کی طرف سے کفارہ نہیں ہو سکتا۔ فضا کی تبدیلی پر، حزم و احتیاط کے ساتھ، ہر شاعر کو اپنا مسلک بدل دینے کی ضرورت تھی۔ ہر شاعر کو درد وطنیت سے تڑپ جانے کی ضرورت تھی۔ مشاعروں کی جگہ مناظمے قائم کئے جاتے، واقعات و حالات پر اثر آفریں اور فضا نواز نظمیں کہی جاتیں اور بتا دیا جاتا کہ شاعر بھی اپنے وطن کے ساتھ ہے، شاعر بھی اپنی قوم و ملت کا خادم ہے۔ اور شاعر بھی اگر ضرورت ہو تو جیل خانوں میں نوائے زنجیر پر رقص کرنے اور بابِ زنداں دیکھ کر غزلخواں ہونے کو تیار ہے۔

لیکن ایسا کیوں ہوتا، اور ایسا کون کرتا، جب کہ ایک صدی سے ہمارے شعرا کی یہ ذہنیت ہی نہیں رہی، عمل کے لئے تقلید کی ضرورت تھی۔ اور اساتذۂ متاخرین کے نقوشِ قدم اس راستے میں موجود نہ تھے، پھر تقلید کیونکر ہوتی؟

تقلید و قدامت پرستی عام اردو شاعری کے موجودہ انحطاط کا ایک بڑا سبب کورانہ تقلید بھی ہے شعرا کی اجتہادی قوت مرورِ ایام سے سلب ہو چکی ہے اور وہ ایک دائرۂ محدود سے نکلنا اور ترک و اختیار کی مقررہ قیود سے باہر آنا کفرِ شاعری سمجھتے ہیں۔ اس کوٹھی کے دہانوں اس کوٹھی میں، اور اس کوٹھی کے دہان اس کوٹھی میں منتقل کرنا، ان کا ایک منتقل مگر مہمل تخیل ہے۔ جس کا حاصل کچھ نہیں، جب ہندوستان کے شعرا اردو شاعری کا یہ حال ہو تو خاموش بیٹھنا گناہِ عظیم ہے۔ اس خرمنِ فرسودہ میں آگ لگا دینے کی ضرورت ہے۔ اس انبارِ قدامت آلود سے بزمِ سخن کو پاک کر دینا مناسب ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میری طرح اس ضرورت کو سب محسوس کرتے ہیں۔ لیکن لب کشائی کر کے انگشت نما کون ہو۔ ایک حمام میں سب برہنہ ہوں تو کسی کو اپنی برہنگی پر ندامت نہیں ہوتی۔ البتہ کبھی کبھی تردد پیدا ہو سکتا ہے۔ تو سوسائٹی کی دلچسپیاں اُسے بھی بھلا دیتی ہیں۔

تنقید کا غلط معیار

اردو شاعری پر تنقید ہوتی ہے۔ مگر ایبر کرومبی، کیٹس، ہربرٹ ریڈ، الیٹ، ملٹن اور ملٹن کے نقطۂ خیال سے اردو شاعری پر تبصرہ ہوتا ہے تو ارسطو اور دوسرے یونانی ناقدین کے نقطۂ نگاہ سے، مگر زمانے اور ماحول کو دیکھکر، ضرورت اور مطالبۂ وقت کو ملحوظ نظر رکھ کر اردو شاعری پر مشرقی نقطۂ نگاہ سے کوئی تنقید نہیں کرتا۔ تنقید سے اپنی علمی قابلیت اور وسعتِ مطالعہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے، تصنیف کا محاسبہ مقصود نہیں ہوتا۔ ایسی تنقیدیں اردو شاعری پر نہ صرف بیکار بلکہ غلط بحث کی تخلیق کا ذریعہ ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ باوجود لاتعداد تنقیدی مضامین کے اردو شاعری کے انحطاط و زوال میں مطلق کمی نہیں۔

اردو شاعری کا عہدِ اولین زبان کے اعتبار سے کتنا ہی معصوم کیوں نہ گذرا ہو مگر زمانے کی ضرورت کے مطابق ضرور تھا۔ میر و سودا، آتش و ناسخ، غالب و مومن، داغ و امیر اپنے اپنے عہد کے شاعرِ اعظم ہوئے ہیں۔ اور آج بھی جب ہم اُن کا مطالعہ بہ نگاہِ انتخاب بالاستیعاب کرتے ہیں تو ہمارے قلوب اُن کے کلام سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے، لیکن یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ آج کا شاعر، آج کا شاعر معلوم نہیں ہوتا۔ اُس کے جذبات اور اسالیبِ بیان گذشتہ دو سو سال کے قدیم نظر آتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری بلحاظِ موضوعات و اسالیب چار پانچ صدیاں گذرنے کے بعد بھی ابھی وہیں ہے جہاں سے اُسکی ابتدا ہوئی تھی۔ تو کیا یہ رفتار منزل رسی کے لئے کافی ہے؟

موجودہ شاعر کا عملی کریکٹر اور مشاعرے

ذرا ہمارے ایک کہن سال، کہن خیال، اور کہن مشق شاعر کی عملی تصویر ملاحظہ فرمائیے۔ بال سپید ہیں، منہ میں ایک دانت نہیں، کمر خمیدہ، چہرے پر جھرّیاں پڑی ہوئی، مسہل رہا ہے۔ ہاتھ کے ساتھ قرطاسِ غزل لرز رہا ہے۔ اس عالمِ دعمیں مطلع عرض کیا جاتا ہے ؎

شبِ وصال جو گھر میں رقیب آ بیٹھے ہم اُن کے پاؤں دبانے قریب آ بیٹھے

مشاعرہ واہ واہ اور قہقہوں سے گونج رہا ہے۔ "پھر ارشاد پھر ارشاد" کی سماعت خراش صدائیں چاروں طرف سے بلند ہیں۔ بزرگ شاعر کے ہاتھ آداب و سلام کے لئے مشین کی طرح حرکت کر رہے ہیں

سامعین کے سر دنکی مضحکہ خیز جنبش، اور شور بے معنی سے انھیں یقین ہو چکا ہے کہ جو مطلع پڑھا گیا وہ اردو شاعری کا ماسٹر پیس (اختراع فائقہ) ہے۔ اس لئے بار بار پڑھے جا رہے ہیں، نہ زبان تھکتی ہے، نہ ہاتھ رکتے ہیں۔ خدا خدا کر کے محفل میں سکوت ہوتا ہے اور کہنہ مشقی کا تعرف یہ شعر کھلواتا ہے ؎

جسے کہیں نہ ملیں ٹھوکریں زمانے میں تمہارے کوچے میں وہ بدنصیب آ بیٹھے

اس شعر پر جو حقیقت میں متین اور پُر لطف شعر ہے، صرف "خوب خوب" کی دو چار آوازیں کسی سمت غلط سے آکر فضا میں کھو جاتی ہیں۔ ہمارے شاعر بزرگ کو یہ طرز عمل ناگوار ہوتا ہے، وہ اپنے اس شعر کو غزل کا بدترین شعر سمجھ کر دو بار بھی نہیں پڑھتا اور اسی قسم کے دو تین شعر چھوڑ کر کہتا ہے یہ تعر سنئے انشاء اللہ آپ بہت محظوظ ہوں گے۔

میں کیا بتاؤں مرا حال کیا ہوا شب وصل وہ بن سنور کے جو میرے قریب آ بیٹھے

شاعرے پر پھر عالم وجد و رقص طاری ہو گیا۔ "پھر پڑھئے، پھر پڑھئے" کی صدائیں آنے لگیں لفظ "حال" "بن سنور" "کیا بتاؤں" اور "قریب" پر خصوصیت سے داد دی جانے لگی۔ اب شاعر اچھی طرح سمجھ گیا کہ شاعروں کے شعر کا معیار کیا ہونا چاہئے۔ معزز حضرات! یہ ہے ہماری اردو شاعری کی قدر و قیمت، اور یہ ہے سامعین شاعرہ کا ذوق و ذہنیت، جب عوام کا مذاق اتنا غلیظ اور شاعری کا معیار اس قدر رکیک ہو تو کون کہہ سکتا ہے کہ اردو شاعری اپنی حقیقی منزل پر پہونچ چکی ہے یا پہونچنے والی ہے؟۔

کسی بھرے شاعرے میں یہ مطلع پڑھ دیجئے، ؎

سمجھے گا اس کا درد کون شورش کائنات میں تو نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں

دو چار سر کہیں ملتے ہوئے نظر آجائیں تو ممکن ہے ورنہ انشاء اللہ تمام شاعرے پر موت طاری ہو جائے گی۔ معلوم ہوا کہ ہماری شاعری کو پستی کی طرف دعوت دینے والا عوام کا مذاق بھی ہے جس طرح سخنور بہت کم ہیں، اسی طرح سخن فہم و سخن شناس افراد کا بھی قحط ہے۔ اور جب ملک کی ادبی فضا کا یہ حال ہے تو مشاعروں کا انعقاد ایک ایسے ڈرامے سے زیادہ وقیع نہیں سمجھا جا سکتا

جس کا حصّہ فائق "مزاح" پر اور کمتر حصّہ نشاط پر مشتمل ہو۔

موجودہ شاعری کے نمونے

موجودہ عام اردو شاعری کا رنگ مندرجہ ذیل اشعار سے بہ تمام و کمال واضح ہوتا ہے۔ یہ اشعار وہ ہیں جو ۱۹۳۳ء میں کسی بزمِ ادب کے سالانہ اجلاس میں پڑھے گئے ہیں اور بطورِ انتخاب فخر و مباہات کے ساتھ شائع کئے گئے ہیں۔ ان اشعار پر مشاعرے گونج چکے ہیں اور یہی وہ اشعار ہیں جن پر ادبی انجمنوں کے سالانہ شاعروں یا جلسوں کی کامیابی کا انحصار ہے:۔

جوانی دیکھئے کیا گل کھلائے گی جوبن میں
کمی بیشی نہیں جس میں وہ حسنِ لایزالی ہے
کہاں اے آفتاب ایسی ضیا خورشید نے پائی
پھٹا پڑتا ہے جوبن یار کا جوشِ جوانی سے
ہوئے گل سُرخ غصّے سے جو دیکھا گل سے عارض کو
کسی دن اختلاطِ غیر دیکھو رنگ لائے گا
جواں ہو کر خدا جانے کرو گے حشر کیا برپا
الٰہی برق پھر گردوں پہ چمکے اور مزہ آئے
غضب ہے آج ڈاکہ پڑ رہا ہے جس کے گلشن میں
ستاتی ہے، رُلاتی ہے، جلاتی ہے مٹاتی ہے
نشیلی آنکھ، متوالی ادائیں، چلبلی چتون
لگا دے تھیگلی چاک گریباں سارے دامن میں
قیامت کیوں بپا کرتا ہے تو بیتاب کی جاں پر
یہاں تو رات کٹتی ہے ہماری آہ و شیون میں
نہ کرنا تھا مجھے عشق اُس صنم کی زلفِ پیچاں کا
کسی کی سادگی بھی اک قیامت ہے لڑکپن میں
ہزاروں سال گذرے، اور نہ آیا فرق جوبن میں
جو ہے اُس روئے روشن میں جو ہے اُس زُلفِ شکن میں
برنگِ گل نہیں پھولا سماتا جامۂ تن میں
مری جاں تو نے آتے ہی لگا دی آگ گلشن میں
نہیں اچھا مری جاں روز جانا بزمِ دشمن میں
قیامت کا نمونہ ہو مری جاں تم لڑکپن میں
کہ ڈر کر وہ صنم پھر ہاتھ ڈالے میری گردن میں
وہ بلبلِ آف بھی کر سکتی نہیں بیٹھی نشیمن میں
عجب انداز کا جادو ہے ظالم تیری چتون میں
یہ دیکھی ہے نرالی بات اُس کافر کے جوبن میں
جنوں نے آگا پیچھا کچھ نہ چھوڑا میری الجھن میں
لڑکپن میں لڑکپن میں لڑکپن میں لڑکپن میں
وہاں وہ سو رہے ہیں چین سے پہلو دشمن میں
پڑا ہوں سخت اُلجھن میں پڑا ہوں سخت اُلجھن میں

جو پیش از شورِ محشر دیکھنا ہو قیامت کو — اُلٹ کر دیکھ لو رُخ سے نقاب اور پشتِ چلمن میں
ترا تیرِ نظر دل اور جگر میں جا کے دھنسا ہے — نہ یہ تیزی نہ یہ گھس بیٹھ ہے سوفارِ آہن میں
جواں ہو کر کوئی انساں پری تو ہو نہیں سکتا — مگر اٹھتی جوانی پر لگا دیتی ہے جوبن میں
نظر آتا تھا حسنِ یار چھن چھن کر غنیمت تھا — الٰہی تیلیاں اُس نے بڑھائیں اوچلمن میں

حضرات، آپ ان اشعار کو تکلیفِ سماعت سمجھ کر گھبرائیں نہیں۔ اس لئے کہ یہ اشعار بہرحال ایک بڑے وقیع مشاعرے میں پڑھے گئے ہیں۔ اور ایک ادبی انجمن کی روداد کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ اگر آپ اس مشاعرے میں شریک ہوتے تو ان اشعار کی سماعت وہاں بھی ناگزیر تھی۔ نہ صرف ناگزیر بلکہ آپ کا رسمی یا اخلاقی فرض یہ بھی تھا کہ آپ ان اشعار کے مصنفین کو داد و تحسین سے نوازیں۔ اور ہر شعر پر کم از کم دس دس بار جھومیں۔ اگر آپ کو یہ اشعار اس وقت مکروہ معلوم ہو رہے ہیں تو مشاعروں میں بھی ان کی سماعت مکروہ ہونی چاہئے۔ ان اشعار کے دُہرانے سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ جہاں آپ کو عام اردو شاعری کا رنگ معلوم ہو جائے وہاں آپ کو یہ ضرورت بھی محسوس ہونے لگے کہ ایسی شاعری کو دنیائے ادب سے قطعاً خارج کر دینا چاہئے۔ تاکہ پھر اس قسم کے اشعار کسی نوعیت سے بھی تکلیفِ سماعت نہ ہوں۔ اور ملاحظہ فرمائیے۔

میں یاد آؤں انھیں کیا، اُن کا مجھ سے دل مکدر ہے — کہ آتا ہے نظر کب عکس صورت صاف روغن میں
گھر کو چھوڑ کر چننا صدف ہے کارِ طفلانہ — خدا ہو داس دنیا پر پڑے ہوکس لڑاکن میں
بھرا تھا کیسا جادو چشمِ مستِ شوخ پُرفن میں — کہ متوالی نگاہوں نے لگا دی آگ سی تن میں
وہ گلرو آج آیا ہے گلِ عارض کے بوسے لو — مرادیں سب بر آئیں پھول چن لو آج دامن میں
تصور دل سے ہٹتا ہی نہیں اُس گال کے تل کا — تو میرا چاہتا ہے جی لگا دوں آگ خرمن میں
اِسے نوچا اُسے کاٹا ادھر دیکھا اُدھر تاکا — لگاوٹ کی ادائیں ہیں تمہارے چلبلے پن میں
متاعِ ہوش و عقل و صبر سب قربان کر دوں گا — تمہیں دیکھوں گا گر بیٹھا ہوا پہلوئے دشمن میں
یہ جوڑا آسمانی اور یہ سن اے معاذاللہ — بنائی وضع کیوں پیرِ فلک کی تم نے بچپن میں

مرا دل وہ ہے دل یارو جو مستغنی ہے دنیا سے
نہ تاکے ہے کسی گھر میں نہ جھانکے ہے وہ چلمن میں

میں اس حیرت میں بیٹھا ہوں، خدایا ماجرا کیا ہے
مرے ارمان کیونکر جا چھپے ہیں قلبِ دشمن میں

کیا پامال خاکِ قبر کو ظالم نے قدموں سے
وہ بجھا ہے مری جاں چھپ گئی ہے خاکِ مدفن میں

بڑا بیڈھب دل آیا ہے بتِ کافر پہ زاہد کا
الٰہی خیر ہو اب چل پڑی شیخ و برہمن میں

گلستاں میں بھی یہ گل رشک مجھ پر کھاتے ہیں لیکن
چبھٹ جاتے ہیں مونس میرے ہو کے خار دامن میں

سُنا ہے جب سے کوئی دید کا دیوانہ آیا ہے
نہایت شاق ہے اب بیٹھنا آ آ کے چلمن میں

نکلتا ہے مرا دم انتظارِ یار میں اب تو
بنا دینا کوئی روزن مری دیوارِ مدفن میں

پری کا آپ کو سایہ نہ ہو جائے مجھے ڈر ہے
شبِ مہتاب میں ہرگز نہ سویں آپ آنگن میں

یہ چالیس صفحات میں سے صرف ۱۸-۱۹ صفحات کا سرسری انتخاب ہے۔ قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا
یہی وہ شعرا ہیں جن سے آج ہندوستان کا گوشہ گوشہ آباد ہے اور یہی وہ اشعار ہیں جن سے شاعروں
کی ادبی محفلیں گرم ہوتی رہتی ہیں۔ اب ایک دوسرے مشاعرے کے چند اشعار سنئے، میں انشاء اللہ
بہت اختصار سے کام لوں گا۔ میرا مقصد اس تکلیفِ مزید سے یہ ہے کہ صرف کسی ایک مشاعرے تک
یہ لغویت محدود نہیں بلکہ ہر مشاعرے میں اردو شاعری کا یہی عام رنگ ہے۔

کیوں ستم ڈھاتے ہیں وہ مجھ کو رُلانے کے لئے
میں تو اس محفل میں ہوں ہنسنے ہنسانے کے لئے

کیا جگر میرا تمہارے تیر کے قابل نہ تھا
غیر کا دل کس لئے تاکا نشانے کے لئے

ہنستے ہو دشمن سے تم میرے جلانے کے لئے
یہ ہنسی غیروں کو ہے مجھ پر ہنسانے کے لئے

آنکھ گو ٹیڑھی رہے لیکن رہے دل میں خیال
آنکھ لڑنے کے لئے ہے دل ملانے کے لئے

عشق اے فرہاد رکھنا تھا تجھے مخفی مگر
ہاں مناتا تھا کوہکن الفت جتانے کے لئے

آئے وہ بیدار قسمت کو سُلانے کیلئے
غیر بیٹھے بزم میں مجھ کو اُٹھانے کے لئے

یہ کیا طرزِ ستم میرے جلانے کے لئے
غیر کے پہلو میں بیٹھے مسکرانے کے لئے

سر میں تیشہ مار کر فرہاد تو نے کیا کیا
خوف پیدا کر دیا سارے زمانے کے لئے

رو رہا ہوں میں ابھی پہلو سے جانا کیا ضرور
ایسی باتیں اور تم کہتے ہو جانے کے لئے

پھر گئی گھوڑے کی بھی بارہ برس کے بعد میں
سو گئے پہلو میں وہ قسمت جگانے کے لئے

بے طرح غیروں نے بھڑکایا ہے نتا ہی نہیں
سینکڑوں کیں منتیں اس کو منانے کے لئے

دب گیا[1] احسان و شرم سے میں زمیں کے اندر
آئے جب میّت کو وہ کاندھا لگانے کے لئے

آخری دیدار کی حسرت جو تھی احباب کو
منہ سے سرکایا کفن تربت جھکانے کے لئے

لیجئے میں قتل گہ میں ہو گیا سینہ سپر
کیا مجھے خنجر دکھایا تھا ڈرانے کے لئے

شوخیاں گر کم نہ رہیں، میرے ستانے کیلئے
تیغ ابرو کھینچ لو میرے مٹانے کے لئے

خود نہیں تیار ہو گز اُٹھ کے جانے کیلئے
میں ابھی اُٹھوں جو آپ مجھ کو اُٹھانے کے لئے

وصل کی شب بھی اُنھیں عذرِ حنا بندی رہا
یہ ملا اچھا بہانہ خوں بہانے کے لئے

خوب یہ سوچے شبِ وعدہ نہ آنے کے لئے
لاؤ مہندی ہی لگا بیٹھیں بہانے کے لئے

خالِ رُخ دیکھا جوان کا گیسوؤں کے جال میں
طائرِ دل پھنس گیا خود ایک دانے کے لئے

کیوں نہیں اُٹھتی گھٹا ایسے میں یا رب جھوم کر
وہ چڑھے ہیں بام پر گیسو سکھانے کے لئے

مسکراتے ہیں وہ لب ہائے مسی مالیدہ سے
آسمانی رنگ کی بجلی گرانے کے لئے

داغہائے دل سے میرے ہے جہاں میں روشنی
چاند و سورج ہیں فقط گردش دکھانے کے لئے

ہو ابھی نادان یوں سب سے نہ کھل بیٹھا کرو
دیر کیا لگتی ہے دنیا کو اُڑانے کے لئے

بدقسمتی سے نہ تو شاعر بننے کے لئے کسی لائسنس کی ضرورت ہے نہ اشعار پر کوئی محصول ہے، وہ حکومت بھی، جو عریانی و بدتہذیبی اور برہنہ تصاویر کی اشاعت کے خلاف ہے، برہنہ شاعری اور رکیک تک بندی کے لئے کوئی قانون نافذ کرنے پر آمادہ نہیں، پھر برخورداران وطن خودروی و آزادی کے ساتھ دھوتی میں پھاگ نہ کھیلیں تو کیا کریں؟

---

[1] اس مصرع کی عروضی شان دیکھئے۔

یہ تو طبقۂ ادنیٰ کا رنگِ تغزل ہے۔ طبقۂ وسطیٰ کسی قدر سنبھل کر چلتا ہے۔ گرمیٔ خیال اور شوکتِ تخیل سے کوسوں دُور رہے۔ صرف اُس کی شاعری میں رکاکت کی جگہ متانت زیادہ ہے۔ مثلاً

ہر تربتِ الٰہی کون ہے مصروف شیون میں ہوئی جاتی ہے میری روح کیوں بے چین مدفن میں
کبھی میں منفعل ہو کر جو رویا اپنی عصیاں پر گرے اشکِ ندامت پھول بن کر میرے دامن میں
الٰہی بعدِ مردن بھی وہ ہی ایذا رہی باقی کسی کی یاد اب بھی چٹکیاں لیتی ہے مدفن میں
مری بربادیاں ہیں قابلِ صد رحم گلشن میں نہ کوئی پرسہ ہے بازو میں نہ تنکا ہے نشیمن میں
ابھی کچھ کام باقی رہ گیا ہے دستِ وحشت کا ابھی کچھ فاصلہ سا دیکھتا ہوں جیب و دامن میں
پسِ مردن محبت سے پڑے ہیں ہاتھ گردن میں اُترنے ہی نہیں دیتے مرا لاشہ وہ مدفن میں

یا دوسرے شاعر کے یہ اشعار:

برقِ حسنِ یار ہے صبر آزمانے کے لئے عشق کا بیتاب دل مضطر ہے آنے کے لئے
آسماں بیتاب ہے بجلی گرانے کے لئے یا خدا میں کیا کروں اب آشیانے کے لئے
طائرِ دل بن نہ تنکے آشیانے کے لئے آسماں تیار ہے بجلی گرانے کے لئے
میں سمجھتا تھا کہ غم میرے لئے مخصوص ہے وقف وہ بھی ہو گیا سارے زمانے کے لئے
اب یہی سوجھا ہے دیدوں جانِ راہِ عشق میں چھوڑ جاؤں کچھ تو دنیا میں فسانے کے لئے
عشق کی ہستی ہی کیا ہے عشق بے چارہ غریب حسن برہم ہو تو کافی ہے زمانے کے لئے
تیرے در کو چھوڑ کر کیوں در بدر مارا پھروں سر اازل سے وقف ہے اس آستانے کے لئے

طبقۂ وسطیٰ کے اسلوبِ شاعری سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس میں جوبن۔ گلرو۔ گلرخ۔ پہلوئے غیر۔ آغوشِ رقیب۔ تیغِ ابرو۔ غدرِ خانہ جنگی، مسی مالیدہ ہونٹھ۔ مکّل عارض اور اُس کے بوسے، خال و رخسار پری کا سایہ۔ تاک جھانک۔ بچپن، آسمانی جوڑا، اچکن، ضم، اور میری جان کا جھگڑا نہیں رہا اور اسی لئے خیالات بجدِ کافی سنجیدہ ہو گئے ہیں۔ شاعری کا اسلوب بھی ایک حد تک غنیمت ہے۔ اس کے بعد طبقۂ اولیٰ ہے۔ اس طبقے میں ندرتِ خیال کے ساتھ جذبات آفرینی اور اسلوبِ بیاں

کی متانت بحدِ نمایاں پائی جاتی ہے۔ مثلاً۔

یہ کیسی جلوہ افروزی تھی یارب دشتِ ایمن میں
تڑپ باقی ہے جسکی آج تک موسیٰ کے مدفن میں

خودی میری کسی بیخود کے جلووں کا ہے آئینہ
نہ یہ میرا نشیمن ہے نہ میں ہوں اس نشیمن میں

ہماری خانہ ویرانی کی یوں تکمیل ہو جاتی
تڑپتی لوٹتی کچھ بجلیاں ہوتیں نشیمن میں

بنائے لاکھ گلشن اے جنوں مشقِ تصور نے
کھچ آئی کائناتِ حسن سب صحرا کے دامن میں

اُسے شاید مری دیوانگی کی یاد آئی ہے
ابھی ہلکی سی جنبش تھی مرے ذراتِ مدفن میں

دوسرے شاعر کے یہ شعر بھی اسی معیار کے ہیں۔

دل کو یوں آمادہ کیجے غم اُٹھانے کے لئے
زندگی اک درس بن جائے زمانے کے لئے

غرقِ غم ہو جا، اگر ہے خواہشِ عرفانِ غم
ہوش کھو دینا ہے لازم ہوش آنے کے لئے

حسن کے ہاتھوں سے تکمیلِ فنا ہوتے تو دو
بجلیاں لائیں گی تنکے آشیانے کے لئے

راہِ غم میں ہر قدم پر ہے تصائب کا ہجوم
دل کہیں پنہاں قوتوں کو آزمانے کے لئے

عشق کیا ہے اُن کے دیوانوں کی سعیِ بے پناہ
کُل جہاں والوں کو اک مرکز پہ لانے کے لئے

کیا بادہ، کیسی مستی، کیا لطفِ مے کشی
ہم تو پیتے ہیں اُنھیں ساقی بنانے کے لئے

بے اسیری حریتِ راحت فزا ہوتی نہیں
ہے قفس کی بھی ضرورت آشیانے کے لئے

ہے نمود و نیستی کی کشمکش کا نام زیست
زندگی ہے زندگی کا بار اُٹھانے کے لئے

آپ پر واضح ہو گیا ہوگا کہ طبقۂ ادنیٰ نہ صرف رکاکت و ابتذال کی اشاعت کا خوگر ہے بلکہ اس میں ترقی و ترفع کے آثار تک نہیں پائے جاتے۔ ایسے اشعار کہنے والوں کو لحاظِ عمر و مشق مبتدی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کم علمی، کم سوادی، اور فقدانِ شوق کی وجہ سے ان کی ترقی کی راہیں مسدود ہیں۔ یہ لوگ رسماً شعر کہہ کر اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا میں ایسے حضرات سے باادب عرض کروں گا کہ وہ اس فعلِ بے کار سے باز آجائیں اور کوئی ایسا دوسرا کام اختیار کریں جس سے اُنھیں اور ملک کو فائدہ پہونچے۔ شاعری اُن کے اس طرزِ عمل سے بدنام ہو رہی ہے۔ اور

ناموسِ ادب کو نقصان پہونچ رہا ہے۔

طبقۂ وسطیٰ میں ترقی کے تمام آثار موجود ہیں۔ اس طبقے کو حزم و احتیاط کے ساتھ آگے بڑھنا چاہئے آگے بڑھنے کا ذریعہ کثرتِ مطالعہ اور کثرتِ مشق ہے۔ اساتذہ کی اصلاح بھی اس منزل میں رہنمائی کر سکتی ہے۔ لیکن میں نے بعض طلبائے سخن کو دیکھا ہے کہ وہ اصلاح پر زیادہ غور نہیں کرتے اور اکثر اصلاح دینے والوں کے بھروسے پر محنت اور فکر سے شعر بھی نہیں کہتے۔ یہ خوئے اتکا بہت غلط ہے شعر ایسا کہنا چاہئے جسمیں ضرورتِ اصلاح بہت کم ہو۔ وہ اساتذہ جو کشادہ دلی اور غایتِ التفات سے اپنے شاگردوں کی غزلیں بناتے نہیں بلکہ تصنیف کرتے ہیں حقیقت میں کچھ اچھا نہیں کرتے۔ اس طرح طلبا میں غور و فکر کی قوت پیدا نہیں ہوتی اور وہ عمر بھر محتاجِ اصلاح رہتے ہیں۔

طبقۂ اولیٰ کے تعلق مجھے کچھ کہنا نہیں — انکی شاعری اور شاعروں میں شرکت ادبِ اردو پر ایک قسم کا احسان ہے۔ اور انھیں کی جنبشِ قلم پر اساسِ شاعری قائم ہے۔

عصرِ حاضر سے عصرِ قدیم کا موازنہ ارتقائی ادبِ اردو کی رفتار کا آثار ہمیں صاف بتا رہی ہے کہ اردو شاعری کی ترقیع و ترقی کے لئے ہمیں میر و غالب کے اسلوبِ شاعری کی طرف لوٹنا ناگزیر ہے۔ یہ بات تعجب خیز اور حیرت ناک ہے کہ آج اردو شاعری کی جو ارتقائی صورت ہمارے پیشِ نظر ہے۔ وہ میر و غالب کی شاعری میں پہلے سے موجود ہے۔ یہ حضرات اپنے عہد میں مستقبل کے شاعر تھے۔ اور شاعر وہی ہے جو مستقبل کو ملحوظِ نگاہ رکھے۔ میر اور غالب اپنے دور میں تنہا نہ تھے۔ سینکڑوں شاعر اُن کے زمانے میں بھی تھے۔ لیکن سب کو زندگی نہ مل سکی۔ کچھ لوگ دس سال اور کچھ بیس سال کے بعد بھلا دئے گئے۔ اب نہ انکا کلام باقی ہے نہ انکا نام باقی ہے۔ یہی حال شعرائے یورپ کا بھی ہے۔ اگر حکومت کی حمایت اور احساس و طبیعت اسکولوں اور کالجوں کے روایتی اسباق میں یورپ کے شعرا کا نام نہ دہراتی رہے تو انکی زندگی مختل ہو جائے ہندوستان کا شاعر صرف اپنی ذہنی قوت اور قدرتِ کلام کے سہارے زندہ رہ سکتا ہے۔ ورنہ ہندوستان یورپ کی طرح اپنے مرحوم شعرا کو پروپگنڈے کے سالے سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔

میر ۱۱۲۵ھ ہجری میں خاکِ آگرہ سے پیدا ہوئے۔ جسے آج ۲۲۰ برس گذر چکے ہیں۔ اُن کی نشوونما اور ابتدائی عمر کا حصّہ وافر نظر انداز کر دیجئے تو بارہویں صدی ہجری کے نصف باقی میں انکی شاعری درجۂ کمال پر پہونچ چکی تھی۔ اس زمانے میں میر کا رنگِ تغزل یہ تھا۔

کیا میں بھی پریشانیٔ خاطر سے قریں تھا — آنکھیں تو کہیں تھیں، دلِ غمدیدہ کہیں تھا
آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لئے لیکن — ہونٹوں پہ مرے جب نفسِ بازپسیں تھا

رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری — نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری
برنگِ صوتِ جرس تجھ سے دور ہوں تنہا — خبر نہیں ہے تجھے آہ، کارواں میری

اُردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کا یہ رنگ اُن کے بعد زیادہ عرصے تک اُردو شاعری نے قبول نہیں کیا۔ نواب شجاع الدولہ کے عہدِ حکومت سے نواب سعادت علی خاں کے عہد تک لکھنؤ میں اسی رنگ کی پرستش تھی۔ اور دہلی کے شعرا بھی اسی رنگ کو برتر و بہتر سمجھتے تھے۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا کہ دہلی اُجڑ کر اہلِ فن سے خالی ہوگئی، اور کاروانِ شعر و ادب بھی وہاں سے لکھنؤ پہونچ گیا۔ تمدن اور معاشرت میں کچھ تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ لکھنؤ والوں نے تکلف و تصنع کے ذریعے اپنا تفوق قائم رکھنا چاہا۔ جب تمدن اور معاشرت میں تکلف و تصنع باریاب ہوگیا تو شاعری بھی اس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکی۔ میر۔ سودا، مصحفی، سوز، جرأت اور انشا کے بعد دوسرے اُستاد پیدا ہوئے۔ جو نئی سوسائٹی کے سپوت اور نئے تمدن کے پروردہ تھے، ناسخ، اور اُن کے بعد خواجہ وزیر، صبا، رشک، اور امانت وغیرہ نے شاعری کا قالب بدل دیا۔ ضلع جگت، لفظی مناسبت، ملازمہ مکلف، تشبیہ، استعارہ، اور بندش شعرائے لکھنؤ کا ایک مستقل اسلوب شاعری بن گیا۔ اور اردو شاعری کی وہ اساس جو میر نے قائم کی تھی۔ تہ و بالا نظر آنے لگی۔

لیکن یہ اساس اتنی کمزور نہ تھی کہ تہ و بالا ہو جانے کے بعد منہدم بھی ہو جاتی پوری ایک صدی کے بعد آخر ۱۲۲۵ھ ہجری میں مومن و غالب نے دہلی میں رہ کر اسے سنبھالا۔ اور اس الزام کو غلط ثابت

کر دیا کہ لکھنؤ کی زبان اور شاعری دہلی والوں کے اختلاط سے بگڑی تھی۔ مرزا غالب نے اپنے نئے اور باقی رہنے والے رنگ میں نغمہ سرائی کر کے اردو شاعری کو میر کی شاعری سے ملا دیا۔ مرزا کا تمام دیوان اسی رنگ سے لبریز ہے ؎

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے — صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے
ڈھونڈے ہے اس مغنیِ آتش نفس کو جی — جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

مرزا غالب کے بعد پھر ایک دورِ انحطاط شروع ہوا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ مرزا کے ہمنوا اور ہم مذاق بہت کم تھے۔ میر مجروح اور مولانا حالی نے مرزا کا رنگ قائم رکھنے کی کوشش کی۔ مگر انکا اتنا اثر و اقتدار نہ تھا کہ وہ تمام ملک کو مرزا غالب کی طرح اپنے اثرِ کلام سے مغلوب کر لیتے۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء سے ۱۹۱۲ء عیسوی تک ہندوستان میں پھر طوائف الملوکی کا دور دورہ رہا۔ جس نے جو رنگ چاہا اپنے لئے پسند کر لیا۔ لیکن عین اُسی زمانے میں مغربی تعلیم اور مغربی تمدن نے ہندوستان پر غلبہ پا لیا۔ مغربی شاعری کے ساتھ ساتھ صحیح تنقیدی اصول اور فطری جذبات جو تعلیم ہو گئے۔ اس لئے میر کے بعد جس رنگ کی مرزا غالب نے ایک صدی گذرنے پر تجدید کی تھی، مرزا غالب کی وفات کے صرف ۴۳-۴۴ برس کے بعد ہی اُسکی پھر تجدید ہو گئی۔ مثلاً

ذرّہ ذرّہ تربتِ فانی کا ثیون جوش ہے — اس صفِ ماتم میں اک شمع لحد خاموش ہے
پھیر لے میت کی جانب سے نگاہِ التفات — یکدو دن تنکوں کے نرغے میں لبِ خاموش ہے

دل اور تہیۂ ترکِ خیالِ یار کرے — کسے یقین ہو کون اس پہ اعتبار کرے
شبِ وصال ہے کوتاہ، نازِ یار دراز — ہجومِ شوق سے کہہ دو کہ انتظار کرے
گذر چکی ہے تمنا کی حد سے دشواری — کہاں تک اور ترا کوئی انتظار کرے

فی الحقیقت یہی رنگ تغزل کے لئے ایک صحیح، متین، اور پاکیزہ رنگ ہے جس میں میر کا سوز، غالب کی شوکت اور مرزا داغ کی سلاست بیک وقت موجود ہے۔ موجودہ دور میں منطق، فلسفہ

تنقید، اور علم کلام کی ممارست زیادہ ہے اس لئے اب یہ اندیشہ نہیں کہ یہ رنگِ تغزل پہلے کی طرح فنا ہو جائے گا۔

یوپی، اردو شاعری اور اردو زبان کا مرکز ہے، اس لئے لکھنؤ، دہلی اور آگرہ اسکول کو متحد ہو کر اُن بے عنوانیوں کو روک دینا چاہئے جو اردو شاعری کے لئے روا کئے ہیں۔ اس کی بہترین تدبیر صرف یہ ہے کہ عام شاعری اور شاعروں کا اسلوب بدل دیا جائے۔ اِدھر شعرِ بلند، سنجیدہ، اور پاکیزہ جذبات کا حامل ہو اُدھر شاعروں کی مخلوق منتخب ہو۔

نظم گوئی کا رواج میں نے اردو شاعری پر تنقید کرتے ہوئے۔ اردو نظم کے متعلق کچھ نہیں کہا، نظم اردو شاعری کا ایک جزو لاینفک ہے مگر نظم اپنی موجودہ صورت و ہیئت کے اعتبار سے اسی دور کی پیداوار ہے۔ اور مذاق و رنگ جدید نے خیر سے اس پر قدامت و تقلید کا تاریک پردہ نہیں ڈالا ہے۔ پنجاب کے تمام شعرا نظم گوئی کی طرف کمال توجہ سے مائل ہیں۔ اور آج اُن کی نظمیں ادب اردو کا شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن یوپی میں ہنوز نظم گوئی کا رواج عام نہیں ـــــ اتنے بڑے صوبے میں، شعرا کی اس کثرت کے باوجود صرف چار چھ شاعر ایسے ملیں گے۔ جو نظم کہتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں۔ نظم، غزل گوئی سے زیادہ ضروری اور بہتر صنفِ کلام ہے۔ اس میں کسی ایک موضوع پر وضاحت و تصریح کے ساتھ اظہارِ خیال کیا جا سکتا ہے۔ نظم کی ترویج کے لئے مناظموں کا انعقاد، مشاعروں سے زیادہ ضروری ہے۔ یوپی کی ادبی انجمنوں کو مناظموں کی ترویج کا زیادہ خیال رکھنا چاہئے۔

میرا خیال ہے کہ اگر مناظموں سے ملک کو دلچسپی پیدا ہو گئی تو مشاعرے خود بخود کم ہو جائیں گے۔ اور شاعروں کی بے جا یت سے ادب اردو کو جو نقصان ہو رہا ہے وہ افادے سے بدل جائے گا۔ فہو المقصود۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں نے اپنے مضمون میں یورپ اور ہندوستان کے شعرا، ادبا کے اقوال اور اُنکی تصانیف کے اقتباسات سے مطلق کام نہیں لیا ـــــ جو اس زمانے کے مقررین یا مصنفین کی رسمِ انشا ہے۔ میں نے ایسا دانستہ کیا ہے۔ اور منقولات اور روایات کو نظر انداز کر کے صرف واقعات و مشاہدات سے اردو شاعری پر تنقید کی ہے۔

گیارہواں خطبہ

ہندوستانی یونیورسٹیاں اور ادبِ اردو

مشاعرۂ انجمن ترقی اردو سینٹ جانس کالج آگرہ

۹ - فروری ۱۹۳۴ء

اردو زبان کی عالمگیری لسانی حیثیت سے اردو زبان میں ایسا لوچ اور ایسی لچک تھی کہ آخرکار ارضِ ہند کی مشترکہ زبان بن کر رہی۔ آج کوئی درس گاہ ایسی نہیں جہاں اردو کسی نہ کسی طرح شریکِ تعلیم نہ ہو۔ یعنی اگر طلبا، یا کالج اور اسکولوں کے پروفیسر اردو کے معلم و متعلم نہیں تو بھی اردو بولنا اُن کے لئے ناگزیر ہے۔ ہندوستان کی ۱۰ بڑی یونیورسٹیوں میں کم از کم ۹ یونیورسٹیاں ایسی ہیں جہاں اردو بطور ثانوی زبان کے شریک درس ہے۔ خصوصاً یوپی اور پنجاب کی یونیورسٹیاں مجبور ہیں کہ صوبوی ضرورتوں کو ملحوظِ نگاہ رکھتے ہوئے اردو زبان کی ترویج و تعلیم کی طرف بھی متوجہ رہیں۔ دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی نے اردو زبان کو تمام علوم کی ترجمانی کا درجہ دے دیا ہے۔ اور اب وہاں پوری تعلیم اسی زبان میں ہوتی ہے۔

ہر صوبے کی یونیورسٹی صرف اسی وقت ایک کامیاب یونیورسٹی کہلائی جاسکتی ہے جب کہ وہ اپنے صوبے کی مشترک زبان میں تعلیم کا انتظام کرے۔ غیر ملکی زبانوں کی ممارست صرف لسانیات

کے ایک طالب علم کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ لیکن اساسی تعلیم اُس وقت تک سہل الحصول نہیں ہو سکتی جب تک اُسے اپنی ہی زبان میں ڈھال کر حاصل نہ کیا جائے۔

مشاعروں کی افادیت

اردو گذشتہ تین سو سال میں نہ صرف اس ملک کی مشترکہ زبان بن چکی ہے بلکہ اُس نے اپنا ادب بھی پیدا کر لیا ہے۔ اور جس طرح دوسری زبانیں اپنی ادبیات پر فخر کر سکتی ہیں اردو کو بھی بجا طور پر یہ افتخار حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کی "لنگوا فرینکا" کہلانے کی مستحق ہے۔ ادب اردو میں نثر کے علاوہ نظم کا درجہ بھی کچھ کم نہیں۔ اور مذاقِ تعلیم نگاری بہت زیادہ ہمارے مشاعروں کا مرہونِ منت ہے مشاعرے عہد اردو کی بہت قدیم یادگار ہیں۔ اور گردشِ ایام نے مشاعروں کی اہمیت و افادیت کو فی زمانہ کمزور کر دیا ہے۔ تاہم اُن کے مفید اور ضروری ہونے سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مشاعروں کا ایک افادی پہلو ہی تو ہے کہ آج علوم و فنون کی مہتم بالشان درس گاہوں میں بھی مشاعروں کا انعقاد شریک رواج ہے۔

سرزمینِ "ارضِ تاج" کی دو عظیم المرتبت درس گاہیں، سینٹ جانس کالج اور آگرہ کالج بھی مشرقی روایات کو زندہ رکھنے کے لئے "انجمن ترقی اردو" اور "بزمِ ادب" کے ذریعہ ادب اردو کی قابلِ تحسین خدمت کر رہی ہیں۔ اُن کے فاضل صدر اور لائق سکریٹری اپنی پوری توجہ سے کوشش فرما رہے ہیں۔ کہ کالجوں میں اردو ادب اور ادبیاتِ مشرق سے طلبا کو لگاؤ اور شغف پیدا ہو۔ مجھے ان درس گاہوں میں ادب اردو کا مستقبل بہت شاندار نظر آ رہا ہے۔ جو پودے آج لگائے جا رہے ہیں وہ ایک روز ضرور بار آور ہوں گے۔ اور جو باتیں آج چند نفوس کی دلچسپی تک محدود ہیں وہ آگے چل کر ایک پوری جماعت کا مطمحِ نظر بن جائیں گی۔

کالجوں کے مشاعروں اور ادبی مجالس کی اہمیت

لیکن کالجوں کے مشاعروں اور عام مشاعروں میں کوئی نوعیت مابہ الامتیاز ہونی چاہیئے۔ درس گاہیں ہماری اخلاقی و اجتماعی تہذیب کی علم ہیں۔ اور معلم کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی روایات عام روایات سے بلند رکھے۔ تعلیمی حیثیات سے ہر کالج، پرائمری اور ہائی اسکولوں سے مختلف حالات میں مختلف

امتیازات کا حامل ہوتا ہے۔ پھر کالج کے مشاعروں کو عام مشاعروں سے مرتبع کیوں نہ ہونا چاہئے؟
آج کوئی کالج ایسا نہیں جہاں ادب اردو کی بقا و احیا کے لئے ادبی مجالس اور مشاعروں کا اہتمام نہ ہوتا ہو۔ لیکن اُسی کے ساتھ کوئی ادبی مجلس اور کوئی مشاعرہ ایسا بھی نہیں ہوتا جسے ملک کی عام مجالس اور مشاعروں پر ترجیح دی جاسکے پنجاب نے اس خصوص میں اپنی بیداری اور اختصاص پسندی کا کچھ ثبوت دیا ہے۔ اور وہاں چند ادبی انجمنیں ایسی بن چکی ہیں۔ جن کی علمی کوششیں ادب اردو کی تشویق و ترویج میں معاون ہیں۔ لیکن ضرورت یہ ہے کہ تمام درس گاہوں کی وہ تمام ادبی انجمنیں جو ادب اردو کو زندہ رکھنے کے لئے قائم ہوئی ہیں اُن عام مجالس سے ممیز ہوں جنکی عنانِ انتظام شہریوں کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح کالجوں کے مشاعروں کو بھی عام مشاعروں سے نسبتاً مرتفع اور بلند ہونا چاہئے۔

طلبا اور شاعری یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب کہ عوام اور طلبا کے مذاقِ شاعری میں حدِ امتیاز قائم رہے۔ طلبا میں شاعری کا مذاق ایک مستحسن اقدام ہے لیکن طلبا کی شاعری کا عام شاعری سے متوازن ہونا۔ کوئی قابلِ مسرت بات نہیں — وہ نوجوان جو تاریخ، فلسفہ، ادب، سیاست، اور اقتصادیات کے طالب علم ہیں۔ اگر فرسودہ اور جذباتی شاعری کے عادی ہوں تو ان کی شاعری خود مذاقِ تعلیم کے لئے سبب توہین ہے میں تو زمانۂ طالب علمی میں ملک کے نوجوانوں کو شاعری سے مجتنب رکھنے کا حامی ہوں۔ لیکن وہ نوجوان، جنھیں ذوقِ شاعری فطرتاً ودیعت کیا گیا ہے باوجود ردک تھام کے شاعری سے الگ نہیں رکھے جاسکتے۔ خصوصاً اس نقطۂ خیال سے کہ شاعری تعمیرِ ذہن، اور توسیعِ معلومات کا ایک مہذب ذریعہ بھی ہے۔ اور مطالعۂ شعر، نصابِ تعلیم کا ایک جزو جمیل ہے۔ تاہم نوجوان طلبا کی شاعری اُن کے مبلغِ علم کی ہمپایہ ضرور ہونی چاہئے۔
اگر آج کالجوں کے مشاعروں کا معیار بلند کر دیا جائے۔ اور طلبا ضرورتِ زمانہ کے مطابق اپنی شاعری کا اسلوب معلوم بدل دیں تو مجھے یقین ہے کہ عام ملکی شاعری اور مشاعروں کی ہیئتِ کذائی

میں بھی ایک خوشگوار انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ طلبا کو تقلیدِ عوام کی ضرورت نہیں بلکہ مشعلِ راہ بننے کی ضرورت ہے تاکہ عوام اُن کے علمی و ادبی انکشافات سے متاثر ہو کر خرافات سے محفوظ ہو جائیں۔

اب سے کچھ پہلے معیارِ شاعری قائم کرنا ملک کے کہن سال اور دیرینہ مشق اساتذہ کا فرضِ منصبی تھا، لیکن جب سے شاعری ضروریاتِ زندگی کے دباؤ سے مغلوب ہو گئی ہے، اساتذۂ فن کی توجہ اصلاح و ارتفاعِ کلام کی طرف بہت کم ہے۔ آج ملک نوجوانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس لئے شاعری پر بھی اُن کا اقتدار و اختیار ہونا چاہیئے۔ اور وہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ نوجوان طلبا اپنے علم اور معلومات کی مدد سے شاعری میں نیا انقلاب پیدا کر دیں۔ اور اپنی نظموں اور غزلوں کا معیار اتنا بلند کر دیں کہ عام ذہنیت کو اپنی کمزوری و پستی خود بخود محسوس ہونے لگے۔

یونیورسٹیوں کی ادب اردو سے بے اعتنائی

یہ کام یونیورسٹیوں کا ہے کہ وہ کالجوں کے ادبی شعبوں کی نگرانی کریں اور ہر کالج کی ادبی مجالس کے لئے مفید لائحۂ عمل بنائیں۔ آجکل تو یہ ہو رہا ہے کہ طلبا خود ہی مجالس قائم کرتے ہیں، خود ہی مشاعروں کا اہتمام کرتے ہیں۔ خود ہی نظم و غزل کا ایک اسلوب مقرر کرتے ہیں۔ یونیورسٹیاں تو درکنار خود کالجوں کے علم دوست پروفیسر بھی اُن کے کاموں سے بہت کم دلچسپی لیتے ہیں۔ اور اپنا وقار و پندار قائم رکھنے کے لئے اکثر اس قسم کے طالب علمانہ اجتماعات سے چشم پوشی کرنا اُن کا شعار ہوتا ہے یہ طلبا کو دانستہ گمراہ کرنا ہے۔ اور رسمی مشاعروں یا مجالس کی اجازت دے کر اُن کا وقت ضائع کرنا ہے۔ اگر احیائے ادب ضروری چیز ہے تو کالجوں کے پروفیسروں اور یونیورسٹیوں کے ارباب حل و عقد کو کامل توجہ کے ساتھ طلبا کے جلسوں میں شریک ہو کر اُن کے طرزِ عمل کا محاسبہ کرنا چاہیئے اور اُنھیں بتانا چاہیئے۔ کہ وہ اس منزل میں کس طرح نمایاں اور حقیقی ترقی کر سکتے ہیں۔

میں نے خود دیکھا ہے کہ کالج کے ڈراموں میں اور دوسری تفریحی مجالس میں کالج کے پروفیسر پوری دلچسپی لیتے ہیں۔ لیکن اس نوع کی، ادبی سرگرمیوں میں شریک ہونے کے لئے اُنھیں وقت نہ ہونے اور عدیم الفرصت ہونے کی ہمیشہ شکایت رہتی ہے۔ یہ بیگانگی اور ذہنیت کا اچھوت پن

معلّمانہ دیانت داری کے خلاف ہے۔

خصوصاً ادب اردو کی ترویج و توسیع کی طرف سے یونیورسٹیاں بہت زیادہ بے پروا ہیں۔ اور کالجوں کے اردو شعبے صرف طلبا کی زبردستی کے ممنون ہیں۔ یونیورسٹیوں کی یہ بے نیازی حامیانِ ادب اردو کے لئے ہمیشہ سبب فکر و غور رہی ہے۔ اور یہ اس وقت تک اس الزام بے نیازی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتیں جب تک اردو کے شعبوں پر اُن کی عملی توجہ کا یقین نہ ہو جائے۔

یونیورسٹیاں کیا کر سکتی ہیں؟

میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہندوستانی یونیورسٹیاں فی زمانہ ہندوستان کی مشترکہ زبان اردو اور ادب اردو کے لئے کس طرح معاون و ممد ثابت ہو سکتی ہیں۔ اور تعلیمی فضا میں انھیں جو درجۂ فائق اور منصب ممتاز حاصل ہے اس کا اثر ادب اردو کی ترویج میں کیونکر استعمال کیا جا سکتا ہے؟۔

تعلیم میں اردو کی ضرورت بحیثیت مادری زبان کے

اردو کی عالمگیری و قبولیت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تمام ہندوستان کی اگر کوئی مشترک زبان ہو سکتی ہے تو وہ اردو ہے۔ اسی نقطۂ نگاہ سے یونیورسٹیوں کا فرض ہے کہ وہ سب سے پہلے تعلیم کو ملک کی مادری زبان میں رائج کرنے کا انتظام کریں۔ اور کلکتہ یونیورسٹی یا عثمانیہ یونیورسٹی کی طرح مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے کے لئے دزیرِ تعلیم اور دوسرے ادارہ ہائے تعلیم کو برابر متوجہ کرتے رہیں یہ نہ صرف اردو کی بہترین خدمت ہوگی بلکہ فرزندانِ وطن کیساتھ بھی ایک قسم کی ہمدردی سمجھی جائے گی۔ اور وہ تعلیمی مشکلات جو غیر ملکی زبان کی تحصیل و تفہیم سے برابر عارض ہو رہی ہیں۔ دور ہو جائیں گی۔ ہمیں کسی غیر ملکی زبان کے سیکھنے میں جھجک نہیں۔ لیکن ہم غیر ملکی زبانوں کو اساس تعلیم بنانا نہیں چاہتے۔ تاریخ، سیاست، جغرافیہ، اقلیدس، منطق، اصول، ہندسہ، فلسفہ، غرضکہ سب کچھ اپنی ہی زبان میں سیکھنا چاہتے ہیں۔ جب یہ تمام علوم ہمیں اپنی مادری زبان میں سکھائے جائیں گے۔ تو ہمیں ان کے استدارک میں بے حد آسانی ہوگی۔ اور ہمارا وقت اکتسابِ علوم میں اتنا ضائع نہ ہوگا جتنا کہ آجکل ضائع ہو رہا ہے۔

ہم انگریزی زبان میں مہارت کامل حاصل کر لینے کے بعد ایک کلرک اور ایک دفتری سے زیادہ کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر ہم اپنی زبان میں متعدد علوم و فنون کا اکتساب کر لیں تو ہم اپنے ملک، حکومت، قوم، اور خود اپنے کام بھی آ سکتے ہیں۔ آج ہماری حالت یہ ہے کہ ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بھی بہ اعتبارِ قابلیت اردو فارسی کے ایک ماہر کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہماری تمام دماغی قوتیں غیر ملکی زبان کے سمجھنے اور اس کی گتھیاں سلجھانے میں صرف ہو جاتی ہیں اور ہم فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد اپنی طبعی کیفیات میں کوئی شعوری ارتقا محسوس نہیں کر سکتے۔

ان مشکلات کا حل صرف یہی ہے کہ تعلیم ملک کی اردی زبان میں ہو۔ اور اگر ملک کی یونیورسٹیاں متحد العمل ہو کر ہم آہنگ ہو جائیں تو اس کوشش میں کامیابی ناممکن نہیں۔

نصابِ تعلیم میں معیاری ادب کی ضرورت

اس کے بعد نصابِ تعلیم کی ناقص ترتیب ہے۔ نصابِ تعلیم آجکل صرف اُس چیز کا نام ہے جو سفارش اور رعایت کے اجزا سے مرکب ہوتی ہے جس میں طلبا کا فائدہ بہت کم، اور اضافانِ نصاب کا مفاد بہت زیادہ محفوظ رکھا جاتا ہے۔ کورس کی اکثر کتابیں جانبداری اور سفارش کی سازشوں سے تیار اور منتخب ہوتی ہیں۔ جس پر مصنف، پبلشر، اور مصنف کے احباب اپنی مُہریں ثبت کر کے سررشتۂ تعلیم کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ سررشتۂ تعلیم جو طلبا کی ضرورتوں سے نواقف ہوتا ہے۔ لیکن اس سازش سے واقف نہیں ہوتا، چند متحد آوازوں سے مرعوب ہو کر اس ناقص نصاب کو نافذ کرنے کی منظوری دیدیتا ہے لیکن جب وہ نصاب طلبا کے سامنے آتا ہے تو عموماً اُنکی فطری و اخلاقی تربیت کے لئے اسمیں کوئی زندگی نہیں ہوتی اردو کی جو کتابیں نصابِ تعلیم میں آج داخل ہیں اُن میں بیشتر ایسی ہیں جو کسی طرح ادبی معیار پر صحیح نہیں اُترتیں، یہ فرض یونیورسٹیوں کا ہے کہ وہ اپنے اثر و ذرائع سے ان کتابوں پر تنقید و تبصرہ کا انتظام کریں اور جو کتابیں صحیح معیارِ ادب پیش نہ کر سکیں اُنھیں کالج کی چار دیواری سے باہر پھکوا دیں

اُدبائے اردو کی ہمت افزائی

یونیورسٹیوں کا فرض یہ ہے کہ اپنے رسوخ و اثر سے ملک کے اُدبا کو تدوینِ نصاب کی دعوت دیں اور اُن کی حوصلہ افزائی کریں۔

تاکہ طلبا کی عمر، ذہن، اور درجۂ تعلیم محفوظ نظر رکھ کر اُن کے لئے ایسی کتابیں تصنیف کی جائیں جو موجودہ اجتماعی ضروریات پر حاوی بھی ہوں۔ اور ادبی حیثیت سے اُنکا معیار بھی بلند ہو۔

ہمیں مغربی حکومت کے اقتدار کی اس برکت سے انکار نہیں کہ آج مذاقِ تعلیم عام ہے۔ لیکن تعلیم کے ناقص ہونے سے انکار کرنا بھی ایک ضمیری گناہ ہے۔ نقصِ تعلیم نقصِ نصاب پر مبنی ہے اور نقصِ نصاب کی ذمہ دار ناقص ادارت و تصنیف ہے۔ یونیورسٹیوں کو سرشتۂ تعلیم کی وساطت سے اس اساسی غلطی کی اصلاح کرنی چاہئے۔ نقصِ تعلیم خود بخود دور ہو جائے گا۔

یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ادب اُردو کی ترقی و تعمیر میں مغربی تعلیم نے اس وقت تک کوئی محسوس حصہ نہیں لیا۔ تاہم ہندوستان علم و فن کی برکات سے کسی زمانے میں بھی محروم نہ تھا۔ آج بھی ہندوستان کی قدیم درسگاہوں اور مکاتب میں تربیت یافتہ دماغ، عہدِ موجود کی درسگاہوں کی پیداوار سے زیادہ درخشاں اور کارآمد ہیں۔ "ادبِ اُردو" چونکہ مغربی تعلیم کے ورود و نفاذ سے پہلے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے اسکی اصلاح و تہذیب بھی پُرانے دماغوں ہی سے ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اُردو تصانیف کی تدوین و ترتیب کے لئے یونیورسٹیوں کو چاہئے کہ ماہرینِ علومِ مغربی کے ساتھ کام کرنے کے لئے مشرقی اسلوب پر تعلیم یافتہ اُدبا اور فضلا کو بھی آواز دیں۔ اور اُن کے اشتراکِ عمل سے فائدہ اُٹھائیں۔

مدیرانِ نصاب کی مردہ پرستی

اُردو نصاب کی کوئی کتاب اُٹھا کر دیکھ لیجئے۔ غالب، میر، درد، حالی، ڈپٹی نذیر احمد، مومن وغیرہ کے کام اور کلام سے لبریز نظر آئے گی۔ بے شک یہ مرحوم قلمکارانِ وطن اس لحاظ سے قابلِ احترام ہیں۔ کہ اُردو کی ابتدائی مشکلات انہیں کی توجہ سے حل ہوئی ہیں۔ لیکن صرف اُن کے کارناموں کو صدیوں دُہراتے رہنا، اور زندہ مصنفین کو مستقلاً نظر انداز کر دینا، کھلی ہوئی مردہ پرستی اور نمایاں حیات دشمنی ہے۔ ہر زبان کا لٹریچر ہر دور کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اُردو کی جو صورت آج سے پچاس سال پہلے تھی۔ وہ اب نہیں رہی۔ ادبی و علمی تحقیق نے اُن فرسودہ روایات کو مسترد کر دیا ہے جو ادبِ قدیم کا طرۂ امتیاز تھیں۔ اسی طرح قدیم جذباتی، اور معاملاتی شاعری کی جگہ فلسفیانہ، اور متصوفانہ شاعری نے لے لی ہے۔ جو بات پہلے مقبول

تھی وہ آج مردود ہے۔ جو سکہ آج سے سو برس پہلے رائج تھا وہ آج ٹکسال باہر ہے۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم ۱۹۳۴ء کے نصاب اردو میں بھی ۱۸۳۴ء کے رجحانات و خیالات طلبا کے سامنے پیش کر کے انھیں ایک صدی پیچھے ڈھکیلنے کی کوشش کریں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ قدیم مصنفین و شعرا کو بالکل بھول جانا چاہئے۔ لیکن کیا ادبائے عہد حاضرہ قطعاً فراموش کر دینے کے قابل ہیں؟ اور کیا اُن کا کام اور کلام اقتضائے وقت کے مطالبق نہیں؟ پھر کیوں درسگاہوں میں صرف متقدمین کی پرستش ہوتی ہے اور عصر حاضرہ کے فضلائے ادب کیوں نظر انداز کر دئے جاتے ہیں۔ ؟ خارجی دنیائے ادب اگر ادبائے متقدم کی پرستش پیش رو ہونے کی حیثیت سے کرتی ہے تو یہ اُس کا اخلاقی فرض ہے۔ لیکن درسگاہوں کو تقلید عوام کی ضرورت نہیں۔ اُنکی نگاہوں میں ماضی نہیں مستقبل ہونا چاہئے۔ اہل قلم اگر تلاش کریں تو موجودہ نسل کے شعرا اور ادبا میں بھی اکثر زندہ نفوس ایسے مل سکتے ہیں جن کا کلام ہر آئینہ موجودہ نسلوں کے سامنے پیش کرنا مفید ہوگا۔ مردہ پرستی ہندوستان کی ایک قدیم رسم جاہلانہ ہے۔ لیکن خداوندانِ تعلیم اور حامیانِ تعلیم کو اپنا نقطۂ نظر قدامت و جہالت کی فرسودہ پستیوں سے وسیع و رفیع رکھنا چاہئے۔ اور زندہ مصنفین کو بھی ادبائے سلف کے دوش بدوش نصاب تعلیم میں جگہ دینی چاہئے۔

کالج کی لائبریریاں ادب اردو کے تحفظ کے لئے ملک کی لائبریریوں کو بھی صحیح معیار پر قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ کالج کی لائبریریاں بہ استثنائے چند مشہور اردو مصنفین کی کتابوں سے عموماً خالی ہوتی ہیں۔ انگریزی تعلیم کی برکات نے عریاں اور مہذب مغربی لٹریچر ہندوستان میں بکثرت پھیلا دیا ہے۔ انھیں کتابوں سے کالجوں کی لائبریریاں بھی آلودہ نظر آتی ہیں۔ کالجوں کی لائبریریوں میں اردو کی اگر کچھ کتابیں ملیں گی بھی تو لطائف بیربل، اور چھبیلی بھٹیاری جیسی مخرب اخلاق اور غیر مفید ہوں گی۔ اس کی ذمہ داری بھی کالجوں کے ذمہ داروں کی بے نیازی پر ہے جو اردو لائبریریوں کے لئے ایک معمولی رقم مخصوص کر دینے کے بعد نہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ لائبریرین نے کون کون سی کتابیں لائبریری کے لئے منگوائی ہیں۔ نہ انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی کالج لائبریری میں مستند اردو مصنفین کے کام کا کتنا حصہ ہے۔

کالجوں کی لائبریریوں کو بھی اپنی عظمت کے مطابق عظیم و رفیع ہونا چاہئے۔ اور اُن میں ایسا انتخاب لٹریچر مہیا کرنا چاہئے۔ جو طلبا کے لئے مفید اور علم دوست اہلِ شہر کے لئے قابلِ مطالعہ ہو۔

ہندوستان میں ہر اُس چیز کا سانچہ بنا لیا گیا ہے۔ جو تمدن، تہذیب، اور عمرانیت کی ترقی کے لئے مفید ہے۔ لیکن ان سانچوں میں ڈھلنے والے مادّے وہ نہیں ہیں جن کی ہمیں واقعی ضرورت ہے ڈھلنے والی چیز کمزور اور مواد ناقص ہے۔ تو سب سے پہلے ہم صحیح سامان اور مواد کیوں نہ پیدا کریں؟ تاکہ ہماری درس گاہیں، لائبریریاں، مشاعرے، نصاب غرضکہ ہر چیز مکمل اور مرتب ہو جائے۔

ہندوستان کا ہر تعلیمی و ادبی ادارہ بیش از بیش مفید ہو سکتا ہے۔ اگر اُسے ضرورتِ زمانہ کے مطابق مفید سامانوں سے اور مفید طرائق کار سے بدل دیا جائے۔

کالجوں کے رسالے رسمی طور پر کالجوں سے رسالے یا میگزین بھی شائع ہوتے ہیں۔ جن میں اکثر اردو، ہندی، اور انگریزی یعنی السنۂ ثلاثہ کی نمائندگی ہوتی ہے۔ لیکن میں بعض رسائل کو چھوڑ کر جو ادب اردو کی واقعی خدمت کر رہے ہیں، بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ کالجوں کے اکثر رسالے کسی حالت تک بھی طلبا یا اُن کے احباب کے لئے شفقت بخش نہیں ہوتے، اور کاغذ لکھائی، چھپائی میں جو روپیہ صرف کیا جاتا ہے اس کا معاوضہ بھی واپس نہیں آتا۔

اگر یہ طریقہ رسمی ہے۔ تو یونیورسٹیوں کو چاہئے کہ اس رسم سے کالجوں کو پاک کر دیں اور اگر رسائل کی اشاعت کا کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا ہے تو اُس نتیجے تک اُنھیں پہونچانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ایک کالج میں جتنے مضامین پڑھائے جاتے ہیں اگر اُس کالج کے میگزین میں وہ ہی مضامین بصورتِ ترجمہ شائع ہوں یا اُن پر تنقید، یا اُن پر محاکمہ، یا اُن پر شرحیں، یا اُن پر بحث و نظر کا انتظام ہو تو یہی رسالے نہ صرف طلبا کے لئے بلکہ کالج کی بیرونی فضا کے لئے بھی رحمت ہو سکتے ہیں۔ کم معیار غزلوں، ہوس انگیز نظموں، اور پھس پھسے مضامین کی اشاعت سے کالج کے رسائل کو ملک میں کوئی وقعت حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ وہ طلبا کے لئے کسی درجے میں بھی مفید ہو سکتے ہیں۔

کالجوں کے مشاعروں کا معیار کالجوں کے مشاعروں میں بھی کوئی امتیازی شان ضرور ہونی

چاہیے، اس لئے کہ ان شاعروں کی بانی و محرک تعلیمی فضا ہوتی ہے۔ شاعروں کی اصلاح کا کام درس گاہوں کے شاعروں سے بحدِ ممکن شروع ہو سکتا ہے۔ ستھری صحبت، مخصوص شعرا کا اجتماع، مظاہرۂ تہذیب، معیاری کلام، مفید موضوعات پر تقریریں، یہ چند باتیں کالجوں کے شاعروں کو ممتاز کر سکتی ہیں۔ مناظموں اور مناظروں کو پوری قوت سے کامیاب اور شاعروں سے زیادہ دلچسپ بنانا بھی کالجوں کا حق فائق ہے۔ کالجوں اور ادبی جلسوں کا لائحۂ عمل یونیورسٹیوں کو خود بنانا چاہیے۔ اور ان میں اس قسم کی حدود قائم کرنی چاہئیں، جن میں علمی و ادبی خوبو پائی جائے۔

خاتمہ میں معافی خواہ ہوں کہ میں نے اپنے عزیز دوستوں کا بہت زیادہ وقت تلخ اور غیر خوشگوار باتوں میں ضائع کر دیا۔ لیکن ان مشکلات کا اظہار جو آج ادبِ اردو پر مسلط ہیں۔ نہایت ضروری تھا۔ برسوں ایسے مواقع نہیں ملتے کہ ضروری تکلیفیں ان لوگوں کے سامنے پیش کی جائیں جو ان کی تلافی کے ذمہ دار ہیں۔ مجھے یقین نہیں کہ میری معروضات کا کوئی حصہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے گوشِ ناشنوا تک پہونچ سکے گا۔ پھر بھی خوش ہوں کہ میں نے یہ چند باتیں ایک ایسے مقام پر کھڑے ہو کر بآوازِ بلند کہہ دی ہیں۔ جو ایک نقابی یونیورسٹی سے متصل و ملحق ہے۔ اگر میری ایک گذارش بھی قابلِ پذیرائی سمجھی گئی تو میں آج کے جلسے کی عملی کامیابی تصور کروں گا۔

بارہواں خطبہ

اردو

مشاعرۂ بزمِ اردو لشکر (گوالیار)

۲۸۔ فروری ۱۹۳۴ء

چند لمحے ماضی میں

حضرات! اردو زبان کے ماضیات پر اس قدر سیر حاصل اور توضیحی بحث ہو چکی ہے کہ اب اس کا اعادہ نہ صرف غیر ضروری بلکہ تحصیلِ حاصل بھی ہے اردو کب پیدا ہوئی؟ کہاں پرورش پائی؟ اور اس کی ترویج میں مغل سلاطین و اکابر عہدِ ماضی نے کیا اور کتنا حصہ لیا؟ ان واقعات سے ہندوستان کی لائبریریاں گرانبار ہیں۔ اور ہر ادبی صحبت میں انہیں کو دہرانا اب وجہ دلچسپی نہیں رہا۔

۶۰۵ھ سے ۱۳۵۳ھ تک ساڑھے سات سو سال میں تدریجی مگر مسلسل مساعی کا نتیجہ ایک نئی زبان کی تعمیر و ترویج کے لئے جو کچھ ہونا چاہئے تھا ہوا۔ چھ سات صدیاں کسی زبان کی نشو و نما کے لئے کچھ کم نہیں ہوتیں۔ اس عرصۂ طویل کے بعد اردو آج جس منزل پر ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔

توضیحِ حال، اردو کی عامیت اور صوبجاتی گیرائی

اردو، عربی فارسی، اور بھاشا کی ایک تخلیقی ترکیب اور ترکیبی نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ زبان

بین الملکی تبادلۂ خیال میں آسانی پیدا کرنے کے لئے وضع کی گئی تھی۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت سے بہت قبل عربی اور ایرانی قبائل کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ بعثتِ اسلام سے پہلے دنیا کے دو ہی صنم خانے زیادہ عقیدت کش تھے۔ ایک صنم خانہ ہندوستان تھا۔ اور دوسرا۔ مکہ۔ معتقدات کی یکرنگی کا تقاضا تھا کہ ان دونوں صنم خانوں کے پرستار باہم ملیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی اور سنسکرت کا اختلاط دنیا میں بہت قدیم ہے۔ جب اردو کی بنیاد پڑی تو اس اختلاط نے اس کی تعمیر میں مدد دی۔ اور اردو میں عربی۔ فارسی۔ کی طرح سنسکرت اور بھاشا کے الفاظ بھی بے تحاشا شریک ہونے لگے۔ اِدھر تجارتی تبادلوں میں اردو مصطلحات کی فراوانی ہوئی۔ اُدھر سیاسی، مذہبی، اور مجلسی ہمواتوں کے لئے اردو اصطلاحیں وضع کی جانے لگیں۔ رفتہ رفتہ ہندوستان کے ہر گوشے میں اردو بولی جانے لگی۔ اور چونکہ اردو عام اجتماعی ضرورتوں کی کفیل تھی۔ اس لئے عربی، ایرانی اور سنسکرت زبانیں اپنی اپنی جگہ محفوظ رہیں مگر اردو زبان عام ہوتی چلی گئی۔

اِدھر سندھ اور پنجاب میں عربی قبائل کا قیام تھا۔ اُدھر دکن میں عربی نسلیں موجود تھے۔ یوپی تو عربی و ایرانی اقتدار کا مرکز ہی تھا۔ اردو نے چاروں سمتوں میں اپنی لہریں پھیلا دیں؛ یہ انھیں موجوں کا پھیلاؤ ہے کہ آج اردو ہر صوبے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اردو کسی خاص صوبے کی زبان ہے۔

عربی اور سنسکرت زبانیں اپنی صرف و نحو کے اعتبار سے بہت مشکل تھیں۔ فارسی زبان نے عربی زبان کی ممارست سے فائدہ اٹھایا۔ اور اردو نے فارسی سے اکتسابِ فیض کیا۔ اس لئے صرفی دشواریوں میں بتدریج آسانی پیدا ہوتی چلی گئی۔ جن زبانوں کا تعلق عہدِ عتیق سے جتنا قریبی ہے وہ اتنی ہی مشکل اور دیر فہم ہیں۔ اس حساب سے اردو چونکہ دنیا کی زبانوں میں سب سے آخری زبان تھی۔ اس لئے اسے آسان ہونا بھی چاہئے تھا۔ اردو کی عام فہمی اس کے آسان ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ آج بھی جو سیاح ممالکِ غیر سے دو چار سال کے لئے ہندوستان آتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی کوئی اور زبان سیکھ سکیں یا نہ سیکھ سکیں اردو میں انھیں بیش و کم مہارت ضرور ہو جاتی ہے۔

ہندوستان کی صوبوں تقسیم ایک سیاسی اور انتظامی حصار ہے۔ لیکن اس تقسیم سے اردو کی حد بندی نہیں ہو سکی۔ ذرائع آمد و رفت کی فراوانی اور سلسلۂ رسائل و رسائل نے تمام صوبوں کو اجتماعی حیثیت سے ایک کر دیا ہے۔ اگر ہندوستان کے تمام ڈاک خانوں کا محاسبہ کیا جائے تو مکاتیب میں زیادہ حصہ اردو مکاتیب کا نکلے گا۔ عام اس سے کہ وہ تجارتی ہوں یا ذاتی، پھر جس صوبے میں جائیے۔ اردو جاننے والے دوسری زبانوں کے ماہروں سے زیادہ ملیں گے۔ اور وہ لوگ بھی جنھیں اپنے اداروں میں صرف انگریزی یا کسی اور زبان سے کام پڑتا ہے اردو میں گفتگو کرنے پر مجبور نظر آئیں گے۔

اردو کس کی زبان ہے؟

گذشتہ بیس سال میں ایک غلط دور ایسا بھی آگیا تھا کہ مسلمان اردو پر حق مالکانہ قائم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ کوئی زبان کسی خاص قوم کیلئے کبھی نہیں بنتی بلکہ تمام ملک کیلئے بنتی ہے۔ اسی لئے کہ اولیات اردو کی پرداخت مغل سلاطین کے عہد میں ہوئی۔ لیکن اردو کی ترویج و استعمال میں حصہ گیر کسی زمانے میں بھی صرف مسلمان نہ تھے بلکہ ہندو، ایرانی، عربی، ترکی اور تمام دوسرے ممالک کے رہنے والے جو اس وقت ہندوستان میں تھے۔ اردو زبان کے استعمال میں بطور مساوی سہیم و شریک تھے۔ فارسی حکومت کی زبان تھی لیکن رعیت کی زبان اردو تھی، لشکر کی زبان اردو تھی۔ تاجروں کی زبان اردو تھی، شاعروں کی زبان اردو تھی جن میں ہر قوم، ہر ملک، اور ہر مذہب کے آدمی ہوتے تھے۔ اس لئے کسی طرح بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ایک قوم کی زبان ہے۔ واضعانِ زبان نے وقتی مناسبت سے اس کا نام "اردو" رکھ دیا۔ جو خود ایک غیر زبان کا لفظ ہے۔ ورنہ اس کا صحیح اور حقیقی نام "ہندوستانی" ہونا چاہئے تھا۔ اردو فی الحقیقت ہندوستانی زبان ہے جو آج ہندوستان کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

اردو ہندی کے غیر ضروری مباحث و مسائل کے سلسلے میں اصابت رائے نے مدت ہوئی یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے۔ میں اس اردو ہندی کے مسئلے سے بہت خائف ہوں اس لئے کہ اس قسم کا مقابلہ اور مجادلہ ملک کی زبانوں کو کمزور کر دینے کا خطرہ پیدا کرتا ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ اردو کا نام "ہندوستانی" رکھ کر اس لسانی نزاع کو قطعاً ختم کر دیا جائے۔

مسلمانوں کی زبان اگر کوئی ہے یا ہو سکتی ہے تو وہ عربی ہے۔ اس لئے کہ مسلمان حجازی النسل ہیں یا اس کے بعد انھیں فارسی نژاد کہہ لیجئے۔ یہ اُنکی ذہنی تربیت کا ایک مظاہرہ اور ضرورتِ وقت کا اقتضا تھا کہ ہندوستان میں ان کے ورود سے ایک نئی زبان رائج ہو گئی۔ اور یہ اس زبان کی فطری خصوصیت تھی کہ وہ تمام ملک میں مقبول و مروج ہو گئی۔ مسلمانوں کی یہ غلافی اس سے زیادہ صلۂ کار کیا چاہتی ہے کہ جس زبان کی انھوں نے داغ بیل ڈالی تھی وہ مشترکہ کوششوں سے تمام ملک کی مشترکہ زبان بن چکی ہے۔ اس سے زیادہ ادعائے تفوق ایک سیاسی غلط اندیشی اور ایک اجتماعی گناہ ہے۔

اردو زبان کے خصائص ہر وہ نئی چیز جو ضرورتِ زمانہ کے مطابق کسی صناع یا موجد کے ذہن سے تخلیق پاتی ہے۔ موخر ہونے کے لحاظ سے اختراعِ فائقہ کہلانے کی مستحق ہو جاتی ہے۔ آپ ترقی کے جس تنبے پر نگاہ ڈالیں گے اس کی مثالیں آپ کو ملتی چلی جائیں گی۔ جو سکے اب سے ایک صدی پہلے مقبول تھے وہ آج متروک ہیں۔ اور اُن کی جگہ دوسرے نقوش سکوک نے لے لی ہے۔ جو طریقۂ تعلیم اب سے پچاس سال پہلے مکمل معلوم ہوتا تھا وہ آج اسکولوں اور کالجوں کی حدود سے نکال دیا گیا ہے۔ اور موجودہ طریقۂ تعلیم قابلِ اطمینان نہ سہی قابلِ ترویج ضرور تسلیم کر لیا گیا ہے یہی حال اردو زبان کا ہے۔ جو دنیا کی بہت سی زبانوں کے بعد بنی اور اُن سب سے آسان و دلنشیں ثابت ہوئی۔ اردو کی دلپذیر انشا، آسان املا، اختصار نویسی، اور سریع الفہمی سے کون انکار کر سکتا ہے؟۔ اردو میں وہ تمام خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ جو ایک ہمہ گیر زبان میں ہونی چاہئیں۔ ہر زبان میں لہجے اور طرزِ ادا کا ایک خاص اسلوب ہے۔ مگر اردو کی طرزِ ادا سب سے زیادہ غدوبت و دلنشینی کی حامل ہے اس کا ایک لفظ "نہیں" اتنی اداؤں کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے کہ کہیں نفی کہیں اثبات، کہیں انکار اور کہیں اقرار کی متضاد کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ الفاظ کی کثرت، مرادفات کی فراوانی، تشبیہات اور ضائع بدائع کی زیادتی، محاکات کی وسعت، اشارات و کنایات کی ارزانی سے اردو زبان میں تقریر و تحریر کی بیش از بیش آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

اردو املا اور انشا اردو کے حروفِ تہجی عربی اور فارسی زبانوں کے حروفِ تہجی پر

شامل ہیں۔ اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کی ہیئتِ ترکیبی میں عربی و فارسی زبانوں کو زیادہ دخل ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ ہندی بھاشا کی صرفی خصوصیات بھی اردو کے قاعدۂ تلفظ میں خود بخود آجاتی ہیں۔ اردو، عربی اور فارسی کی طرح سیدھی طرف سے لکھی جاتی ہے۔ اور الفاظ کی کشش اور دوائر میں یہ عربی سے کم اور فارسی سے بالکل ملتی جلتی ہے۔ لیکن انشائے اردو میں بھاشا کے وہ تمام الفاظ کم و بیش سموئے ہوئے ہیں جو اس زبان کا طرۂ امتیاز ہیں۔ بھاشا کے ہزاروں الفاظ آج بے تکلف اردو میں لکھے اور بولے جاتے ہیں۔ بنا بریں یہ امتیازی خصوصیت اردو ہی میں پائی جاتی ہے کہ وہ بیک وقت عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کا مجموعہ ہے۔ اردو یہ اسکی صلاحیتِ انجذاب ہے کہ اس نے ابھی نصف صدی سے کچھ ہی زیادہ مدت مغربی حکومت کے اقتدار میں بسر کی ہے لیکن مغربی لغت کے سینکڑوں الفاظ ہضم ہو کر اردو میں ایسے سما گئے ہیں کہ گویا وہ اسی کے الفاظ تھے۔ اور پھر یہ نئے الفاظ کچھ اس طرح شریک زبان ہو گئے ہیں کہ ہندوستان کا ہر اردو داں بچہ بغیر تکلف انھیں صحیح مفہوم کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ مثلاً۔ بٹن۔ گلاس۔ کاپی۔ پینسل نکٹ۔ پن۔ ہینڈل۔ کارڈ۔ سائیکل۔ موٹر۔ پریس۔ بکس۔ سوٹ کیس۔ کوٹ۔ پتلون۔ ڈنر سوٹ کوٹ سوڈا واٹر۔ بسکٹ۔ لیمپ۔ فوٹو۔ کلینڈر۔ ریل۔ اسٹیشن وغیرہ وغیرہ۔

مصطلحاتِ اردو ہر زبان میں اصطلاحات کا خاص درجہ ہوتا ہے۔ جو اسی زبان کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔ اور دوسری زبان میں ممزوج ہو کر باوجود کثرتِ استعمال الگ نظر آتی ہیں۔ اردو کی ذاتی مصطلحات تو خیر موجود ہی ہیں مگر اردو کی یہ صلاحیت بھی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے کہ دوسری زبان کی اصطلاحوں کا جب اس میں ترجمہ کیا جاتا ہے تو وہ اردو ہی کی اصطلاحیں معلوم ہوتی ہیں۔ غیر زبانوں کی مصطلحات کا ترجمہ دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن ایک مدت طویل سے کر رہا ہے اور اس سلسلہ میں فلسفہ، سائنس اور ہندسے کی بعض مفید کتابوں کا ترجمہ دفترِ اردو میں ایک نفیس بخش اضافہ ہے۔ غیر زبانی مصطلحات کو اردو میں ڈھالنے کا کام اور بھی آسان ہو سکتا ہے اگر وضعِ اصطلاحات میں عربی فارسی الفاظ کو زیادہ دخیل نہ کیا جائے اور ترجمہ عام فہم اردو میں ہو۔ مثلاً "شارٹ کٹ" کا ترجمہ "راہچہ" بالکل درست ہے۔ لیکن "پگ ڈنڈی" جو پہلے سے اردو بھاشا میں

موجود ہے اگر اُسی کو رواج دیا جائے تو کیا بُرائی ہے۔ ہمیں اب بھی مصطلحات سے زیادہ مرادفات کی ضرورت ہے۔ جس زبان میں مرادف الفاظ جس قدر زیادہ موجود ہوں گے۔ وہ زبان اتنی ہی آسان ہو جائے گی۔ خصوصاً بہرہ ادب و شعر میں مرادفات کی بہت مانگ ہے۔

قوتِ انجذاب اُردو زبان میں قوتِ انجذاب بھی بتمام و کمال موجود ہے۔ اردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ مل جل کر بالکل اُردو معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر غیر ملکی علوم و فنون کی کتابوں کے تراجم محض اس لئے اردو میں نہیں ہوتے کہ اُنکی اصطلاحات کا ترجمہ عام فہم نہیں ہو سکتا تو ایسی مصطلحات کو اپنی اصلی صورت میں علی حالہٖ قائم رکھ کر بھی کتابوں کا ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ اور غیر زبانوں کی مصطلحات اُردو زبان میں گھل مل کر اُردو مصطلحات بن سکتی ہیں۔ کثرتِ استعمال اور توارُد اس قسم کی لفظی صعوبتی تقالتوں کو خود بخود دور کر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ حیلہ تراجم علوم و فنون کے لئے قابلِ پذیرائی نہیں کہ اُن کے مصطلحات کا ترجمہ مشکل ہے۔ یہ تو اُردو زبان کی قوتِ انجذاب سے انکار کرنا ہے حالانکہ اُردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ جذب کرنے کی قوت ایک فطری و خلقی ودیعت ہے

اُردو بحیثیت اجنبی زبان کے آج ہندوستان میں بیشتر اخبار و رسائل اُردو میں شائع ہوتے ہیں جو اخبارات کسی خاص سوسائٹی کے مقاصد و عواطف کی ترجمانی کرتے ہیں اُن کی زبان بھی اُردو ہے۔ اُن کے ایڈیٹر، اور نگراں، مجبور ہیں کہ اُردو میں اظہارِ خیال کریں صرف اس لئے کہ اخبار میں طبقے میں ۹۰ فیصدی اُردو داں اور اُردو فہم ہوتے ہیں۔ اخباروں کے علاوہ رسائل کا بھی یہی حال ہے۔ صرف صوبۂ بنگال اور صوبۂ گجرات میں بنگالی اور گجراتی اخباروں کی اکثریت پائی جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ صوبے گو بین الاقوامی اجتماعیت سے محروم نہیں تاہم بلحاظ قومیت ان میں گجراتی اور بنگالی بولنے والوں کا عنصر زیادہ ہے۔ مگر آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ان کے مراکز میں بھی اُردو اخبارات کافی موجود ہیں اور مزید اخبارات کے لئے ہنوز گنجائش باقی ہے

اُردو ملک کی مشترکہ زبان ہے۔ اس کے ثبوت میں اُن ہندو شعرا اور انشا پردازوں کے کارنامے پیش کئے جا سکتے ہیں جن کا کوئی ایک کام ہندی میں موجود نہیں۔ پنڈت دیا شنکر نسیم

رتن ناتھ سرشار، نوبت رائے نظر، سرور جہان آبادی، چکبست لکھنوی کے علاوہ لاتعداد کشمیری شعرا ایسے ہیں جن کی شہرت اور قبولیت صرف اُن کے اُردو کلام سے وابستہ ہے۔ وہ اُردو میں دیباچے لکھتے تھے۔ اور کہتے ہیں جیسا کہ ایک مسلمان شاعر کہہ سکتا ہے، اس لئے کہ "زبان" "زبان" ہے مذہب نہیں۔ جسمیں معتقدات کی کمی وزیادتی سے ادائے فرائض میں کمی محسوس ہونے لگے۔

اُردو زبان کی علمی حیثیت

حکومت نے سیاسی مصلحت کی بنا پر انگریزی زبان کو لازمی تعلیمی زبان بنا دیا۔ بہت اچھا کیا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو آج سرکاری دفاتر میں انگریزی حکومت کا کاروبار کون کرتا؟ اور یورپین زبان جاننے والوں کی کھپیں کہاں تک ہندوستان پہونچائی جاتیں؟۔ لیکن تعلیمی مشکلات کی روز افزوں فریادوں نے اب اس حقیقت کو بے حجاب کر دیا ہے کہ ملک کی اساس اور دری زبانوں پر قائم نہ ہونے سے تعلیم گراں ہوتی جارہی ہے۔ یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر، کالجوں کے پروفیسر، اور دور رائے تعلیم سب متفق علیہ ہیں کہ طلبا کی تعلیمی اساس مضبوط کرنے کے لئے غیر زبانیں غیر مناسب ہیں۔ اُردو کو اساسی حیثیت ضرور ملنی چاہئے۔ سب سے پہلے احساس عثمانیہ یونیورسٹی کے اربابِ حل وعقد کو ہوا۔ چنانچہ آج حیدرآباد کے تمام اداروں میں اُردو تعلیمی زبان ہے۔

ابھی الہ آباد میں آنریبل سر تیج بہادر سپرو! تھا بہ سے اسی مسئلے پر گفتگو تھی۔ موصوف نے فرمایا کہ اگر اُردو کو تعلیمی زبان بنا دیا جائے تو کیا اس میں علوم وفنون کے تراجم اتنے موجود ہیں کہ طلبا کو غیر زبانوں کی کتابوں سے بے نیاز کر دیں؟ میں نے عرض کیا اُردو کا خزانہ انہیں تو بہت معمور ہے۔ لیکن اگر ضرورت ہوئی تو صرف ایک سال کے عرصے میں تمام علوم وفنون کا ترجمہ اُردو میں کیا جاسکتا ہے۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، آج ہندوستان میں اُردو ادب کے اہر، فضلا اور ادبا اسقدر موجود ہیں کہ اگر تراجم وتصانیف کی خدمت اُن کے سپرد کی جائے تو دہ برسوں کا کام مہینوں میں انجام دے سکتے ہیں۔ لیکن انھیں یقین ہونا چاہئے کہ اُن کی یہ محنت فرزندانِ وطن کے لئے ہے۔ کتب فروشوں

پرلیسوں، اور لائبریریوں کی الماریوں میں مقید کردئے جانے کے لئے نہیں ہے۔

میں پھر عرض کروں گا کہ اوّل تو اردو میں فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ، ادب، سیاست، اور حساب کی مستند کتابیں پہلے ہی موجود ہیں۔ لیکن اگر اردو کو تعلیمی زبان قرار دے دیا جائے تو ایک سال کے اندر تمام علوم کی کتابیں اردو میں بہ آسانی تبدیل و تحلیل کی جاسکتی ہیں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اردو علمی زبان بھی ہے۔ اور اس میں علم و ادب کی ترجمانی کی قوتیں بھی تمامتر موجود ہیں۔

اردو کا تجارتی روپ ملک کے تمام تجارتی شعبوں میں اردو کا رواج ہمیشہ سے ہے اعداد و شمار کے لئے اس میں علامات موجود ہیں۔ پیمانوں کے نام موجود ہیں رقموں اور تعدّد کے لئے طریقۂ حساب موجود ہے۔ بہی کھاتے اردو میں بھی لکھے جاتے ہیں۔ ناپ اور تول کے اوزان اردو میں مرتب ہیں۔ تجارتی اصطلاحات سے اردو کا خزانہ خالی نہیں۔ علم الحساب اردو میں موجود ہے۔ اور کاروباری مکاتیب اردو میں برابر لکھے پڑھے جاتے ہیں۔ بازاروں اور منڈیوں میں تمام متعلقاتِ تجارت پر اردو میں تبادلۂ رائے ہوتا ہے۔ علم الاقتصاد زبانِ اردو میں منتقل ہوچکا ہے۔ عام طور پر تاجروں کی زبان اردو ہے تمام اشیا کے اسما بھی اردو میں ہیں۔ غرض کہ اردو زبان تجارت کی ضروریات کو وسیع کرتی چلی جارہی ہے۔ اور تجارت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں اردو کا پلہ بھاری نہ ہو۔

اردو اور سیاست اردو کے اہلِ قلم اور اہلِ زبان سیاست میں بحدِ کافی درک و شعور حاصل کرچکے ہیں۔ اور سیاسیات پر متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ ممتاز اردو اخبارات میں سیاست کی موشگافیوں اور ان پر بحث و نظر کا سلسلہ جاریہ کسی کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔ وکلا اور بیرسٹر جب اردو میں بحث کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے نہ گلیڈ اسٹون اور چرچل اردو بول رہے ہیں۔ بعض اوقات میں جب اردو میں تجویز و فیصلہ لکھتی ہیں تو پارلیمنٹ کے فیصلوں سے ٹکا پایۂ استحکام نہیں ہوتا۔ سیاسی لیڈر جب پلیٹ فارم پر پالیسی اور ڈپلومیسی کا فرق و امتیاز دکھاتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاست اردو زبان کی کنیز ہے اور اردو صرف سیاسی گتھیاں سلجھانے ہی کے لئے وضع ہوئی ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ ایک پردہ آغوش اردو ڈپٹی کلکٹری کی عدالت میں دوسرا اردو داں وکیل جب انگریزی میں بحث کرتے کرتے تھک جاتا ہے اور اس کی تمام محفوظ یاد داشتیں ختم ہو جاتی ہیں تو وہ اردو میں ایک ایسا فقرہ کہہ دیتا ہے جس سے عدالت متاثر اور حاضرینِ عدالت مطمئن ہو جاتے ہیں۔ سیاست جو بجائے خود ایک طلسم استعمار اور ایک چیستانِ حکومت ہے اردو کے شکنجے میں آکر اتنی سلجھ جاتی ہے کہ اس میں پالیسی کا کوئی عقدہ لاینحل باقی نہیں رہتا۔

اگر اردو میں سیاست کی تحلیل نہ ہو جاتی تو یہ سینکڑوں اردو داں خداوندانِ عدالت مغربی سیاست کو سمجھ کر اس کے مطابق دستوری و دفتری حکومت کے لئے کیونکر مفید ہو سکتے تھے؟

قانون کی تمام کتابیں اور قانونی اصطلاحات اردو میں منتقل ہو چکی ہیں۔ بعض اردو کی قانونی مصطلحات ایسی بھی ہیں جو بجنسہٖ انگریزی میں موجود ہیں اور ان کیلئے کوئی انگریزی مرادف موجود نہیں۔

اردو اخباروں کے بعض سیاسی شذرے دفتری حکومت کے اعیان و امصار کے لئے بہترین مشیر ثابت ہوتے ہیں۔ اور بعض اردو تقریریں سیاست کی گھراپوں کو اس قدر آشکارا کر دیتی ہیں کہ قانون اگر مقرر کی زبان کاٹ لینے کا فتویٰ نہیں دے سکتا تو کم سے کم زبان بندی کا حکم تو صادر کر ہی دیتا ہے۔

اردو اور شاعری

میرے خیال میں تو اردو کی ابتدا ہی شاعری سے ہوئی ہوگی۔ اور بابر نے یہ شعر ؎

مجکانہ ہوا کج ہوسِ مانک دموتی ہا فقرا ہلبغہ بس خلویہ پانی و روتی۔

کسی ہندی کبت سے متاثر ہو کر ہی لکھا ہوگا۔ صورتِ حال جو کچھ ہو اردو زبان کی تشکیل کے بعد شاعری اور اردو کا چولی دامن ایک دوسرے سے وابستہ رہا ہے اور اردو کی ترقی کیساتھ شاعری بھی ترقی کرتی رہی ہے زمانہ جن مدارج و منازل سے گذرا، اردو شاعری کو بھی انھیں سے گذرنا پڑا۔ اردو شاعری نے انبساط و طرب کی محفلیں بھی دیکھیں اور بساطِ عیش کی ویرانیاں بھی، یہی سبب ہے کہ خوشی اور غم بیک وقت اردو تغزل میں پائے جاتے ہیں۔

اردو شاعری نے یہاں تک قبولیت حاصل کر لی کہ بیدل اور نعمت خاں عالی جیسے فارسی کہنے والے

شعرا نے بھی اردو میں غزلیں کہیں۔ ہر دور میں شعرا کی تعداد بڑھتی رہی۔ اور جس زمانے میں جو محاورات اور نئی اصطلاحات اہلِ زبان نے اختراع کیں شاعری نے انھیں آنے والی نسلوں کیلئے فوراً محفوظ کر لیا۔

اردو شاعری نے وہ تمام خصائص رفتہ رفتہ جذب کر لئے جو سنسکرت، عربی اور فارسی شاعری کا فرداً فرداً سرمایۂ امتیاز تھے۔ متاخرین نے متقدمین کی تقلید کی، میر جادۂ شعر و سخن کے میر کارواں مانے گئے اور غالب فلسفۂ حیات کے پیغمبر۔ اور آخر دورِ موجودہ میں اُن کی تقلید و ہم آہنگی نے ہر شاعر کو میر و غالب بنا دیا۔

اردو کی تصنیفی قوتیں

جس طرح اردو شاعری ہر زمانے میں ترقی زبان کے دوش بدوش رہی اسی طرح ذوقِ تصنیف و تالیف بھی برابر بڑھتا رہا۔ نثر اور نظم میں مصنفین اردو نے بیش بہا جواہر اردو کے خزانے میں جمع کر دئے۔ اور موجودہ دور کو تو اگر تصنیفی دور کہدیا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ آج اردو میں مختلف موضوعات پر لاکھوں کتابیں موجود ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سب، معیاری ہیں۔ لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے مصنفین نے اپنی قوت و بساط کے مطابق انھیں مرتب کیا ہے۔ اور اُن میں فیصدی ۵ کتابیں قطعی معیارِ ادب پر صحیح اُترتی ہیں۔ ہمارے اہلِ زبان میں تصنیفی قوتیں بے انتہا موجود ہیں لیکن تصانیف کی ناقدری نے انھیں بد دل کر دیا ہے۔ آج کوئی سوسائٹی ایسی نہیں جو اردو مصنفین کے لئے حوصلہ افزا ہو۔ تاہم مصنفین کی کثرت اور اردو کی تصنیفی قوت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اردو میں تاریخ و سیرۃ نگاری

اردو میں تاریخی مواد بھی بحد کافی موجود ہے۔ تاریخ میں تحقیقی مضامین کی بھی کمی نہیں۔ بڑی بڑی ضخیم کتابیں اردو مصنفین کی موضوعات تاریخ پر دستیاب ہو سکتی ہیں۔ لیکن نصابِ تعلیم میں انگریز مورخوں کا غلبہ ہے۔ اور اردو مورخین کی آواز دبا دینے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ سیرتیں اور تذکرے جتنے اردو زبان میں مل سکتے ہیں شاید ہی کسی زبان میں مل سکیں۔ قدیم سیاحوں کے سفرنامے۔ ایران و عرب کی تاریخیں۔ شام و عراق کی تاریخیں، اور ہندِ قدیم کے حالات اردو زبان میں تفصیل و توضیح کے ساتھ محفوظ ہیں۔ اور اردو تاریخ نویسی کو

دوسری زبانوں سے زیادہ اعتبار و استناد حاصل ہے۔

اردو کا اخلاقی استحکام زبانِ اردو نے ملکی اخلاقیات پر نمایاں اثر کیا ہے اور تعمیرِ سیرۃ میں قابلِ احساس حصہ لیا ہے۔ اخلاق کی جتنی کتابیں فارسی میں تھیں اُن سب کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے۔ مجلسی و اجتماعی تہذیب میں اردو زبان کی کارفرمائی کا آج کون قائل نہیں؟ تمدن کے تحفظ میں، معاشرت کے رکھ رکھاؤ میں، اخلاق و سیرۃ کی تعمیر میں، آداب و آئین کی تشکیل میں، تقریر و گفتگو کے اسالیب میں، اردو نے وسیع الاثری سے حصہ لیا ہے۔ علم النفسیات سے بھی اردو کا دامن خالی نہیں۔ طبیعیات اور الٰہیات میں بھی اردو ایک تجربہ کار معلم کی طرح شریکِ درس ہے۔ اور تصوف کی تعلیم تو اردو کا حصۂ خاص ہی موضوع پر جتنی کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں کسی اور زبان کو نصیب نہیں ہوئیں۔ ان تصانیف کی ارزانی نے اردو دان نسلوں کی اخلاقی حالت پر بہت اچھا اثر کیا ہے۔

اردو کا مذہبی اقتدار آج حدیث و فقہ اردو میں موجود ہے۔ مشکوٰۃ و بخاری کے تراجم اردو میں ہو چکے ہیں۔ قرآن مجید کے بیسیوں ترجمے آسان اردو میں موجود ہیں۔ اسوۂ و مواعظ سے لبریز کتابیں اردو کے کتب خانوں میں پائی جاتی ہیں۔ اہم اور ضروری مواعظ کا اثر اتنا کسی اور زبان میں نہیں ہوتا جتنا اردو میں ہو سکتا ہے۔ عربی اور فارسی کے فضلا اردو میں درس دیتے ہیں۔ دینیات کی کتابیں اردو میں بکثرت ملتی ہیں۔ شریعت و طریقت کی تعلیم کا انتظام اردو میں ہے۔ دوسرے مذاہب کی مقدس کتابوں کو اردو میں منتقل کر لیا گیا ہے۔ ویدوں اور شاستروں کے ترجمے اردو میں موجود ہیں۔ مذہبی مناظرے اور مباحثے اردو میں ہوتے ہیں۔ غرض کہ مذہب کی کوئی شق کیوں نہ ہو۔ اردو بہ ہر نہج ترجمانی و تدوین میں کامیاب ہے۔

اردو کی بین الاقوامی حیثیت یہ معلوم کرنا حیرت انگیز ہے کہ ہندوستان کی کوئی قوم کیوں نہ ہو اور اُس کی مادری زبان جو کچھ ہو مگر اردو سمجھنے اور تھوڑی بہت بولنے میں قاصر نہیں۔ ایک اردو جاننے والا اپنا مقصد نہایت آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اور سننے والا سمجھ سکتا ہے۔

میں نے بعض یورپین لوگوں کو بھی انگریزی لہجے میں اردو بولتے سنا ہے۔ بلکہ بعض فوجی نوجوانوں کو بھی جو یورپ میں پیدا ہوئے۔ یورپ میں بڑھے، اور پھر یورپین فوج میں داخل ہوکر یورپین ماحول ہی میں زندگی بسر کی، ٹوٹی پھوٹی اردو بولتے سنا ہے اس کے برعکس سول محرروں سے متعلق یورپین حکام کو اردو دانستہ سکھائی جاتی ہے اور وہ اسے بڑے شوق کے ساتھ سیکھتے ہیں۔

اتحاد زبان کا یہ ایک کرشمہ ہے کہ ہر مذہب کے معتقدین اردو بولتے ہیں۔ اور بعض اوقات یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ متکلم مسلمان ہے یا عیسائی۔ یہودی ہے یا ہندو۔ ادھر مغربی تعلیم نے لباس کی مغایرت دور کر دی ہے اُدھر اتحاد زبان نے زبان کی تفریق مٹا دی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ اتحاد لسانی ہی ایک دن بین القومی اتحاد کی تمہید بننے والا ہے

اُردو کے مستقبل پر ایک نظر اس تحلیل و تجزیہ کو توضیح سے ظاہر ہو گیا کہ اردو زبان عہد موجودہ کی ایک عالمگیر، علمی، تعلیمی، تجارتی، سیاسی، ادبی، اور تاریخی مکمل زبان ہے۔

آثار و قرائن اردو کے مستقبل کو ہماری نگاہ میں بے حد درخشاں بنا دیتے ہیں۔ اور ہم اس نقطۂ نگاہ پر بہ آسانی پہونچ سکتے ہیں۔ کہ اردو مشترکہ زبان ہونے کے بعد اب بہت جلد السنۂ عالم میں روح الالسنہ بن جانے والی ہے۔

اردو کے مستقبل کو زیادہ تابناک اور مستحکم بنانے کے لئے حسب اقتضائے وقت تین چار باتوں کی اور ضرورت ہے۔

(۱) اردو کو تعلیمی اساس بنانے کی مسلسل کوشش کی جائے۔

(۲) جو علوم و فنون اردو میں ہنوز منتقل نہیں ہوئے ہیں انھیں اردو میں منتقل کر لیا جائے۔

(۳) اردو کا نستعلیق ٹائپ جلد از جلد رواج کر کے ہر پریس تک پہونچا دیا جائے۔

(۴) اردو کی اصلیت اور روایات کے تحفظ کے لئے ایک باضابطہ مجلس اردو قائم کر دی جائے۔ تاکہ اسالیب و تحاور کے تحفظ و احیا کی جانب سے اطمینان ہو جائے۔

ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی تعمیر ہوتی ہے۔ اردو کا ماضی جو کچھ ہو، حال بہرحال خوش آئند ہے۔ تعلیم جس قدر قوت حاصل کرتی جائے گی اردو زبان اُتنا ہی فروغ مزید حاصل کرسکے گی۔ خصوصاً جب اردو اساسِ تعلیم ہوگی۔ تو پھر اس میں جامعیت و اکملیت کا فقدان سلطتاً محسوس نہ ہوگا۔

اردو مناظموں کی ترویج سے نظم گوئی کو تقویت پہونچے گی۔ اور قدیم رنگِ تغزل کا دائرہ خود بخود مختصر ہوجائے گا۔ تصنیفی قوتیں اگر منظم ہوگئیں اور ان سے بہ اندازۂ قوت کام لیا گیا تو اردو مصنفین مغربی مصنفین سے کہیں زیادہ فائق و ممتاز نظر آنے لگیں گے۔

یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اردو اداروں کو وسعت دی جائے۔ اور ادبائے ملک اپنی بیگانہ وشی کی ادائیں چھوڑ دیں تو تعلیمی ماحول میں اردو کی دلچسپیاں اُن کے اشتراکِ عمل سے دوبالا ہوسکتی ہیں۔

یہ اندیشہ غلط ہے کہ اردو مٹ بھی سکتی ہے۔ کہیں کوئی زبان اس قدر ہمہ گیر اور دوست پذیر ہونے کے بعد مٹا کرتی ہے؟ زبان کی زندگی قوم و ملک کی زندگی کے ساتھ ہے۔ مگر مجھے اردو کی حیاتِ جاوداں پر اتنا بھروسہ ہے۔ کہ اگر امتدادِ ایام موجودہ قوم و ملک کو کسی طرح مٹا دینے پر قادر ہو بھی جائے اور ہندوستان کا کرۂ ارضی بالکل پلٹ جائے تو بھی اُس پر عبرت و افسوس کا جو مرثیہ پڑھا جائے گا۔ اُسکی زبان "اردو" ہوگی۔

تیرہواں خطبہ

درباری مشاعرہ منعقدہ درگاہ حضرت شاہ ولایت رحمۃ اللہ علیہ نائی منڈی آگرہ

۲-مارچ ۱۹۳۴ء

میرے بزرگو اور دوستو!

جس جلیل القدر دربار کی آستانہ بوسی ہمیشہ میرے لئے سبب فخر و مباہات رہی ہے اُس دربار کی مجلس شاعر میں آپ نے مجھے تختِ صدارت پر عزت دے کر جو افتخار عطا فرمایا ہے میں اس کا صمیم قلب سے شکر گذار ہوں۔ میں نے اس دربار میں بیسیوں مشاعرے شعرائے متقدمین اور شعرائے موجودہ کے ساتھ پڑھے ہیں۔ اسی مقدس فضا میں سخنورانِ اکبرآباد کی دل نشیں اور اثر انگیز صدائیں بارہا گونجی ہیں۔ مرزا خادم حسین رئیس اکبرآبادی، حضرت مولانا نثار اکبرآبادی، حضرت مولانا واصف اکبرآبادی، شیخ بزرگ علی عالی اکبرآبادی، مرزا اجمل حسین فلک اکبرآبادی اور میاں منظر اکبرآبادی۔ گو آج ہم میں موجود نہیں، مگر اُن کے نغمے آج بھی اس دربار کی معصوم فضاؤں میں محفوظ ہیں۔ باور فرمائیے کہ ہر درباری مشاعرے میں میں نے صاحب دربار سیدنا حضرت مخدوم علاؤ الدین مجذوب چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی روحِ مقدس کو ان نغموں اور ان الہامی نواؤں کی طرف متوجہ پایا ہے۔

حضرات، میں آج اپنے خطبے میں آپ کو یہی بتانا چاہتا ہوں کہ اس مرکزِ روحانیت یعنی "ارضِ تاج" میں کتنے مشائخ اور صوفی ایسے گذرے ہیں جو خود شاعر تھے اور جنھیں شعر و ادب سے بطورِ خاص دلچسپی تھی۔ ان حقائق کی موجودگی میں آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ اگر مشائخ و صوفیا کے وصال کے بعد اُنکی درگاہوں اور مزاروں پر مجلسِ شعر و ادب کا انعقاد ہو تو اُنکی روحیں اپنے محبوبِ حیات ذوقِ شعری کے احیا سے کیوں مسرور نہ ہونگی؟۔

اربابِ طریقت اور شاعری

میں تمہید اً پہلے یہ بتادوں کہ دنیائے تصوف کے سب سے پہلے موسس اسد اللہ الغالب حضرت علی ابنِ ابی طالب کرّم اللہ وجہہٗ بھی شاعر تھے۔ آپ کے بعض اشعار عربی زبان اور عربی تاریخِ ادب میں آجتک محفوظ ہیں۔ سیدہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی وفاتِ رسالت مآب پر ایک مرثیہ کہا تھا۔ جو اُن کے نام سے یادگار ہے آپ کی نسل سے سیّد الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام بھی شاعر تھے۔ اور اُن کی یادگار باقی طریقت و تصوف کے معلمِ اول حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شعر کہتے تھے۔ اُن کا یہ قصیدہ بہت مستجاب اور مقبول ہے۔

اِنْ نُکِبتِ یا رِیحَ الصَّبَا یوماً اِلیٰ اَرضِ الحَرَم
بَلِّغْ سَلَامِی رَوضَۃً فِیھَا اَلِیفِی المُحتَرَم

آپ کے بعد آپکی اولاد امجاد میں بھی اکثر ائمہ و مجتہدین ذوقِ شعر گوئی کے حامل تھے۔ چنانچہ شیخ عبدالقادر محی الدین جیلانی بغدادی امام سلسلۂ قادریہ کے قصائد آج بھی نہ صرف مقبول بلکہ سلسلۂ قادریہ میں شریکِ اوراد و وظائف ہیں۔

خواجہ معین الدین حسن سنجری چشتی اجمیری کا پورا فارسی دیوان مطبوعہ موجود ہے۔ مولانا جامی، خواجہ حافظ شیرازی، شیخ فریدالدین عطار، مولانائے روم، سعدی شیرازی، نظامی گنجوی، اپنے عہد کے ایسے شاعر تھے کہ اُن کا نام آج اُن کے مولد و وطن سے زیادہ ہندوستان میں زندہ ہے۔ تصوف، اور اخلاقیات میں ان شعرائے متصوفین کے کلام نے جو زندگی پیدا کر دی ہے۔ اُس کے اثرات

ہمارے طوب اور دماغوں سے کسی طرح مٹائے نہیں جا سکتے۔

اگر تاریخ عالم پر نظر ڈالی جائے تو ایسے ہزاروں نفوسِ گرامی کا نام ہمیں مل سکتا ہے۔ جن کا مشرب طریقت اور تعلیم شاعری تھی۔ میں اس وقت اس تاریخ کو دہرانا نہیں چاہتا اور صرف یہی بتانے پر اکتفا کرتا ہوں کہ خود آپ کے شہر میں کتنے مشائخ اور صوفیا ایسے آسودۂ خواب ہیں جن کی زندگی کی محفلیں ادب و شعر کے نغموں سے گونجتی تھیں مگر آج ان کے مزاروں پر کوئی بھولے سے غزلخواں بھی نہیں ہوتا۔

آگرے کے صوفی شعرا

سلسلۂ ابو العلائیہ کے بانی امیر سید ابو العلاؒ رحمۃ اللہ علیہ شاعر تھے۔ ایک رسالہ مختصر جو مسائل فنا و بقا پر مشتمل ہے آپ کی تصنیف سے موجود ہے۔ اس کے علاوہ چند مکتوبات اور ایک مختصر سا دیوان بھی آپکی یادگار ہے۔ آپ کے ذوقِ ادب و شعر کا ایک ادنیٰ مظاہرہ اس واقعے سے ہوتا ہے کہ جب آپ پر فالج گرا تو آپ باوجود علاج و تدبیر مدتوں اسکی تکلیف میں مبتلا رہے خصوصاً دونوں ہاتھ کیونکہ آپکو بیحد تکلیف ہوتی تھی ایک دن اسی حالت میں آپنے یہ بیت پڑھنی شروع کی۔

در دم از یار است و درماں نیز ہم ۔۔۔ دل فدائے او شد و جاں نیز ہم

اس شعر کے متواتر پڑھنے سے آپ پر دفعتاً حالتِ وجد طاری ہوگئی۔ اور گرمیٔ وجد سے تمام اعضا کھل گئے۔ یہاں تک کہ فالج کا کوئی اثر آپ کے جسم پر باقی نہ رہا۔ یہ ہے شعر کی روحانی قوت کا اثر، علم الطبیعات کے ماہرین کا یہ ایک متفقہ فیصلہ ہے کہ جو مرض کسی دوا سے زائل نہ ہوا سے طبعی رجحان، شعر و موسیقی سے قطعاً زائل کر سکتا ہے۔ سیدنا ابو العلاؒ کا سالِ وفات ۱۰۶۱ھ ہے۔

(۲) مولانا ابو احمد فارغیؒ نے جن کا مزار حنبا پار موضع کچھ پورہ میں مسجد ہمایوں کے ماحول میں ہے اپنی درویشی اور کمالاتِ تصوف کو ہمیشہ پردۂ شاعری میں پوشیدہ رکھا۔ آپ کی طبیعت میں ذوقِ شعری سے بذلہ سنجی اور حاضر جوابی بدرجۂ اتم پیدا ہوگئی تھی۔ آپ شیخ زین الدین معمائی کے رفیق تھے۔ اور انھیں کے ساتھ کابل سے ہندوستان آئے تھے۔ جب یہ دونوں کابل روانہ ہوئے تو اتنے مفلس تھے کہ ان کے پاس ایک کہنہ پوستین کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ شیخ زین الدین نے کہا کہ اس پوستین

کو فروخت کر کے کچھ زادِ راہ ساتھ لے لینا چاہئے۔ اور مولانا فارغی سے فرمایا کہ پوستیں کی فروخت کے وقت آپ زیادہ خوش طبعی سے کام نہ لیں۔ غرض دونوں کابل کے بازار میں پہونچے۔ ایک پوستین بھی بہت اور بدنما، بڑی مشکل سے ایک خریدار ملا۔ قیمت پر جھگڑا ہوا۔ مشتری پانچ اشرفیاں دیتا تھا۔ شیخ زین الدین زیادہ قیمت مانگتے تھے۔ مولانا فارغی سے نہ رہا گیا اور مشتری سے کہنے لگے۔ کہ "اس پارہ پارہ پوستین میں پانچ اشرفی کی تو فقط جوئیں اور لیتو ہی ہیں۔ کپڑا لغو میں ہے" یہ سنکر خریدار کا دل اور پھر گیا۔ اور سودا نہ بنا۔ آپ کا علم و فضل اور توکل عہدِ بابر کی تاریخ میں جا بجا بطور اشارہ و حوالہ موجود ہے۔ آپ کی وفات ۹۴۲ھ میں ہوئی۔

(۳) مولانا شیخ زین الدین خوافی خود بھی فن معمہ، تاریخ۔ فی البدیہہ شعر گوئی۔ اور نثر و نظم نگاری میں خاص شہرت و عزت کے حامل تھے۔ دنیائی تخلص تھا۔ آپ نے واقعاتِ بابری کا ترکی سے مروجہ وقت اردو میں ترجمہ کیا۔ ایک مدرسہ اور ایک مسجد بھی آپ کے اہتمام تعمیر ہوئی۔ یہ مسجد کچھ پورے میں اب تک موجود ہے۔ ۹۴۲ھ میں آپ نے وفات پائی۔

(۴) شفائی۔ آپ شیخ حاجی محمد حنوشائی کے مرید اور صاحب جذبہ و حال بزرگ تھے۔ عہدِ اکبری میں شہر کی گلیوں اور کوچوں میں اپنے چند تلامذہ کو ساتھ لئے اور مشک کندھے پر رکھے راستے میں پیاسوں کو پانی پلایا کرتے تھے۔ اسی اثنار میں اکثر اشعار آپ کی زبان پر جاری ہو جاتے تھے۔ آپ کے شاگردوں نے آپ کے کئی دیوان جمع کئے۔ مگر آپ نے حالتِ جذب میں سب کو دھو ڈالا۔ صرف ایک دیوان کسی نہ کسی طرح محفوظ رہ گیا۔ سالِ وفات ۹۹۶ھ ہے۔

(۵) سید شاہ میر شیرازی۔ المتوفی ۹۹۶ھ سید محمد ابن امیر معین الدین حسنی شیرازی کے فرزند ہیں اور چار واسطوں سے میر سید شریف جرجانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتے ہیں۔ آپ میر رفیع الدین محدث اکبر آبادی کے بھتیجے تھے۔ اور انھیں کے محلے میں بلین گنج کے قریب رہتے تھے۔ سکندر لودی کے عہد آخر میں آپ گجرات کے راستے سے آگرے تشریف لائے۔ آپ جس طرح مراقبت میں کامل تھے اسی طرح نظم و نثر نویسی میں بھی آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔

(۶) میر عبداللہ تبریزی متکلم قلم۔ آپ شاہ نعمت اللہ ولی کی نسل سے ہیں۔ طریقت میں شیخ فیض اللہ چشتی سہارنپوری کے دستِ گرفتہ تھے۔ سخن گوئی میں خاص ملکہ تھا۔ وصفی تخلص فرماتے تھے اور مولانا رافتی کے شاگردِ رشید تھے۔ دربارِ جہانگیر سے متکلم قلم خطاب ملا تھا۔ جس کا ذکر وصفی خود اپنے اس شعر میں کرتے ہیں۔

وصفی تخلص من و متکلم قلم خطاب۔ ایں ہا ہمہ از شاہِ تہمتنا شاہِ یافتم ۱۰۳۵ھ میں وفات پائی۔ قندہاری کوٹھی کے قریب متصل بنگلہ جو اہر ایک گنبد میں آپ کا مزار ہے۔

(۷) مولوی عبداللہ۔ آپ مولوی شیخ عبدالرحمن اکبرآبادی کے فرزندِ رشید تھے، جو نہایت مشہور بزرگ طریقت تھے، مولوی عبداللہ صاحب تقوی، قانع، اور خاموشی پسند بزرگ تھے۔ شعر و سخن میں خاص ملکہ تھا۔ طالب تخلص فرماتے تھے۔ اور آپ کا کلام نہایت پسندیدہ ہوتا تھا۔ اردو میں بھی آپ کا غیر مطبوعہ دیوان موجود ہے۔ آپ کی تمام عمر درس و تدریس میں بسر ہوئی۔ پہلے دس سال تک آپ کا مسلب محلہ شہزادی منڈی میں جاری رہا۔ اس کے بعد آخر عمر تک آپ اپنے مکان واقعہ چھتہ لولکھا میں درس دیتے رہے۔ اور اب قبرستان عیدگاہ میں جنوبی دروازے کے سامنے آسودۂ خواب ہیں۔ المتوفی ۱۱۳۲ھ

(۸) ملا عبدالعزیز۔ ملا عبدالرشید اکبرآبادی کے فرزند ارجمند اور شاگرد رشید ہیں۔ آپکو تمام علوم نقلیہ و عقلیہ پر عبور تھا۔ تصوف میں بھی صاحب کمال بزرگ تھے۔ عالمگیر اورنگ زیب صاحب علم بادشاہ آپ کی قدر کرتا تھا۔ مرتے دم تک تالیف و تصنیف میں مصروف رہے۔ عزت تخلص فرماتے تھے، عربی، فارسی اور ہندی تین زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ۱۰۸۹ھ میں وفات پائی۔

(۹) مولانا غربتی حصاری۔ آپ عہدِ اکبری کے ایک صاحب علم و کمال صوفی منش بزرگ اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ ایک روز ماوراء النہر میں شیخ حسین خوارزمی کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت قوال یہ دوبیتی غزل گا رہے تھے۔

عمریست کہ من زپوستِ پوشانِ توام در دائرۂ حلقہ بگوشانِ توام
گر بنوازی من از خموشانِ توام ور نوازی من از خموشانِ توام

حضرت شیخ پر اُس وقت وجد طاری تھا۔ اُن کی صحبت کی برکت سے آپ پر بھی کیفیت طاری ہوگئی اور اُسی عالمِ وجد میں آپ نے یہ شعر پڑھا۔ ؎

گر بنوازی مرا دگر نوازی در دائرۂ حلقہ بگوشانِ توام

۹۶۶ھ میں آپ نے بمقام آگرہ وفات پائی۔

(۱۰) مولانا محمد سعید اعجاز، آپ عالمِ باعمل اور شاعرِ باکمال تھے۔ ملا عبدالعزیز اکبرآبادی کے شاگرد مرزا بیدل، میر معز نظرت، اور مولانا ناصر علی کے ہم صحبت اور رفیق تھے۔ مدت تک اکبرآباد میں درس و تدریس سے طالبانِ علوم کو فیض پہونچاتے رہے۔ ۱۱۷۴ھ میں انتقال فرمایا۔ اُس عہد کے اکثر فضلا کو آپ کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔

(۱۱) سیّد امجد علی شاہ جعفری القادری۔ آپ کے جدِ پنجم قطب الاقطاب مولانا سیّد ابراہیم قطب جعفری مدینہ منورہ سے بعہد جہانگیر آگرے تشریف لائے۔ خان جہاں لودی جو جہانگیری عہد کا مشہور امیر تھا۔ آپ کا معتقد اور مرید تھا۔ اور اُس نے آپ کے لئے مدرسہ، مسجد اور مکانات اپنے محل کے قریب تعمیر کرا دئے تھے جس مقام پر یہ مکانات تھے وہ اب لودی خاں کا ٹیلہ کہلاتا ہے۔

آپ سیّد عبداللہ قادری بغدادی رامپوری کے خلیفۂ اعظم تھے۔ شاعری میں اصغر تخلص فرماتے تھے۔ آپ کا مطبوعہ دیوان موجود ہے۔ ۱۲۳۰ھ میں آپ نے وفات پائی۔ محلہ مدرسہ میں آپ کا مزار ہے۔

(۱۲) مرزا امیر دبخش رسا۔ آپ مرزا جعفر آصف خاں وزیر جہانگیر بادشاہ کے پوتے تھے۔ اکثر علوم فنون میں شہرۂ آفاق، فصاحت و بلاغت اور انشا پردازی میں یگانۂ عصر سمجھے جاتے تھے۔ فرخ سیر نے ۱۹۲۴ھ میں محض اس تصور پر کہ اُس کے باپ بہادر شاہ کی نسبت کوئی سخت کلمہ آپکی زبان سے نکل گیا تھا، آپ کو شہید کرا دیا۔ آپ کا مزار حویلی امیر دبخش میں جو اب محلہ بلین گنج میں ریٹ صاحب کی کوٹھی کہلاتی ہے۔ موجود ہے۔

(۱۳) مولانا محمد سعادت علی قادریؒ۔ آپ قاضی سید مہر علی کے فرزند اور سید مظفر علی شاہ قادری کے مرید تھے۔ صاحب علم و فضل اور عابد و زاہد بزرگ تھے، سعید تخلص فرماتے تھے۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں آپ کا کلام موجود اور "کلیاتِ سعید" کے نام سے موسوم ہے۔ ۱۳۱۳ھ میں وفات پائی مزار محلہ سید پاڑہ میں واقعہ ہے۔

(۱۴) شیخ محمد صالح قادری اعظمیؒ۔ آپ شیخ عباد اللہ علیہ رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند تھے۔ جو حضرت شیخ سلیم چشتی فتحپوری رحمۃ اللہ کے خلیفہ تھے۔ آپنے اپنے والد بزرگ اور حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی صحبت سے اکتسابِ فیض کیا ہر اوذی الاعلیٰ آپکو شیخ الشیوخ کے نام سے یاد کرتا تھا اور اکثر شعرائے عصر کو آپ سے تلمذ تھا۔

آپ کی یہ غزل بہت مشہور ہے۔

مشتاقِ آفتابِ جمالِ محمدیم — تابندۂ ستارۂ آلِ محمدیم
پروانہ وارِ سوختۂ آتشِ فراق — وہ آرزوئے شمعِ جمالِ محمدیم
صافی زلالِ عشق ثمر آبِ محبت — تشنہ شرابِ زلالِ محمدیم
قانع شدہ است شیفتہ ہر کس بحالتے — خوش حال آنکہ شیفتہ حالِ محمدیم

آپ کا مزار غالباً محلہ گھٹیا اعظم خاں میں ہے۔ ذیقعدہ ۱۰۶۶ھ میں آپ نے وفات پائی۔

(۱۵) میر محمد صالح کشفیؒ۔ آپ میر عبداللہ تبریزی وصفی کے صاحبزادے تھے۔ آپ کا باطن اخلاص و اخلاق سے معمور اور ظاہر زہد و اصلاح سے آراستہ تھا۔ کشفی تخلص اور متکلمین علم سے مخاطب تھا۔

آپ کی یہ بیت مشہور ہے۔

نظر بہ بے کسیم کن کہ قطرۂ آبے — بکام من نہ دہد کس بغیر چشم ترم

۱۰۶۰ھ میں آپ نے وفات فرمائی۔ اور نگلہ جواہر میں آسودۂ خواب ہوئے۔

(۱۶) میر محمد فاضلؒ۔ آپ میر سید احمد اکبرآبادی کے صاحب فضل و کمال فرزند تھے۔ مظہر الحق تخلص فرماتے تھے۔ اور شیخ الشیوخ محمد صالح اکبرآبادی کے شاگرد تھے۔ تاریخ گوئی میں آپ کو خاص ملکہ تھا۔ مخبر الواصلین آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ جس میں حضور سرورِ عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام

سے اپنی وفات یعنی ۱۰۱۱ھ تک تمام مشاہیر بزرگانِ اسلام کی رحلت کی تاریخیں نظم کی گئی ہیں۔ تذکرہ نقد نما کے نام سے آپ نے قدیم مشائخ کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا۔ مگر اب وہ نایاب ہے۔

(۱۷) میر محمد مومن عرشی۔ آپ عبداللہ وصفی تبریزی کے فرزندِ اصغر تھے۔ ابتدائے حال میں شہزادہ سلیمان شکوہ پسر دارا شکوہ کی تعلیم و تربیت پر آپ امور رہے۔ بالآخر متوکل ہو کر گوشہ گزیں ہو گئے۔ سخن گوئی میں ماہر المثال تھے۔ ۹۰ برس کی عمر پائی۔ ۱۰۹۱ھ میں رحلت فرمائی۔ اور اپنے پدر بزرگوار کے قبرستان میں آسودہ ہوئے۔

(۱۸) مولانا مقصود علی تبریزی۔ آپ ملا فضل اللہ بیگ کے فرزند تھے۔ کمالاتِ شاعری اور علم و فضل سے بہرہ مند۔ آپ نے سلمان فارسی کے مشہور قصیدے کے جواب میں ایک سیر حاصل قصیدہ قاضی یحییٰ قزوینی کی مدح میں کہا جس کا ایک شعر یہ ہے ؎ علی خصال و محمد شمائل یحییٰ نام و چو روشن است کمالش چہ حاجتِ القاب

آپ صاحبِ دیوان بھی تھے۔ آپ کے یہ اشعار بہت مشہور ہیں۔

در عالمِ وفا سگِ کوئے تو رام است — اقبال رام گشتہ و عالم بکام است
عشاق را تمام نظر بر جمال تست — اے شاہِ حسن روئے تو ماہ تمام است

۹۷۰ھ میں آپ نے وفات پائی۔ آپ کا مزار متصل نگلہ جواہر ایک چبوترے پر واقع ہے۔

(۱۹) مولانا سید نجم الدین محمد قاسم کابلی۔ آپ کا مولد کابل۔ عرفِ عام میں میاں کالے۔ اور تخلص کاہی تھا۔ خود فرماتے ہیں۔

کاہی تو بلبلِ چمن آرائے کابلی — نازم بزخمہ نہ کہ بہ ہندوستان شوی

آپ کو علم تفسیر، ہیئت۔ تصوف۔ تتمہ۔ تاریخ۔ موسیقی اور شعر میں کامل مہارت حاصل تھی۔ مگر ذوقِ شاعری ان تمام کمالات پر حاوی تھا۔ ۱۵ سال کی عمر میں مولانا عبدالرحمٰن جامی کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے استفادہ کیا تھا۔ عہد اکبری میں براہ بھکر ہندوستان آئے۔ اور ایک قصیدے کے صلے میں انعام و اکرام شاہی سے بہرہ مند ہوئے۔ عمر کا زیادہ حصہ عزلت نشینی میں گذارا۔ آخر ۹۸۰ھ میں بعمر ایک سو دس سال رحلت فرمائی۔

دیوانِ کاہی اور مثنوی گل افشاں۔ آپ کی یادگار ہے۔

(۲۰) قاضی سید نور اللہ شستری۔ آپ مذہب امامیہ کے مشاہیر فضلا سے تھے۔ حکیم ابو الفتح کی سفارش سے اکبری عہد میں شریکِ ملازمت شاہی ہوئے۔ اور برسوں شیخ معین کی جگہ لاہور میں منصب قضاۃ پر مامور رہے۔ آپ شاعر بھی تھے۔ آپ کا کلام بہت دلکش اور پسندیدہ ہوتا تھا۔ شیخ فیضی کی بے نقط تفسیر پر آپ نے ایک عمدہ تقریظ لکھی تھی۔ جہانگیر نے لاہور سے آپ کو بلا کر اپنے لشکر کا میر عدل مقرر کر لیا۔ ۱۰۱۹ھ میں بادشاہ کے سامنے آپ کی زبان سے ایک ایسا کلمہ نکل گیا جس سے برافروختہ ہو کر بادشاہ نے آپ کو شہید کر دیا۔ آپ کا مزار عدالت دیوانی کے قریب زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

تصوف اور شاعری

ان ناموں کے پیش کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ آپ کو صوفیا اور مشائخ کی ادبی دلچسپیوں کا حال معلوم ہو جائے۔ اور مشائخ کے مزاروں پر ادبی مجالس کے انعقاد کا رواج بطور منظم ایک اخلاقی دستور کا درجہ حاصل کر لے۔

شعر و شاعری کو مشربِ صوفیہ میں بہت دخل ہے۔ سماع کی محفلوں اور حال و قال کی مجلسوں میں شعر کی اہمیت اور ہمہ گیری کا ثبوت ہے۔ یعنی اگر شاعر شعر نہ کہے۔ تو مغنی، مطرب اور قوال اپنے مقاصد میں کسی طرح کامیاب نہ ہوں۔

حضرات صوفیائے متقدمین و موجودہ نے اپنی شاعری کا جو معیار قائم کیا ہے۔ وہ حقیقت میں صحیح معیارِ شاعری ہے۔ یہی صوفیائے عرب و ایران کی شاعری کا معیار رہا ہے۔ جو آج بھی سنجیدہ طبقہ شعرا میں قبول ہے۔

جس ظلمے کا اردو شاعری سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ صوفیا کے کلام میں اس کا فقدان نہیں۔ الٰہیات اور روحانیات کے وہ تمام درس جو نثر میں کسی طرح بہ پیرایۂ موثر بیان نہیں کئے جا سکتے شعر کے ذریعے سامعہ میں جذب کئے جا سکتے ہیں۔ وہ حقائق و معارف جن کی تفسیر و توضیح نثر میں نہیں کی جا سکتی، شعر کے پردے میں نہایت آسانی سے متجلی ہو جاتے ہیں۔ حقیقی شاعری وہ ہی شاعری ہے جو ہماری روح کو تجوّر دے، ہمارے دل میں زندگی کی حرارت پیدا کر دے اور ہمارے دماغ کو

اپنے اثرات سے تکلیف کرکے ہمیں سرخوشی و بیخودی کا اہل بنا دے۔

متصوفانہ شاعری میں ہماری عام اور مجازی مصطلحات شاعری کا درجہ روحانیت سے متوارن کر دیا گیا ہے۔ شراب و ساقی کا ذکر اسمیں بھی ہے۔ ہجر و وصل کے جذبات اسمیں بھی ہیں کعبہ و دیر کا نام اسمیں بھی لیا جاتا ہے۔ قفس و آشیاں اس میں بھی دخیل ہیں۔ لیکن شراب سے مراد شراب ذوق و شوق، ساقی سے مراد پیر و مرشد، ہجر سے قرب الٰہی کا بُعد اور وصل سے تقرب و نزدیکی کنایہ کیجاتی ہے۔

کبھی سے اشارہ دل کی طرف ہوتا ہے۔ اور دیر سے صنم خانۂ ہستی مراد ہوتا ہے۔ اسی طرح قفس سے قفس عنصری اور لذاتِ ناقص کی پابندی کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ اور آشیاں سے عالم باقی اور مرجع اصلی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ صوفی کا محبوب، محبوبِ حقیقی اور عشق، عشقِ الٰہی ہے۔ سب سے پہلے حضرات صوفیائے ان کنایوں اور اشاروں کو حقیقی معنوں میں استعمال کیا۔ ان کے بعد جب شاعری مذہبِ عوام میں داخل ہوئی تو یہ تمام کنائے مجازی ہو گئے۔ اور شراب سے مراد مطلق شراب، ساقی سے مراد مطلق ساقی، ہجر کا مطلب کسی محبوبِ مجازی کا فراق اور وصل سے مقصد ہم آغوشی و ہمکناری سمجھا جانے لگا۔ غرضکہ اسی طرح وہ شاعری جو مشربِ صوفیا میں ترجمانِ حقیقت تھی۔ رفتہ رفتہ عوام کے ہاتھ میں آکر بازاری اور رکیک ہو گئی۔ فی نفسہٖ مجازگی ترجمانی کوئی مشکل بات نہ تھی۔ اس لئے تمام فضا اسی رنگ کی طرف مائل نظر آنے لگی اور شاعری تخریبِ اخلاق و تضیعِ اوقات کا ذریعہ بن گئی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ صوفیا کی طرح عام شعرا جو اصطلاحات استعمال کرتے ہیں اُن کا مشارٌ الیہ بھی حقیقت ہی کو کیوں نہیں سمجھا جاتا؟ یہ سوال صحیح ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ عام شاعری نے ان مصطلحات کے استعمال میں جن تعلقات کو شریک کر لیا ہے وہ کسی طرح مجاز سے حقیقت کی طرف متوجہ ہونے ہی نہیں دیتے۔ مثلاً یہ شعر،

وہ اُن کا ہائے شبِ وصل اس طرح آنا
کڑے چڑھائے ہوئے پائنچے اٹھائے ہوئے

کسی طرح محبوبِ حقیقی کی تصویر ہمارے پیشِ نظر نہیں کرتا۔ کڑے اور پائنچے دنیائے مجاز کی مطلق

مادّی اور رسمی چیزیں ہیں جنھیں حقیقی سامانِ محبوبیت سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ پھر کس طرح سمجھ لیا جائے کہ اس شعر میں "آن کا" کا "شائبہ" الیٰ محبوبِ حقیقی ہے۔

اس کے خلاف یہ شعر دیکھئے:۔

بے حجابانہ درآ، از در کاشانۂ ما
کہ کسے نیست بجز دردِ تو در خانۂ ما

شاعر کہتا ہے کہ "اے دوست میرے گھر میں بے حجاب چلا آ" اس لئے کہ بجز تیرے درد کے اس گھر میں اور کوئی نہیں ہے" معمولی عقل و تمیز رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہاں گھر سے مراد دل ہے، جسے لفظ "درد" نے آشکار کر دیا ہے۔ اور دل میں آنے والا محبوبِ حقیقی ہے، جسے چونے اور پتھروں سے بنے ہوئے گھروں سے تعلق نہیں بلکہ انسانی دل سے لگاؤ ہے۔

صوفیا اور عام شعرا کے کلام میں آپ سراسر یہی فرق پائیں گے۔ اس نہج سے متصوفین کا کلام ہماری روحانی قوتوں میں حرکت پیدا کرتا ہے اور عام شعرا کے کلام سے ہماری جذباتی کیفیتیں ہیجیج ہو کر ہماری کمزوریٔ اخلاق کا باعث ہوتی ہیں۔

اب یہ فیصلہ آپ حضرات کے فہم و ادراک پر موقوف ہے کہ شاعری کا معیار کیا ہونا چاہئے۔ ہماری قومی و اخلاقی تعمیر کے لئے بازاری شاعری زیادہ مفید ہے یا خانقاہی؟ ۔۔۔ ہمیں روحانی اور حقیقی لذت و کیف سے سرشار ہونا چاہئے یا مادّی و مجازی جذبات سے؟ میری رائے ناقص میں اگر یہ صحیح ہے کہ "شاعری جزویست از پیغمبری" تو اس میں پیغمبرانہ اور لمحہ نہ شان ضرور ہونی چاہئے۔ تاکہ شاعری کے ذریعے مادّی فضاؤں کا تنگ نہ اصلاح یاب ہوتا رہے۔ اور ہم اپنی قوم کی سیرۃ و اخلاق میں بلندی پیدا کرنے کے قابل سمجھے جانے لگیں۔

ہماری شاعری میں وہ تمام باتیں موجود ہوں جنکا تعلق درس و پیام سے ہو۔ ہمارے اشعار سننے والوں کیلئے وجہِ تفریح نہ ہوں بلکہ سببِ فکر و غور رہیں۔ ہمارے شعر سن کر شاعرے کی فضا "واہ واہ" سے گونجے یا نہ گونجے مگر کسی گوشے سے "آہ" کی آواز ضرور بلند ہو جائے۔

چودھواں خطبہ

مشاعرۂ بزم ادب اورئی ضلع جالون

۱۵- جون ۱۹۳۵ء

گرامی حضرات!

میں اپنی ناچیز ہستی کو آج ایک ایسے تاریخی شہر کے ادبی و علمی احوال میں دیکھکر بے حد مسرور ہوں جسے میں نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر اس عزت کے ساتھ جو مجھے بحیثیتِ صدر مشاعرہ یہاں عطا کی گئی ہے۔ میں اپنی مسرت کو بہت زیادہ قیمتی محسوس کر رہا ہوں۔

موسمِ گرما کی یہ وداع ہونے والی انتہائی گھڑیاں، اور اس موسم کی یہ آخری چاندنی راتیں، مجھ جیسے والہانہ فطرت رکھنے والے شاعر کو "ارضِ تاج" میں بسر کرنی تھیں۔ جن کی شعریت و کیفیت کا مشاہدہ بشرطِ حیات پھر ایک سال بعد ہو سکتا ہے۔ لیکن بعض اوقات کچھ کششیں اپنی قوت سے انسان کو کہیں سے کہیں کھینچ لیجاتی ہیں میں بھی اسوقت ایک کشش ہی کا شکار ہوں۔ جو محبت و خلوص کی قوتوں اور عقیدت و احترام کی عظمتوں سے مرتب ہے۔ میرا مطلب اپنے محترم دوست منشی ہرگوبند دیال صاحب نشتر وکیل اورئی کی عنایت و توجہ سے ہے۔ جنھوں نے باتوں باتوں میں مجھ سے سفرِ اورئی کا وعدہ لے لیا۔ اور جن سے میں نے نقطوں نقطوں میں یہاں حاضر ہونے کا وعدہ کر لیا۔ ورنہ ایک فطرت پرست اور عزلت پسند غریب شاعر کے لئے اس موسم میں "تاج" کا ایک منور گوشۂ مرمریں فی الحقیقت خدا کی تمام موعودہ جنتوں سے

زیادہ خوشگوار تھا۔

"اورئی" کا ادبی جغرافیہ

جس طرح میں اورئی میں پہلی مرتبہ حاضر ہوا ہوں۔ اسی طرح میں نے اورئی میں پہلے مشاعرہ کا اعلان بھی پڑھا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اورئی میں یہاں متعدد خوش فکر و خوش آہنگ شعرا موجود ہیں، اس سے پہلے کوئی مشاعرہ نہ ہوا ہوگا، لیکن کم از کم میں نے نہیں سنا۔

اورئی کی تاریخی حیثیت جو کچھ ہو، اگر جغرافیائی حیثیت سے میں اورئی کو یوپی ہی کا ایک حصہ سمجھنے میں کوئی حرج نہیں دیکھتا، اس ترقی یافتہ زمانے میں اورئی۔ آگرہ سے صرف ۷ گھنٹے کی مسافت پر۔ لکھنؤ سے ۵ گھنٹے کی مسافت پر اور دہلی سے ۱۱ گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے۔ یہ مسافت اتنی طویل نہیں کہ ہم اورئی کو کسی طرح بھی۔ مراکز۔ دواور ادبی محاذوں سے بعید سمجھ سکیں۔ لکھنؤ۔ دہلی اور آگرہ سے اتنے قریب ہوتے ہوئے اورئی کی آہنگِ ادب کا غیر مسموع اور پست رہ جانا یقیناً قابلِ افسوس ہے۔ آپ یہ خیال ہی کیوں کریں کہ اورئی ہند یا لکھنڈ کا ایک حصہ ہے۔ جسے زبان اور ادب سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور آپ یہ کیوں نہ باور کریں کہ اورئی یوپی کی سرزمین سے وابستہ ہے۔ اور اہلِ زبان کی دسترس سے کسی طرح باہر نہیں۔

شاعری اور بقائے عمرانیت

علم و ادب کی بلند آہنگی ایک ایسی رفعت ہے جو اپنے سہارے پست ترین ملتفاتِ ارض کو بھی بلند کر دیتی ہے۔ جائس، بلگرام، امروہہ۔ سہوان۔ یہ سب معمولی قصبے تھے۔ مگر یہاں کچھ ارباب علم پیدا ہوئے جن کے فیضِ سخن سے یہ قصبے مشہور ہو گئے۔ اور نہ صرف مشہور ہو گئے بلکہ اس قابل بن گئے کہ اگر ہندوستان کا کوئی ادبی جغرافیہ مرتب کیا جائے تو اس میں ان قصبوں کا نام بہت سے شہروں سے زیادہ نمایاں لکھا جائے گا۔

شہر یا قصبے، حقیقت میں مجازی عدد و متعینہ ہیں۔ اصل چیز وہ ہے جو ان عدد دیں کارفرما ہے۔ اس لئے اگر آپ کا ذوقِ علم و ادب پرجوش اور قوی ہے تو اس کے متواتر مظاہرے آپ کے نام کے ساتھ اس قصبے کو نمایاں حیثیت دے سکتے ہیں۔ پھر آپ کیوں نہیں اٹھتے۔ پھر آپ کیوں ایک ایسی منظم آواز بلند نہیں کرتے جو دوسرے شہروں میں بھی سنائی دے اور جو دوسرے صوبوں میں بھی آپ کے قصبے

کو شہرت و قبولیت حاصل کرنے کے قابل بنائے۔

اس انحطاط و انقلاب کے زمانے میں بھی جب کہ ہمارا ملک حضیض کی طرف بڑھا چلا جا رہا ہے ہماری بقاءِ حیات کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ ادبی ذوق ہے۔ ہم اسی ذوق کے سہارے آج اور آج کے بعد زندہ رہ سکتے ہیں۔ جن قوموں نے اپنے ملک کے ادب کو زندہ رکھا وہ آج صدیوں کے بعد بھی زندہ ہیں یونان کا طبقہ اُلٹ گیا۔ مگر یونان کا ادب آج بھی شرق و مغرب سے داد خواہ اور باجگیر ہے۔ عرب کے فصحا کا سلسلۂ پیدائش ختم ہو گیا۔ مگر عربی ادب آج بھی عرب کو کششِ جہاتِ عالم میں برتری و امتیاز دے رہا ہے۔

شاعر کا تفوق جنسی ادبِ اردو، ہندوستان اور ہندوستان کی تمام اقوام کے لئے عروج و بقا کا واحد ذریعہ ہے۔ آج ہندوستان کے ادیب دنیا بھر میں مشہور و مقبول ہیں اور آج ہندوستان کا ادب کسی ملک کے لٹریچر سے کم سرمایہ دار نہیں۔

پھر ادب میں شاعری کا حصہ! ایک ایسا خوشگوار اور روحانی جزو ہے جو ہر نوع افراد کو قبولیت و شہرت کے ارتفاع و معراج پر پہونچانے کے لئے ایک مستند ذریعہ اور واسطہ ہے۔

زمانہ مرہٹہ سرداروں اور پنڈیلے تھاکروں کے نام بھول سکتا ہے۔ مگر کبیر داس اور کالیداس کو نہیں بھول سکتا دنیا لودی سلاطین اور اُن کے کارناموں کو بھلا سکتی ہے۔ لیکن اُس عہد کے شعرا کو خواہ وہ کسی زبان کے شاعر ہوں کبھی نہیں بھلا سکتی۔ میر اکبر آبادی سے، امیر لکھنوی تک اور داغ دہلوی سے آپ کے متعارفہ کسی نام آور شاعر تک لاتعداد انسان محض اپنے کلام کے سبب زندہ ہیں۔ اور ابھی خدا جانے کب تک زندہ رہیں گے۔ یہی زندگی ابدی زندگی ہے۔ اور اسی زندگی کا نام دراصل زندگی ہے۔

شاعری سے دنیا کا کوئی دور اور کوئی زمانہ خالی نہیں رہا۔ روایات کا سلسلہ تو یہاں تک پہونچتا ہے کہ دنیا کے سب سے پہلے انسان نے اپنے سب سے پہلے فرزند کی موت پر یہی ماتم موزوں کیا تھا معلوم ہوا کہ شاعری ایک فطری جذبہ ہے، جو ہر انسان کو فطرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے۔ اور جس کا کام میں لانا نہ لانا امرِ اختیاری ہے۔ اس فطری جذبے میں علم و ادراک، غور و فکر، تحقیق و تخیل،

ایجاد، اختراع، اور نظر و نقد سے ایک قسم کی فنی صنعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور شاعر کا الہام انسانوں کی سماعت کے لئے ایک ایسا دلکش گیت بن جاتا ہے، جس کا کیف و سرور کبھی کم نہیں ہوتا۔ اور جس کے ساز ترنم پہ دل وجد کرتا ہے اور روح رقص کرتی ہے۔

شعر کی عروضی و لغوی تعریف سے اس وقت بحث نہیں۔ اس زمانے میں شعر کا مفہوم یہ ہے کہ دلنشین چھبنے والا ایک نشتر اور تکلم کی عام سطح سے بلند ایک کلام ہو۔ یعنی جو خیال شعر میں نظم کیا جائے وہ عامۃ الناس کے خیالات سے ممتاز و مرتفع ہونا چاہیئے۔ اگر شاعر کے خیالات عام خیالات سے متوازن ہوں تو شاعر کو اُن کے موزوں کرنے کے سوا اور کوئی امتیاز نہیں دیا جا سکتا۔ میرے خیال میں ہر خیال کے نظم کر دینے کا نام شاعری نہیں۔ بلکہ شاعری نام ہے خیالاتِ بلند و محفوظ کی موزوں ترجمانی کا۔ اور شاعری نام ہے اُس تصویر میں جان ڈالنے کا جو نقاشِ فطرت شاعر کے دماغ پر مرتسم کرتا ہے۔

موجودہ شاعری اور تنوعِ خیال

حضرات، شاعری کی قدامت کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا ایک حد تک بجا ہے کہ اب شاعری میں نئے اور تازہ خیالات کی گنجائش نہیں رہی۔ لیکن انسان شاعری سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ جب اس کی تخلیق میں ہنوز ندرت و تنوع باقی ہے تو کیا سبب ہے کہ شعر، الہامی مخلوق ہونے کی حیثیت سے اب بھی نادر و متنوع نہ ہو۔

نہ دنیا کی کوئی صبح نئی صبح ہے، نہ کوئی شام نئی شام ہے۔ نہ تارے نئے ہیں۔ نہ چاند نیا ہے، نہ سورج نیا ہے۔ نہ دریا۔ نہ پہاڑ، نہ انبار، نہ لالہ زار، مگر پھر بھی ہر صبح میں ایک نئی طلعت، ہر شام میں ایک نئی نزہت ہر رات میں ایک نئی پھبن۔ غرضکہ ہر چھپ کر طلوع و نمودار ہونے والی چیز میں ایک نیا پن موجود ہے۔ اسی طرح موجوداتِ عالم، واقعات و کیفیات کے لحاظ سے اپنا رنگ و اثر اور اپنے احوال کا عالم بدلتے رہتے ہیں۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے۔ کہ لاتعداد اشعار کہے جانے کے بعد بھی کوئی نیا شعر دماغ سے پیدا نہ ہو۔ یا اُس میں کوئی ندرت محسوس نہ کی جا سکے؟ - الّا ماشاءاللہ۔

جس طرح فطرت کی قدامت، نئے واقعات و حادثات سے ہمارے لئے تنوع پذیر کی جاتی ہے

اسی طرح ہماری شاعری میں بھی الفاظ نہ سہی کم از کم خیالات و احساسات اتنے نئے ہونے چاہئیں جو ہمارے اشعار کے نئے اور نادر سمجھے جانے پر دنیا کو مجبور کر دیں۔

اسی نظر سے کے تحت اردو شاعری کا وہ رنگِ قدیم، جسے تغزل محض کہتے ہیں، بتدریج کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور اسکی جگہ جدید خیالات کو مل رہی ہے۔ جسے جدید شاعری کہتے ہیں وہ حقیقت میں جدید شاعری نہیں۔ بلکہ شاعری کا جدید اسلوب ہے۔ فنِ شاعری تو اب تک انھیں اصولوں اور بنیادوں پر مبنی ہے۔ جو اصنافِ فن نے اب سے صدیوں پہلے قائم کی تھیں۔ مگر نفسِ شاعری بہت کچھ بدل گیا ہے۔ اور یہ تبدیلی نہ صرف وقت اور زمانے کے مطابق ہے بلکہ دنیا کا مستقبل بھی اس تبدیلی کے بعد خوش آئند نظر آتا ہے۔ اب ہماری شاعری میں جذبات کے ساتھ درسِ پیام بھی ہے۔ یعنی جو کڑوی سی کڑوی بات ہم نثر میں نہیں کہہ سکتے وہ نظم میں بے تکلف کہہ جاتے ہیں۔ اور سننے والوں پر اس کا کوئی تلخ اثر مرتب نہیں ہوتا۔ اب ہمارے اشعار۔ ایک خاندان کے ہر بزرگ اور ہر فرزند کے سامنے سنائے جانے کے قابل ہیں۔ اور اب ہمارے خیالات اس درجہ مہذب، پاکیزہ اور شستہ ہو گئے ہیں۔ کہ ہم صرف اپنی شاعری سے اصلاح و تہذیب اور تعمیرِ تاسیس کا کام بہ آسانی لے سکتے ہیں۔

آخری گذارش

میری آخری گذارش یہ ہے کہ آپ کو اردی گی ادبی شہرت و نمود اور اعلان و اشتہار میں ضرور حصہ لینا چاہئے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس طرح مارچ کے مہینے میں یہاں فصلوں کی تیاری پر ایک نیا عالمِ رنگ و بو پیدا ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح آپ کی توجہ اور کوشش سے سال میں ایک مرتبہ یہاں ادبی فصل بھی ضرور آیا کرے۔ اور یہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ آپ سال بھر تک متواتر ادبی کیاریاں بناتے رہیں اور ان میں اپنی فکر اور اپنے ذہن سے آبیاری فرماتے رہیں۔

مجھے یقین ہے کہ بزمِ ادب "اردی" کے ہاں جلسے اگر بالالتزام ہوتے رہیں اور انمیں شاعروں اور مناظموں کا باقاعدہ انتظام ہو۔ اور انکی روداد ہندوستان کے مشہور موقت المشروع رسائل و جرائد میں شائع ہونے کیلئے بھیجی جایا کرے۔ تو چند سال ہی میں "اردی" کا نام ادبی دنیا میں متعارف ہو سکتا ہے۔

شعر الحیات

اپنی شاعرانہ زندگی کے مختصر حالات

اپنا بیان اپنی زبان

اردو سوانح نویسی کی رسمِ ستمرہ یہ ہے کہ شعرا کے حالات عموماً انکی وفات کے بعد قلمبند کئے جاتے ہیں۔ پھر اُن میں جانب داری، رعایت اور غلط روایات سے اس قدر خلطِ بحث ہو جاتا ہے کہ صحیح واقعات تک ذہن کی رسائی دشوار ہو جاتی ہے۔ اور جس طرح ایک دنیا دار انسان انتظارِ وقت میں اپنے متعلقین کے لئے وصیت نامہ لکھنا فالِ نیک نہیں سمجھتا اور مرجاتا ہے اسی طرح روحانی دنیائے ادب کے فرشتے بھی اپنی روداد حیات کہنے سے پہلے ہی خاموش ہو جاتے ہیں۔

اگر یہ دستور عام ہو جائے کہ اُدباؤ شعرا اپنا حیات نامہ اپنی زندگی ہی میں لکھ جایا کریں تو میری دانست میں عین مصلحت ہے۔ میں نہ فرشتۂ ادب ہوں، نہ شاہیرِ ادبا، شعرا کا ہم صف، مگر ایک دیوانہ ادب ہونے کی حیثیت سے، اور اس حیثیت سے کہ انسانوں کی اس دنیا میں عرصہ دراز تک رہا ہوں (صرف اس خیال سے کہ شاید میرے بعد میرے حالات کی مؤرخ کو ضرورت ہو) اپنی حیاتِ شاعرانہ پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔

پیدائش، تعلیم اور فطری ذوقِ شعر گوئی

میں جمادی الثانی ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۰ء بروز دوشنبہ وقت صبح اکبر آباد (آگرہ) کے محلہ نائی منڈی۔ گلوگلی، الٰہی والے مکان میں پیدا ہوا۔ یہ مکان اب بھی اپنی حدودِ متعارفہ کے ساتھ اپنی جگہ پر موجود ہے۔ لیکن اس کے مکین اپنی سکونت دوسری دنیا

میں منتقل کر چکے ہیں اور نئے الکانِ مکان نے رہٹ والی کا درخت بھی کاٹ دیا ہے۔ جو برسات کے موسم میں ہمیشہ محلے بھر کی خواتین کے جھولے سے جھوا کرتا تھا۔ اور جس کے قرمزی پھولوں کا ترش و شیریں ذائقہ اب تک میرے کام و دہن میں محفوظ ہے۔ آہ! وہ آبا و گھر، مقدس نفوس سے معمور خاندان! دادا صاحب، اُن کے بھائی، اُنکی بہن، دادی صاحبہ، والد صاحب، والدۂ ماجدہ، میرے دو بھائی، دو بہنیں، چھوٹے دادا صاحب کا فرزند ——— کیسی زندگی افروز دنیا تھی! جسے انقلاب نے نقشِ موہوم بنا دیا ——— وہ چہل پہل، وہ میٹھے کنوؤں کا پانی، کڑوے تیل کا چراغ، وہ پسنہاریوں کا غذی ہلکے ظروف (ٹھانوں) میں آٹا پیس کر لانا وہ شہنشاہ اکبر کے نام سے مسکوک سکے، ایک ڈبل (دو پیسے) میں دو۔ وہ زندگی کی ارزانی، وہ فراغ و آسودگی اور شگفتہ سامانی! ——— اب وہ زمانہ خواب و خیال معلوم ہوتا ہے۔ وہ حقیقتیں فسانہ ہو گئیں۔ اور وہ زمانے بدل گئے۔ "تِلکَ الاَیّامُ نُداوِلُھا بَینَ النّاسِ۔ اب صرف ایک بھائی (صادق حسین) اور ایک بہن باقیات الصالحات سے ہیں خدا انھیں سلامت رکھے۔

والد ماجد مولانا محمد حسین مرحوم (نور اللہ مرقدہٗ) فاضل عصر اور عالم متحرّی تھے۔ اجمیر شریف میں ٹائمس آف انڈیا پریس کی شاخ کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ دنیات کے دلدادہ اور مذہب کے پابند۔ کئی کتابوں کے مصنف۔ گلدستۂ عطّار کے چار حصّے۔ مجموعۂ مناجات۔ کرامات غوثیہ۔ آپ کی تصانیف سے اب تک مقبول و مروج ہیں "مشعل الحدیث" کے نام سے ایک ماہنامہ رسالہ آپ کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ "رسالۂ رہنما" اجمیر کی ترتیب میں بھی آپ کا ہاتھ تھا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ لیکن عام طرزِ شاعری سے آپ کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حکیم امیر الدین عطّار اکبر آبادی کے شاگرد تھے۔ تمام راجپوتانے میں اُس وقت مرحوم سے بہتر کوئی واعظ نہ تھا۔ اپریل ۱۹۶۷ء میں بمقام آگرہ انتقال فرمایا۔

شاعری پیرانہ ذوق اور پدری میراث ہے۔ جب میں حضرت مولانا جمال الدین سرحدی مرحوم، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی مرحوم، حضرت مولانا قمر الدین مرحوم، اور حضرت مولانا عبد الغفور مرحوم، (اناللہ برہانہم) سے عربی ادب، اصول، اور منطق کی تکمیل میں مصروف تھا۔ اور فارسی میں سکندر نامہ نیا بازار، مثنوی ضیغمیت، رقعات میرزا قتیل، پنج گنج ظہوری، ابو الفضل وغیرہ کتابیں ختم کر چکا تھا۔ اور علمِ عروض بھی میرے درس میں تھا اسوقت میں دیکھتا تھا کہ اس علم سے مجھے خاص دلچسپی ہے۔ کتبِ متداولہ عربی و فارسی کی

تکمیل کے بعد حضرت والد مرحوم نے مجھے انگریزی مدرسے میں داخل کر دیا۔ جو گورنمنٹ کالج اجمیر کے تعلق والحاق کی وجہ سے "برانچ اسکول" کہلاتا تھا اور اب بھی بدستور موجود ہے۔

برانچ اسکول کے مدارجِ درس بعجلت طے کر کے جب میں کالج پہونچا تو وہاں مولوی سدید الدین قریشی اکبرآبادی مرحوم، مولوی تحسین علی اجمیری مرحوم، اور مولوی عابد حسین کی عالمانہ اور فاضلانہ توجہات نے میرے اُس ذوقِ شاعری کو بے حجاب کر دیا جو میری فطرت میں ازل سے ودیعت تھا میرا دستور یہ تھا کہ فارسی نصاب میں جتنے اشعار شریکِ درس ہوتے میں اُن کا ترجمہ اردو نظم میں کر کے اپنے اساتذہ کے سامنے رکھ دیتا تھا۔ اور یہ مقدس حضرات میری اس جسارت کی حوصلہ افزائی سے دریغ نہ فرماتے تھے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ مولوی عابد حسین کے سامنے جب میں نے ایک روز بوستاں کی ایک حکایت کا ترجمہ منظوم پیش کیا تو مولوی صاحب نے میری کاپی کے اُسی صفحے پر پنسل سے یہ شعر لکھ دیا۔ ؎

جب نہیں ہے شعر کہنے کا شعور پھر بھلا ہے شعر کہنا کیا ضرور

لیکن ساتھ ہی ساتھ تبسم ہو کر یہ بھی فرما دیا کہ کل پھر کسی فارسی نظم کا ترجمہ نظم ہی میں کر کے لانا۔ غرض اب یہ میری عادت جاریہ تھی کہ میں حافظ، جامی، سعدی، عرفی، قاآنی، وغیرہ کے اشعار و قطعات کا ترجمہ (جن کا انتخاب کلام جزوِ نصاب تھا) ہمیشہ بصورتِ نظم پیش کیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ جسارت اتنی بڑھ گئی کہ امتحان کے پرچوں میں بھی میں ہمیشہ فارسی نظم کا ترجمہ اردو نظم ہی میں کرتا رہا۔ اور صاحبِ ذوق ممتحن میری اس بدعت سے کبھی چیں بجبیں نہ ہوئے۔

۱۷ سال کی عمر میں مجبوراً کالج چھوڑ دینا پڑا۔ اس وقت میں الیف۔ اے کا آخری امتحان دینے والا تھا۔ والدِ مرحوم کے انتقال نے سلسلۂ تعلیم جاری رکھنے سے معذور رکھا۔ بیس سال کی عمر میں شادی ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میں بے تکلف شعر کہہ لیتا تھا۔ گرچہ نگاہ شاہراہِ سخن میں ہنوز کسی کو اپنا رہنما نہیں بنایا تھا۔ اس لئے مشاعرے میں غزل پڑھنے سے کسی قدر جھجک ہوتی تھی۔

والدِ مرحوم، تعلیم کے ساتھ میرے ذوقِ سخن کے مخالف تھے۔ اور میں اُن سے چھپ چھپ کر یہ شوق شاعروں میں شریک ہو کر کرتا تھا۔ جب کہیں مشاعرہ ہوتا تو میں چاہتا تھا کہ خدا کرے آج والد صاحب نہیں دفتر کو

تشریف لے جائیں۔ اکثر یہ خواہش پوری ہو جاتی تھی۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تھا مجھے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ اور مشکل سے نیند آتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ جب والد مرحوم نے یقین کر لیا کہ یہ میرا ذوق فطری اور موروثی ہے تو پھر میرے لئے زیادہ سخت گیری نہ رہی۔ بلکہ میں نے اُن کے بعض تلامذہ و احباب سے یہ بھی سنا کہ وہ میرے مستقبلِ شاعری کے لئے دعاگو ہیں۔

ملازمت اور تلمذ والدِ مرحوم کے انتقال کے بعد اُن کا فرزندِ اکبر ہونے کی حیثیت سے گھر کا تمام بار میرے سر پر آ پڑا۔ اور مجھے بہ سلسلۂ معاش کانپور جانا پڑا۔ حکیم آزاد لکھنوی، جناب محب لکھنوی، اور کانپور کے اکثر شعرا سے مجالست رہی۔ اس زمانے میں وہاں حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی کا طوطی بول رہا تھا۔ اور قرب و جوار کی وجہ سے کانپور لکھنؤ کے زیرِ اثر تھا۔ لیکن میری طبیعت فطرتاً "دبستانِ دہلی" کی طرف مائل تھی۔ اس لئے میں ۱۸۹۵ء میں فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کا شاگرد ہو گیا۔

۱۸۹۸ء میں حیدرآباد سے برادرِ محترم ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی کی ادارت میں رسالہ "معیار الانشاد" شائع ہوتا تھا۔ نواب فصیح الملک کے حکم سے میں اُس کا خریدار ہوا۔ اور غزلیں بغرضِ اصلاح حیدرآباد بھیجنے لگا۔ لیکن دوسری یا تیسری غزل پر فصیح الملک مرحوم نے لکھا "آپ ابھی کو مشق کی ضرورت ہے" اس تنبیہ کے بعد میں نے غزلوں کی ترسیل کچھ عرصے کے لئے بند کر دی۔ اور مشقِ سخن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اب میرا دستورِ العمل یہ تھا کہ میں صبح سے شام تک بادامی کاغذ کا ایک دستہ اشعار سے سیاہ کر دیا کرتا تھا۔ اور یہ دفترِ بے معنی شام کو پھاڑ کر نالی میں بہا دیتا تھا۔ کئی ماہ تک یہ سلسلۂ مشق اسی طرح جاری رہا۔ اس کے بعد مُول گنج (کانپور) میں ایک مشاعرہ کا اعلان ہوا۔ "دم نکلتا ہے۔ کم نکلتا ہے" میں نے ایک سیر غزل کہی اور اُستاد کی خدمت میں حیدرآباد بھیج دی۔ یہ غزل جب بعد اصلاح واپس آئی تو پیشانی پر سُرخ سیاہی سے لکھا ہوا تھا "آفریں ہے، کیا خوب غزل کہی ہے" بس پھر تو حوصلے بڑھ گئے۔ طبیعت کی جھجک نکل گئی اور میں کانپور اور لکھنؤ کے مشاعروں میں بے تکلف غزل سرائی کرنے لگا۔

اصلاح کا یہ سلسلہ فصیح الملک مرحوم کی وفات سے کچھ پہلے تک برابر جاری رہا۔ اُنکی وفات کے بعد پھر میں نے کسی کو غزل نہ دکھائی۔ ادھر تو مشقِ سخن تکمیل کو پہونچ چکی تھی، اُدھر چند سالہ سلسلۂ اصلاح نے کافی معلومات سے

بہرہ مند کر دیا تھا۔ غرضکہ سلسلۂ اصلاح ختم ہوگیا۔ اسی اثنار میں اکبر آباد کے بعض ارباب ذوق، مثلاً امیر الدین نظر اکبر آبادی مرحوم، حاجی عبدالستار نیر اکبر آبادی، قمر الدین بارع اکبر آبادی، بشیر الدین بشیر اکبر آبادی میرے شاگرد ہوگئے اور میری شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوگیا۔

بعیت اور شاعری نظر مرحوم وارثی تھے۔ کانپور میں وہ اور میں ایک ہی مکان میں (بمقام گوال ٹولی) رہا کرتے تھے۔ انکی تشویق سے انھیں کی ہمراہی میں ایکدن دیوہ شریف جانے کا اتفاق ہوا۔ اور مرشدی و مولائی حضرت حاجی حافظ سید شاہ وارث علی رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ دیکھا جو کچھ دیکھا اور پایا جو کچھ پایا۔ بیعت کے دن بازدید کی حسرت میں ایک غزل کہی۔ بعدِ عصر حضوری کی اجازت ملی۔ غزل لے کر حاضر ہوا، حضور نے غزل مجھ سے لے لی۔ سرنامہ پر لکھا تھا۔ "مسمّیٰ عاشق حسین سیماب صدیقی الوارثی اکبر آبادی تلمیذ فصیح الملک حضرت داغ دہلوی"۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سرنامہ پڑھ کر اوگھٹ شاہ سے فرمایا "فصیح ہیں" اوگھٹ شاہ صاحب نے سرنامے پر نظر ڈالتے ہوئے عرض کی "حضور فصیح الملک کے شاگرد ہیں"۔ ارشاد ہوا "ہاں اور فصیح ہیں"۔ اوگھٹ شاہ صاحب نے دست بستہ اعتراف کیا کہ "ہاں حضور فصیح ہیں"۔ مرشد کا ارشاد، خدا کا کرم، اُدھر "فصیح" کا خطاب ملا اِدھر گویا شاعری کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔

شاگردوں کا مرجوعہ کانپور سے بیمار ہو کر آگرہ آیا۔ تو یہاں منشی محمد اسمٰعیل فضا، منشی ولایت علی شمیم، منشی محمد ایوب بارع، محمد یوسف بہار، عبدالمجید خاں شاداب، شفیع احمد خاں شفا، حفیظ الدین بیتاب، محمد صادق راز پانڈوری، ارشاد احمد خاں ارشاد نظامی، محمد حسین ناظر، عبدالمجید خاں نایاب، محمد خاں شفق، وغیرہ چند نوجوان شاگرد ہوگئے۔ ان دنوں میری نظمیں، غزلیں، اور میرے مضامین، **صوفی نظام المشائخ**، **سالک**، **صبح بنارس**، **ہمدرد** وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔ آگرہ سے سلسلۂ ملازمت اجمیر شریف جانا پڑا۔ جہاں کبھی طالب علمانہ زندگی بسر کی تھی۔ وہاں ذمہ دارانہ حیثیت پائی۔ جہاں شعر کہنے کی ابتدا کی تھی۔ وہاں انتہائی عزت و عظمت ملی۔ یہاں فصیح الملک کے شاگردوں میں اس وقت حکیم بہاؤالدین بہا، محمد محمش ضبط، اور حکیم رام نرائن حیراں دہلوی بہت مقبول تھے۔ انکے ساتھ شاعرے پڑھے۔ اور شاگردوں

کی تعداد یہاں بھی بڑھی۔ پیرزادہ سید علی حسرت اجمیری حافظ محمد عبدالرؤف آدمی اجمیری محمد علی میر واحدی اجمیری منشی محمد حفیظ کاتب اکبرآبادی، احمد بخش تائب نصیرآبادی مرحوم میر محمد صدیق قائل لکھنوی وغیرہ شاگرد ہوئے رسالہ "فانوس خیال" اپنی ادارت میں جاری کیا جو چھ ماہی کے بعد بند ہوگیا۔ پانچ سال تک اجمیر شریف رہکر ۱۸۹۶ء پھر آگرے آیا۔ اور یہاں مرزا خادم حسین رئیس، ماسٹر تصوف حسین واصف، مولانا نثار علی نثار، اور شیخ بزرگ علی عالی (مرحوم و مغفور) کے ساتھ اکثر مشاعرے پڑھے، اس مرتبہ مولوی ضمیر عالم ساحر، محمد محسن محسن، سراج الدین رساں شاگرد ہوئے۔ اور "رسالہ مرصع" کا مدیر رہا جو منشی فرید الدین خاں کوہر مرحوم کے مطبع سے شائع ہوتا تھا۔ یہاں کچھ روز ٹھہر کر ٹونڈلہ (ضلع آگرہ) بصیغۂ ملازمت جانا پڑا۔ ڈی۔ ٹی۔ ایس آفس میں اُس وقت سید محمد احسن شہید شمس آبادی مرحوم ہیڈ کلرک تھے، جب اُنھوں نے سنا کہ میں آگرہ آگیا ہوں تو بہ کمال اصرار مجھے بلایا اور دفتر میں جگہ دے دی۔ خدا مغفرت کرے مرحوم بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ اور شعر و شاعری سے بے حد شغف رکھتے تھے۔ ارباب دفتر میں بابو شوکت حسین شوکت آبادی، بابو محمد صغیر اثر اکبرآبادی، بابو ممتاز علی علی گڑھی اور بیرونجات میں ساغر نظامی وغیرہ اسی زمانہ میں شائع ہونے والے "آگرہ اخبار" کی ادارت بھی ٹونڈلے کی ملازمت کے ساتھ شریک مشاغل تھی۔

ترکِ ملازمت اور قیامِ مرکز اجمیر شریف اور ٹونڈلے کی ملازمتوں میں ہر دن کا نصف حصہ شعر کہنے یا شعر کی اصلاح میں صرف ہوتا تھا۔ اور دیکھنے والے حیران تھے کہ میں ذمہ داریوں کے ساتھ اپنے ذوقِ شاعری کی تکمیل کیونکر کر لیتا ہوں۔ آخر معلوم ہوا کہ فطرت نے مجھے اس لئے پیدا نہیں کیا کہ میں اپنی تمام عمر ذہنی غلامی میں بسر کردوں۔ بلکہ میری تخلیق خدمتِ ادب کے لئے ہوئی ہے اس انکشافِ ضمیری کے بعد میں نے ملازمت کو ابدی استعفا دے دیا۔ اور اکبرآباد (آگرہ) میں مستقل اقامت اختیار کرلی۔

لیکن خدمتِ ادب کا فرض محض غزل کہنے یا غزل دیکھ لینے سے پورا نہ ہوتا تھا۔ دماغ جو ہمیشہ کاوش پسند رہا ایک ایسا مشغلہ ڈھونڈ رہا تھا جو تخلیِ حیات کی تعریف میں آسکے۔ اس لئے نچلا نہ بیٹھا گیا آخر موسم بہار ۱۹۲۳ء کے آغاز میں یہ ذوق "پیمانہ" کی صورت میں نمودار ہوگیا۔ اور اب زندگی کی یکسر کیف و سرور کی روحانیت سے حسب رہنے لگی۔ شاگردوں کا مرجوعہ بہت عجلت و وسعت کے ساتھ ترقی کر رہا تھا۔ اور یہ دور

میری زندگی کا بہترین دور تھا۔ یکایک ایک غلط مشورے کے ماتحت مجھے اپنا ادبی مستقر لاہور منتقل کرنا پڑا۔ یہ انقلاب بہت غیر خوشگوار ثابت ہوا۔ پنجاب کی آب و ہوا، مجھے اور میرے متعلقین کو قطعاً راس نہ آئی اور بالآخر طبی مشورے کے مطابق مجھے واپس آگرے آنا پڑا۔ مثنوی مولانا روم کے چھ دفتروں کا مکمل اردو ترجمہ اسی زمانہ قیامِ لاہور کی یادگار ہے۔

آگرے واپس آیا تو یہاں جی نہ لگا۔ اتفاق سے سردار دیوان سنگھ مفتوں نے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پر ریاست کی ادارت کے لئے دہلی بلایا۔ طبیعت غیر آسودہ تھی ہی۔ چلا گیا۔ اور "پیمانہ" کا ایک نمبر بھی وہاں سے نکالا لیکن قدرت کو یہی منظور تھا کہ میں اپنے وطن میں پاؤں توڑ کر بیٹھوں اور یہاں میری ادبی مرکزیت قائم رہے چنانچہ ۱۹۲۶ء سے اپنے وطنی مستقر پر قائم و باقی ہوں۔

طبیعت نئے نئے شاغل ڈھونڈتی رہی۔ مرکزیت کی بار بار تبدیلی سے "پیمانہ" چلنے لگا۔ اس کے دورِ اشاعت میں اضمحلال سا پیدا ہو گیا۔ ۱۹۲۹ء سے ہفتہ وار "تاج" جاری کیا جو میرے سیاسی خیالات و افکار کا ترجمان تھا۔ پھر ۱۹۳۰ء سے "شاعر" کا اجرا ہوا۔ "پیمانہ" اب بھی جاری تھا۔ مگر "طلب الکل فوت الکل" وسعتِ کار، فراوانیٔ شاغل اور گوناگوں مصروفیات نے پریشان کر دیا۔ آخر ۱۹۳۲ء میں "پیمانہ" بند کر دینا پڑا۔ "تاج" ۱۹۳۳ء تک جاری رہا۔ بالآخر اس سے بھی دست کشی اختیار کرنی پڑی۔ جریدۂ "شاعر" جاری رہا۔ جو اب تک جاری ہے۔ ان تمام انقلابات کا تجزیہ کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ مختلف گوشہائے زندگی میں آوارہ خرامی کے بعد بالآخر ذہنی و عملی آسودگی کی منزل وہ ہی "شعر و شاعری" رہی، جو میرا منشائے تخلیق تھی، اور جس کو نظر انداز نہ کر دینا تکلیفِ فطرت تھا۔

مشاعروں کی شرکت

ہندوستان کا کوئی مشہور اور بڑا شہر ایسا نہیں (سوائے پشاور، کراچی، اور مدراس کے) جہاں میں نے متعدد مشاعرے نہ پڑھے ہوں۔ حضرت جلال لکھنوی مرحوم، حضرت کمال مرحوم، خلفِ حضرت جلال لکھنوی۔ حضرت ریاض خیر آبادی مرحوم، حضرت طاہر فرخ آبادی مرحوم، جناب جاوید لکھنوی مرحوم، حضرت مضطر خیر آبادی مرحوم، جناب عزیز لکھنوی مرحوم حضرت وسیم خیر آبادی مرحوم، حضرت حافظ پیلی بھیتوی مرحوم، حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم، جناب نوبت رائے

صاحب نظر لکھنوی مرحوم، حضرت تجمل ہلالپوری مرحوم، حضرت چکبست لکھنوی مرحوم، کے دوش بدوش شاعروں میں شریک ہوا ہوں۔ اور معاصر موجودین میں حضرت حسرت موہانی، حضرت سائل دہلوی، حضرت آغا شاعر دہلوی، حضرت مجدد دہلوی، حضرت فانی بدایونی، حضرت احسن مارہروی، حضرت نوح ناروی مولانا صفی لکھنوی، حکیم آزاد انصاری، مولانا شفق عماد پوری، مولانا عماد پوری، حضرت جلیل مانکپوری حضرت قمر بدایونی، اور جناب بزم اکبرآبادی، کے ساتھ سیکڑوں مشاعرے پڑھے ہیں۔ مگر اب طبیعت مشاعروں سے گھبراتی ہے۔ اور ساری رات جاگنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے مشاعروں کی شرکت معذرت ہے۔

معنوی وصوری اولاد خدائے قادر وقیوم نے اپنے فضل وکرم سے اولاد بھی دی، عزت بھی دی، ثروت بھی دی؛ اور نام بھی دیا۔ ان نعمتوں کا اعتراف ان نعمت ہے۔ چار لڑکے اور دو لڑکیوں میں بفضلہٖ اب چار لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ جن کے نام بہ ترتیب عمر یہ ہیں۔ شمشاد حسین منظر، جمیلہ خاتون، اعجاز حسین اعجاز، سجاد حسین، مظہر حسین، اسلمہم اللہ تعالیٰ اجمعین لیکن معنوی اولاد خدا نے مجھے اتنی دی ہے کہ شاید ہی کسی کو ملی ہو۔ سو یہ سرحد، پنجاب اور بلوچستان سے لے کر عدن تک سینکڑوں شاگرد موجود ہیں، اور ہندوستان کا کوئی صوبہ ایسا نہیں جہاں یہ میری معنوی اولاد موجود نہ ہو۔ ان میں مسلمان، ہندو، عیسائی، سکھ غرضکہ ہر فرقے کے لوگ ہیں۔ جن میں کثرت بی۔ اے۔ ایم۔ اے اور فاضل ادب ہیں۔ اور مدرس، ہیڈ ماسٹر، پروفیسر، وکیل، ایڈیٹر، رئیس و والیان ملک بھی ہیں۔ خدا ان سب کو زندہ و پائندہ رکھے، اور ان کے ذوق کی تکمیل فرمائے۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاءُ واللہ ذوالفضل العظیم۔

میری ناچیز خدمات چونکہ سن شعور کو پہونچتے ہی کرو بات حیات نے گھیر لیا اس لئے میری زندگی کا زیادہ حصہ غیر مطمئن گذرا۔ اس کے باوجود میں حیران ہوں کہ فطرت نے وہ کام مجھ سے کب اور کس طرح لے لئے جن کی انجام دہی میرے بس کی نہ تھی۔ تالیف و تصنیف کا شوق مجھے عہد طفولیت سے ہے اس وقت تک ۴۰ کتابیں مختلف موضوعات پر میرے قلم کی رہین کشش ہیں۔

جو نثر ان کتب سے حق تالیف لے کر میں نے لکھیں۔ ان میں خواتین کے لئے لٹریچر بھی ہے۔ تاریخ بھی ہے جامع الخطب اور عنریز الخطب، خطباتِ عربی کے منظوم تراجم ہیں۔ الہام منظوم، ترجمۂ مثنوی مولانا روم کے چھ دفتروں کا مکمل ترجمہ مولوی فیروز الدین لاہوری کی فرمائش پر کیا۔ یہ بھی چھ جلدوں میں چھپ چکا ہے۔
سیرۃ الحسینؑ۔ سیرۃ الکبریٰؐ۔ نبت الرسولؐ سیرۃ و تاریخ میں ضخیم کتابیں ہیں۔ ادبی موتی کے نام سے چار کتابیں شریک نصاب ہیں۔ ۱۲ ڈرامے۔ اور ۱۲ مراثی بھی لکھے۔ متعلقہ۔ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے لکھی۔
سیرۃ الکبریٰؐ۔ کا ترجمہ گجراتی زبان میں بھی ہو چکا ہے۔
جو کتابیں میرے قائم کردہ ادبی مرکز "قصر الادب" کی ذاتی ملکیت ہیں۔ اُن کے نام یہ ہیں۔
کارامروز۔ میری قومی اخلاقی اور ادبی نظموں کا مجموعہ
کلیم عجم۔ خطباتِ شاعری اور غزلوں کا پہلا مجموعہ۔
نئے استاں۔ مذہبی نظموں کا مجموعہ۔
رازِ عروض۔ علم عروض کے ابتدائی مسائل و مباحث۔
جو کتابیں زیرِ تصنیف و ترتیب ہیں اُن کے نام یہ ہیں:۔
مرآۃ المطالب۔ جدید شرح دیوانِ غالب۔ الفاظ کے معنی اور مطالب و مفہوم کی توضیح کے ساتھ۔
پیامِ فردا۔ ادبی، اخلاقی اور اصلاحی نظموں کا دوسرا مجموعہ۔
تورات مشرق۔ غزلوں کا دوسرا دیوان۔
آیات الادب۔ رباعیوں کا مجموعہ۔
شاہراہ۔ فنِ شاعری پر ایک مفصل کتاب۔
پیغامات۔ وہ منظوم پیغام جو سیاسی نقطۂ نگاہ سے جرائد "تاج و شاعر" کے ذریعے مختلف افرادِ عالم کے نام دیئے گئے ہیں۔
اساطیر۔ میرے لکھے ہوئے افسانے۔
شاعر کی راتیں۔ اُن شاعروں کے دلچسپ حالات جن میں میں شریک ہوا ہوں۔

شعرِ منثور۔ وہ ادبی شذرات جو وقتاً فوقتاً میرے قلم سے نکلے ہیں۔
منہاج الادب۔ مختلف علمی، ادبی اور فنی مضامین کا مجموعہ۔
کلیجک۔ ڈراما۔
اگر توفیقِ الٰہی رفیقِ حال اور زندگی باقی ہے تو انشاءاللہ یہ تمام کتابیں یکے بعد دیگرے آپ کی نگاہوں سے گذریں گی۔ اور یہ سب "قصر الادب" کی ملکیت ہونگی۔ واللہ المستعان علیٰ التصنون۔

ان تصنیفی خدمات کے علاوہ من حیث الشاعر میں ہمیشہ نظریہ اصلاح رہا ہوں۔ مشاعروں میں خطبہ خوانی کا رواج، مناظموں کا رواج، آگرہ اسکول کی تاسیس، مشاعروں کا جدید نظام، بھی میری ناچیز خدمات سے تعلق ہیں۔ خدا میری ان مساعی کو کامیاب فرمائے۔ اور مجھے خدمتِ ادب کے مزید مواقع و امکانات سے بہرہ مند کرے۔

میرے شاعرانہ معتقدات

اوائل مشقِ سخن تک مجھے قدیم تغزل سے دلچسپی تھی۔ لیکن وقت اور زمانے کے ساتھ علم و معلومات کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا گیا۔ رنگِ قدیم سے لگاؤ کم ہوتا گیا۔ حالانکہ میرے رنگِ قدیم میں بھی سوقیانہ، غیر متین، اور بازاری عنصر کبھی نہ تھا۔ ۱۹۱۸ء سے میرا رنگِ تغزل بالکل بدل گیا۔ میں اب شاعری میں بلند خیالات اور بلند انسانی جذبات کی ترجمانی کا حامی ہوں۔ میں شاعری میں فلسفہ، حقائق اور معارف کے نکات پسند کرتا ہوں۔ میں اُس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت یا اُس کے متعلقات ہوں، یا جو امرد پرستی کی نفسیات پر مشتمل ہو۔ میری شاعری کا موضوع حسنِ محض اور عشقِ محض ہے۔ اور تمام ضمائر کا مرجع وہ ذات ہے جو حاملِ حسن اور مرکزِ محبت ہو۔ جس طرح علم، شاعری کے لئے ضروری اور لازمی ہے اسی طرح محبت اور شاعری کو بھی میں لازم و ملزوم سمجھتا ہوں۔ اور خیالات میں تصنع یا بنوٹ کا حامی نہیں، میں خیالات کو صداقت اور محبت پر مبنی دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور حقیقی وارداتِ قلب کی ترجمانی میرا مسلکِ بیان ہے۔ گو مجھے تمام اصنافِ سخن پہ فطرت نے قدرت دی ہے۔ مگر میں نظم، غزل، اور رباعی کو اظہارِ خیال کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ شعر کی الہامی حیثیت پر میرا ایمان ہے۔ میں شعر میں بلند خیال کے ساتھ بلند الفاظ کا موید ہوں۔ ایسے الفاظ جن میں غرابت نہ ہو اور جنھیں تعلیم یافتہ اصحاب بہ آسانی سمجھ سکیں۔

میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں اور جانتا ہوں کہ شعرا غزل سے زیادہ نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوں اس لئے کہ غزل جس چیز کا نام ہے وہ اپنی قدامت و کہنگی کی وجہ سے اب زیادہ کارآمد نہیں۔ شعرائے متغزلین اس صنف کو بہ تمام و کمال پامال اور ختم کر چکے ہیں۔ نہتی شعرا کے لئے بھی غزل میں اجتہاد و ایجاد کی گنجائش بہت کم باقی ہے مگر "نظم" کا بیدان ہنوز وسیع ہے۔ اور یہ صنفِ سخن اردو شاعری کو کارآمد اور مفید بنا سکتی ہے۔ اس لئے زیادہ تر توجہ اسی کی طرف ہونی چاہیئے۔

شعر و شاعری کے متعلق میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ "زندگی شعر ہے اور شعر زندگی ہے"۔ کائنات بغیر "شاعر" کے ایک ساز بے نغمہ ہے۔ شاعر دنیا کا ایک ایسا جزو ہے جس کے بغیر دنیا کا قیام ناممکن ہے۔ الہام و وحی کا وہ سلسلہ جو پیغمبروں کے مبعوث نہ ہونے سے ختم ہو چکا ہے "شاعر" کے دماغ اور سروش میں اب بھی باقی ہے۔ اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

یہ میری ۵۵ سالہ زندگی کے شاعرانہ حصے کی روداد ہے جسے میں نے بے کم و کاست اپنے قلم سے لکھ دیا۔ زندگی کے باقی حصوں میں کوئی ایسی دلچسپ بات نہیں۔ جو قابلِ گذارش ہو۔ دراصل زندگی اسی دور سے عبارت ہے۔ جو ذوقِ شعر کی کیفیات و سرخوشی میں گذرا۔ باقی بچپن اور جوانی میں مافوق الانسانیت کوئی خصوصیت نہ تھی اور اب جوانی گذر جانے کے بعد تو بس اللہ ہی اللہ ہے ؎

بزمِ افسانہ کر و ختمِ جوانی گذری
قابلِ ذکر اب آگے کوئی روداد نہیں

میں شعر کیونکر کہتا ہوں؟

اس عنوان کی توضیح کے لئے مجھے اپنی عمرِ شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔

پہلا دور (۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۵ء تک) میری طبیعت ۱۸۹۲ء سے شعر کہنے کی طرف فطرتاً مائل ہوئی۔ اس وقت میری عمر ۱۲ سال سے زیادہ نہ تھی جس وقت جو کتاب یا بیاض میرے سامنے آئی۔ میں نے اس پر پنسل یا قلم سے ایک شعر لکھ دیا۔ یہ شعر فی الحقیقت اُن سنے سنائے اشعار کا چربہ ہوتا تھا۔ جو بیرونی نفاسے کسی نہ کسی طرح کانوں تک پہونچتے رہتے تھے۔ یا جنھیں میں اپنی ابتدائی درسی کتابوں میں پڑھتا تھا۔ رفتہ رفتہ شعر کہنے سے ایک خاص قسم کی لذت حاصل ہونے لگی۔ یہ مجھے یاد نہیں کہ ان میں سب اشعار موزوں ہوتے تھے یا ناموزوں۔ لیکن میں نے بالمرہ ایک وقتِ خاص اس روحانی و ذہنی لذت سے تکلیف ہونے کیلئے مقرر کرلیا اب میں اچھے کاغذ کی چھوٹی نفیس بیاض بنوا کر اُن پر اپنے اشعار لکھنے لگا۔ قاعدہ یہ تھا کہ رات کو تمام کاموں سے فارغ ہوکر میں چراغ شمعداں پر رکھ لیتا اور فکر کرنے لگتا۔ جس زمین میں شعر کہتا اُس کے تمام قوافی جو بقدرِ معلومات مجھے اُس وقت یاد آتے پہلے ایک کاغذ پر لکھ لیتا۔ اور پھر انھیں کی مناسبت سے شعر کہتا۔ اس زمانے میں شعر کے موزوں یا غیر موزوں ہونے کا سوال نہ تھا۔ بلکہ یہ خبط تھا کہ کسی طرح شعر کہوں اور روز کہوں۔ یہ خبط بڑھتے بڑھتے بتدریج ذوق میں تبدیل ہوگیا۔ اور مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں محرم کے زمانے میں والدۂ ماجدہ (نوراللہ مرقدہا) کے ساتھ ہر سال اجمیر سے آگرہ آتا۔ تو ساتویں تاریخ کو اپنے محلے کے عزاخانے میں کچھ اُلٹے سیدھے اشعار ضرور پڑھا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں واقعی شاعر ہوں۔ چھ برس تک ذوقِ سخن کا یہی حال رہا۔ مگر اس دور کی کوئی غزل اب محفوظ نہیں۔

دوسرا دور - (۱۸۹۶ء سے ۱۹۰۰ء تک) جب ۱۸۹۶ء میں بعد تلمذ میری باقاعدہ رہنمائی

ہونے لگی تو اب مجھے شعر کہنے میں ایک حقیقی مسرت حاصل ہونے لگی۔ اب میرے شعر کہنے کا طریقہ یہ تھا کہ طعام و نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں کرسی پر بیٹھ جاتا۔ میز پر طشت میں پان، الائچی، چھالیا۔ لونگیں، لکھنؤ کا تواماں وغیرہ ہوتا۔ اور کرسی کے پاس حقہ؛ چھوٹی میز پر سگریٹ کیس۔ ان سامانوں کے ساتھ میں رات کے ایک بڑے حصے تک شعر کہنے میں مصروف رہتا۔ اور اکثر ۳۰-۴۰ اشعار ایک ہی نشست میں کہہ ڈالتا۔ پھر اُن میں سے اچھے اشعار منتخب کر کے صبح ایک غزل بنا لیتا۔ اور اصلاح کے لئے بھیجا کرتا تھا۔

قافیہ پیمائی کا مرض ہنوز موجود تھا۔ مگر اب اسکی نوعیت یہ تھی کہ جس زمین میں جو قافیہ زیادہ دشوار ہوتا میں اُس پر کئی کئی شعر کہتا۔ اور آسان قافیے علی العموم ترک کر دیتا تھا۔ ۱۹۰۰ء تک شعر کہنے کا کم و بیش یہی دستور رہا۔ شوق کے ساتھ ذوق جس قدر بڑھتا گیا۔ خیالات میں آمد و آراستگی، سنجیدگی اور بالیدگی پیدا ہونے لگی۔ اُستاد کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔ اُن کے بعد کسی کو غزل دکھانا خود داریٔ شعر کی گوارا نہ کیا۔ پہلے جو شعر اُمید اصلاح کہا جاتا تھا اُسکی خامیوں پر نگاہ کم رہتی تھی کہ اگر کوئی نقص ہوگا تو اصلاح میں نکل جائے گا۔ اب ذمہ داری محسوس ہونے لگی۔

اب تک یہ تکلف باقی تھا کہ جب کسی مشاعرے کے لئے غزل کہنی ہوتی تو پہلے غسل کرتا۔ پھر مکلف لباس پہنتا، کچھ فواکہات، کچھ سگریٹ، کچھ پان میز پر ضرور موجود ہوتے۔ اس کے بعد غزل کہتا۔ دس بارہ سال کی مشق کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب غزل اُٹھتے بیٹھتے ایک دن میں پوری ہو جاتی تھی۔ اور ایک دن نظرثانی میں صرف ہوتا تھا مشاعرے کی اطلاع گویا عید کی نوید ہوتی تھی۔ مشاعرے میں شرکت کا اہتمام دو ایک روز پہلے سے کیا جاتا تھا۔ لباس میں جو اضافی و اضافی چیز کم ہوتی وہ بازار سے خرید کر اُس دن منگوا لائی جاتی تھی۔ اور بڑے کروفر اور شاعرانہ افتخار کے ساتھ مشاعرے میں شرکت کی جاتی تھی۔

تیسرا دور (۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۸ء تک) یہ زمانہ بھی ملازمت کا تھا۔ اس لئے دن کو شعر کہنے کے لئے اچھا ماحول نہ ملتا۔ تاہم کوئی دن ایسا نہ گذرتا تھا۔ کہ میں معاشی کاروبار ختم کر کے دن کا کچھ حصہ شعر کہنے کے لئے نہ نکال لیتا۔ وہ ذوق و شوق کے زمانے، ولولے اور اُمنگوں کے دن، ذہن و دماغ کی آزادی کا موسم، دیکھتے ہی دیکھتے گذر گیا۔ ادھر شاگردوں کا مرجع بڑھا۔ اُدھر قبولیت و شہرت شریکِ حال ہوئی۔ اب دوسروں کی

ذمہ داری بھی شریکِ احساس تھی۔ رفتہ رفتہ جو چیز ذوقِ طبیعت تھی۔ وبالِ طبیعت ہوگئی۔ تکلف برطرف جہاں اور جب ضرورت ہوئی قلم جیب سے نکالا اور نظم یا غزل جو کچھ کہنی ہوئی کہہ ڈالی، نہ اب اچھی جگہ کی ضرورت تھی۔ نہ پان الائچی کی اصطباح۔ نہ لباس کی پابندی۔ نہ وقت کی قید۔ غرضکہ طبیعت تمام قیود سے آزاد ہوگئی۔ مگر رات کو بستر پر جانے کے بعد شعر کہنے کی عادت اب بھی باقی رہی۔

چوتھا دور۔ (۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۵ء تک) شعر کا زمانہ ۱۹۰۰ء میں ختم ہو چکا تھا۔ پندرہ سولہ سال کسی کام کی مشق کے لئے کم نہیں ہوتے۔ پھر جو دہ پندرہ سال تک ذمہ دارانہ حیثیت سے غزل یا نظم کہتے رہنا فنِ شاعری پر عبور حاصل کرنے کے لئے کافی تھا۔ اس لئے اب شاعری تمام مرحلے ہو چکے شعر اور نثر کے فرق و امتیاز اس زمانے میں معلوم ہوا۔ مجھے اب شعر کہنے میں وہ کوفت نہ ہوتی تھی۔ جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ اوّل اوّل شعر کہتے وقت ایک ایسا ذہنی ماحول پیدا ہو جاتا تھا جس میں نسائیات و نفسانیات کا غلبہ ہوتا تھا۔ مگر اب میرا ماحول قطعاً روحانی اور ادبیات کے تصور سے بھی خالی تھا۔

۱۹۱۰ء سے شعر کہتے وقت میں ایک ایسے عالم میں پہونچ جاتا ہوں۔ جہاں خواہر اور رسمیات کی گنجائش نہیں۔ جہاں ایک محیطِ سرور و نور میں میری روح اور دماغ دونوں سرخوش ہوتے ہیں۔ جہاں حسن بدرجۂ اتم ہوتا ہے۔ مگر معصوم اور ازلی، اور جہاں محبت بحدِ غایت ہوتی ہے مگر بے لوث اور ابدی، اب بعض اوقات بغیر فکر بھی تخمِ دماغ پر نازل ہو جاتا ہے۔ آسودگیٔ خلوت، شورشِ محفل، لوگوں کا ہجوم، رباب و سرود کی آوازیں، ریل کی کھڑکھڑاہٹ۔ موٹروں اور تانگوں کی سماعت خراش رفتار میرے شعر کہنے میں حائل و خارج نہیں ہوتی۔ اب میں چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، اور دورانِ گفتگو میں بھی شعر کہہ لیتا ہوں۔ اب میرے لئے شعر کہنا اور باتیں کرنا برابر ہے۔ البتہ جب کثرتِ افکار سے دل پریشان اور دماغ پراگندہ ہوتا ہے تو مجھ سے شعر نہیں کہا جاتا۔

مثنوی مولانا رومؒ کا منظوم ترجمہ کرتے وقت میں نے دو، دو سو شعر ایک دن میں کہے ہیں۔ "کارِ امروز" کی جدید نقلیں صرف بیس روز کا نتیجۂ فکر ہیں۔ اور یہ کام اُس وقت ہوئے ہیں جب تین تین اخباروں اور رسالوں کی گرانی و ادارت بھی میرے ذمہ، سب پر فرض تھی تلامذہ کو اصلاح دینا، ذاتی خطوط کے

جواب لکھنا، اور بیرونی رسائل کی فرمائشوں کی اخلاقاً تعمیل کرنا بھی اسی انہماک کے ساتھ ساتھ تھا۔

برسات کا میں جب ابر سیاہ آسمان پر چھایا ہوا ہو۔ اور ہلکا ہلکا ترشح ہو رہا ہو۔ اُس وقت میں بے ضرورت بھی شعر کہنے لگتا ہوں۔ یہ موسم مجھے ہر فصل سے زیادہ محبوب ہے۔ نشیات سے مجھے کبھی ذوق نہیں رہا۔ پان کھانا بھی چار سال سے متروک ہے۔ اب صرف حقہ یا سگرٹ خیالات کو یکسو کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ باقی شعر کہنے کے لئے مجھے کسی سامان کی ضرورت نہیں۔

دورِ موجودہ ۔۔۔ ۴۳ سال تک فکرِ سخن کرنے کے بعد اب شعر کہنے کا طریقہ یہ رہ گیا ہے۔ کہ جس وقت چاہتا ہوں، خلوت ہو یا جلوت، باغ ہو یا جنگل، ایوان ہو یا جھونپڑا، سمندر کا ساحل ہو یا کوہسار کی چوٹی سہری ہو یا تخت، کرسی ہو یا مسند کسی مصرع کو دو چار بار ذہن میں گردش دی اور خاموش بیٹھ گیا، دو منٹ کے بعد سامنے میں ڈھلے ڈھلائے شعر کاغذ پر برسنے لگتے ہیں۔ جن پر نظرِ ثانی کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اگر نظرِ ثانی کرتا ہوں تو شعر میں وہ الوہیت و بداہت نہیں رہتی۔ جو دماغ سے نکلے ہوئے پہلے شعر میں ہوتی ہے۔

جب آدھی رات کو بیدار کر کے بھی آپ مجھ سے کوئی غزل، نظم یا قطعۂ تاریخ، وغیرہ لکھوا سکتے ہیں تو پھر اب کیا بتاؤں کہ میں شعر کیونکر کہتا ہوں؟ بس یہ سمجھ لیجئے کہ دماغ مجسم شعر اور طبیعت یکسر شاعری بنکر رہ گئی ہے۔ اُدھر کسی فکر کا کوئی مصرع دماغ میں گونجا ادھر قلم سے اشعار برسنے لگے۔ ادھر نظم کے لئے کوئی عنوان یا موضوع سامنے آیا اُدھر ذہن نظم کا موزوں خاکہ کھینچنے لگا۔ بعض اوقات تو قطعاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا بول رہا ہے۔ اور بندہ لکھ رہا ہے۔

قصر الادب آگرہ
۱۴۔ دسمبر ۱۹۳۵ء

سیماب وارثی
اکبر آبادی

متروکات

زبان کی صفائی اور تحفظِ فصاحت کے لئے بعض متروکات کی پابندی لازمی ہے۔ چونکہ مجھ سے اکثر اس قسم کے استفسارات کئے جاتے ہیں۔ اس لئے جو الفاظ میں متروک کر چکا ہوں اُن کی ایک فہرست یہاں لکھ رہی ہے۔

الفاظ	تشریح	الفاظ	تشریح	الفاظ	تشریح
اَبھی اِبھی	بہ اسقاطِ ہائے ہوز	دم بسمل	بمعنی وقتِ ذبح	ایمان مریجان	خطاب بہ محبوب
اوپر	علی اور بر کا ترجمہ	دلا، ناصحا	بہ استثنائے ندا و ردعا	قران	بقافیہ پریشان
آخرش	بجائے "آخر"	دکھلا تبلا وغیرہ	بہ زیادتیِ لام	سدا	بمعنی ہمیشہ
آن کر	بجائے "آکر"	مت	حرفِ نفی	قدم دینا	بجائے قدم رکھنا
بل بے	کلمۂ تحسین	واں یاں	بجائے یہاں وہاں	ٹھہرنا	بجائے ہٹرنا۔
پر اور پہ	گر اور لیکن کے معنی میں	اس طرح پر اسی طرح سے	بجائے اس طرح	سو تلے	پس کی جگہ بجائے نیچے
پہنانا	بنانے کی جگہ	جب کامرادف		کاہے کو	بجائے کس لئے
تب	تک کامرادف	کیجے دیجیے	بجائے کیجئے دیجئے	کیسے	بجائے کیوں کر
جاناں جانا نہ	بہ انفراد	حضور	خطابِ محبوب	وصلت	بجائے وصل
خضر	بقافیۂ قمر	جناب	بجائے کیونکر	اعلانِ نون (بالاضافت)	قافیۂ معمولہ جیسے رگِ جان
دھرنا	رکھنا کامرادف	کیونکہ			خواہ ترکیبی ہو یا تحلیلی

مختارات

(۱) میں آغوش، نشاط، فکر، التماس، اور فاتحہ کو مونث کہتا ہوں۔

(۲) لفظ "غور" اور "نقاب" میرے یہاں مذکر ہے

(۳) جو الفاظ افرادی صورت میں مونث ہیں انکی جمع بھی مونث ہی لاتا ہوں۔ اور مذکر واحد کا تثنیہ بھی مذکر ہی کرتا ہوں۔

(۴) میں شعر میں قیدِ "ایطا" کا قائل نہیں لیکن احتیاط اولیٰ سمجھتا ہوں۔

(۵) "اور" بہ حذف واو لفظائے دادِ میرے یہاں جائز ہے۔

(۶) اٹھا، اُٹھے۔ رکھا۔ رکھے وغیرہ بغیر تشدید بھی میرے یہاں جائز ہے

فہرست غزلیاتِ "کلیمِ عجم"

نشیدِ نو

سنہ ۱۹۱۹ عیسوی تا سنہ ۱۹۳۵ عیسوی

نمبر سلسلہ	مطلع	تعداد اشعار	مقام تصنیف	تاریخ تصنیف	صفحہ
۱	عروسِ فطرت مری نگاہوں پہ چھا رہا ہے شباب تیرا	۱۱	آگرہ	دسمبر سنہ ۱۹۳۵ء	۱۷۹
۲	ایکہ تیرا وجود ہے آئینہ کائنات کا	۹	آگرہ	دسمبر سنہ ۱۹۳۵ء	۱۸۰
۳	اب کیا بتاؤں میں ترے ملنے سے کیا ملا	۱۰	مشاعرۂ مارہرہ	۵ اگست سنہ ۱۹۳۳ء	۱۸۱
۴	جاگ اور دیکھ ذرا عالمِ ویراں میرا	۱۳	مشاعرۂ کانپور	۱۶ جون سنہ ۱۹۲۳ء	۱۸۲
۵	جلوہ گاہِ دل میں مرتے ہی اندھیرا ہو گیا	۸	مشاعرۂ متھرا	۲۹ اکتوبر سنہ ۱۹۲۱ء	۱۸۲
۶	روزِ فراق ہر طرف اک انتشار تھا	۷	مشاعرۂ آگرہ	مئی سنہ ۱۹۱۹ء	۱۸۳
۷	سنا ہے حسن کا مستقبل مسلک وفا ہوگا	۷	آگرہ	جولائی سنہ ۱۹۳۳ء	۱۸۳
۸	فضائے گوشۂ دل میں تجھے جب جلوہ گر دیکھا	۱۲	مشاعرۂ میرٹھ	۲۴ نومبر سنہ ۱۹۲۶ء	۱۸۴
۹	دل ہے نظارۂ معجز سے حیراں کیا کیا	۷	مشاعرۂ ٹونک	۱۸ اگست سنہ ۱۹۲۵ء	۱۸۵
۱۰	ہم ہیں سرتاپا تمنا	۹	آگرہ	نومبر سنہ ۱۹۳۵ء	۱۸۶
۱۱	جب مرا ذوقِ نظر حسن آزما ہو جائے گا	۹	مشاعرۂ بھرتپور	۹ جون سنہ ۱۹۳۳ء	۱۸۶
۱۲	شکریہ ہستی کا لیکن تم نے یہ کیا کر دیا؟	۷	مشاعرۂ علی گڑھ	سنہ ۱۹۱۹ء	۱۸۷

نمبر سلسلہ	مطلع	تعداد اشعار	مقام تصنیف	تاریخ تصنیف	صفحہ
۱۳	جلوہ کوئی نگاہ میں باطل نہیں رہا	۹	بہرائچ	سنہ ۱۹۲۰ء	۱۸۷
۱۴	جب تک غم الفت کا عنصر نہ ملا ہوگا	۹	آگرہ	۲۲ر جون سنہ ۱۹۲۴ء	۱۸۸
۱۵	جو انتظار ترا وجہ اضطراب نہ تھا	۱۲	مشاعرۂ علیگڑھ	۱۵ر جون سنہ ۱۹۲۷ء	۱۸۹
۱۶	اے چیز ہی دل کو دیوانہ بنا دینا	۱۳	مشاعرۂ آگرہ	۲۶ر اگست سنہ ۱۹۳۴ء	۱۸۹
۱۷	ترے خیال سے بھی رسم و راہ کر نہ سکا	۱۲	دہلی	سنہ ۱۹۲۷ء	۱۹۰
۱۸	ہے کرم مجھ پر مگر ایسا کرم کس کام کا	۱۷	مشاعرۂ بڑودہ	۲۸ر دسمبر سنہ ۱۹۳۳ء	۱۹۱
۱۹	قفس سے چھوٹ کے بڑی دیر میں ٹھکانہ ملا	۱۳	مشاعرۂ کپورتھلہ	۱۸ر جون سنہ ۱۹۴۰ء	۱۹۲
۲۰	دامان سحر پر کندہ ہے اب تک رومان غم میرا	۹	آگرہ	سنہ ۱۹۳۳ء	۱۹۳
۲۱	ابھی درمان جنون غم پنہاں ہوتا	۱۵	مشاعرۂ آگرہ	۱۶ر فروری سنہ ۱۹۳۵ء	۱۹۴
۲۲	مرتب ہو کے اک محشر غبار دل سے نکلے گا	۱۳	مشاعرۂ رامپور	۳۰ر دسمبر سنہ ۱۹۲۷ء	۱۹۵
۲۳	مجھ سے پہلے کوئی جلوہ مگر دل نہ ہوا	۱۷	مشاعرۂ بمبئی	سنہ ۱۹۱۹ء	۱۹۶
۲۴	تو اب ان ہی سے بھی بیزار اے دل دیوانہ خو ہو جا	۱۰	مشاعرۂ دہلی	۳ر دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء	۱۹۷
۲۵	غم قید زندگی میں بھی صبر آزما ہوا	۱۳	مشاعرۂ آگرہ	۵ر نومبر سنہ ۱۹۳۳ء	۱۹۷
۲۶	مجبور التفات تغافل کسی کا تھا	۱۱	آگرہ	سنہ ۱۹۱۸ء	۱۹۸
۲۷	دل خوں گشتہ کو سیلاب بہ اماں دیکھے	۱۵	مشاعرہ آگرہ	۲۹ر مارچ سنہ ۱۹۲۶ء	۲۹۹
۲۸	رات کا جانا وداع شیشہ و پیمانہ تھا	۹	مشاعرۂ ٹونڈلہ	سنہ ۱۹۱۸ء	۲۰۰
۲۹	محروم تصور کر نہ دیا، مجبور تماشا کر نہ دیا	۹	آگرہ	نومبر سنہ ۱۹۳۵ء	۲۰۰
۳۰	دل اک قطرہ لہو ہے، یہ ہے اس کے سوا کیا	۱۱	آگرہ	نومبر سنہ ۱۹۳۵ء	۲۰۱
۳۱	آیا مری محفل میں غارتگر ہوش آیا	۹	آگرہ	دسمبر سنہ ۱۹۳۵ء	۲۰۳
۳۲	بقدر شوق اقرار وفا کیا	۱۱	آگرہ	دسمبر سنہ ۱۹۳۵ء	۲۰۳

نمبر سلسلہ	مطلع	تعداد اشعار	مقام تصنیف	تاریخ تصنیف	صفحہ
۳۳	ایک طوفاں تھا مگر کوزہ نشیں ہوتا رہا	۹	آگرہ	جون ۱۹۳۵ء	۲۰۳
۳۴	دل کی آنکھوں سے ترا میں نے نظارہ نہ کیا	۷	آگرہ	مئی ۱۹۳۴ء	۲۰۴
۳۵	زندانِ کائنات میں مقہور کر دیا	۵	آگرہ	نومبر ۱۹۳۵ء	۲۰۵
۳۶	سکوں پذیر جنونِ شباب ہو نہ سکا	۱۵	مشاعرۂ گوالیار	۲۸ فروری ۱۹۳۴ء	۲۰۵
۳۷	میں نے خاک میں مل کر منصب بقا پایا	۹	آگرہ	جنوری ۱۹۳۵ء	۲۰۶
۳۸	حریمِ گلستاں میں تو اگر ہو ہمنشیں میرا	۱۱	آگرہ	نومبر ۱۹۳۴ء	۲۰۷
۳۹	پھر مری تخیل کی زینت ہوا سے جانِ شباب	۹	آگرہ	نومبر ۱۹۳۵ء	۲۰۷
۴۰	کھل گیا آخر مرا رازِ نہانِ اضطراب	۱۱	احمد آباد	۱۹۲۲ء	۲۰۸
۴۱	تا نہ آنے پائے کوئی خواب میں بھی سوئے دوست	۱۲	مالیر کوٹلہ	دسمبر ۱۹۲۹ء	۲۰۹
۴۲	عشق خود مائلِ حجاب ہے آج	۷	آگرہ	۱۹۲۲ء	۲۱۱
۴۳	ہے حقیقت کی چمن کو جستجو میری طرح	۱۱	آگرہ	۱۹۳۳ء	۲۱۱
۴۴	جسم پھر بنتے ہیں صرف خاکداں ہونے کے بعد	۱۳	مشاعرۂ آگرہ	دسمبر ۱۹۲۵ء	۲۱۲
۴۵	محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر	۱۰	مشاعرۂ جہلم	۱۹ اپریل ۱۹۳۳ء	۲۱۳
۴۶	اُن کی نظروں تک رسائی اپنی مشکل دیکھ کر	۲۱	مشاعرۂ جموں	اکتوبر ۱۹۲۵ء	۲۱۳
۴۷	جو سالک ہے تو اپنے نفس کا عرفان پیدا کر	۱۱	بہاولپور	۱۹۲۲ء	۲۱۴
۴۸	بصیرت کو عطا کر وسعتیں جلوہ نما ہو کر	۱۳	مشاعرۂ بمبئی	۳۱ مارچ ۱۹۳۴ء	۲۱۶
۴۹	اک تہی دستِ طلب بے گوش ہے تیرے بغیر	۱۱	آگرہ	اکتوبر ۱۹۳۴ء	۲۱۷
۵۰	مجھے فکرِ وہر و فا ہے ہنوز	۹	آگرہ	۱۹۲۵ء	۲۱۷
۵۱	میری مرگِ نفس کی عمر دراز	۱۰	آگرہ	۱۹۲۶ء	۲۱۸
۵۲	دے اب تو مجھے نہ طعنۂ ہوش	۷	آگرہ	نومبر ۱۹۳۵	۲۱۹

نمبر سلسلہ	مطلع	تعداد اشعار	مقام تصنیف	تاریخ تصنیف	صفحہ
۵۳	اب اجتناب انہیں مجھ سے ہے بجائے خلوص	۸	آگرہ	۱۹۳۵ء	۲۱۹
۵۴	التفات ان کا مرے حال پریشاں کی طرف	۹	آگرہ	نومبر ۱۹۳۵ء	۲۲۰
۵۵	عشق ہے ہمنوائے حسن، حسن نوا نوازِ عشق	۸	لاہور	۱۹۲۶ء	۲۲۰
۵۶	نظر کو عجز رفعت ہے تجلی گاہِ جاناں تک	۱۱	مشاعرۂ آگرہ	۲۷ اکتوبر ۱۹۲۳ء	۲۲۱
۵۷	ہر سحر کو ہے ہر ہمرنگیٔ صبح فرنگ	۸	حیدرآباد دکن	۲۸ نومبر ۱۹۲۵ء	۲۲۱
۵۸	کھل گیا صبح سے پہلے درِ میخانۂ دل	۱۱	کلکتہ	۱۹۲۰ء	۲۲۲
۵۹	شبستاں میں ہو شمعِ پروانہ جیں تم	۱۷	مشاعرۂ ٹونک	۱۹ اگست ۱۹۲۵ء	۲۲۳
۶۰	اک تڑپ کہتے ہیں دل میں برقِ صد کاشانہ ہم	۱۳	مشاعرۂ لدھیانہ	۱۵ اگست ۱۹۳۱ء	۲۲۴
۶۱	تجلیاتِ حقیقت کا آئینہ ہوں میں	۱۰	مشاعرۂ لکھنؤ	۲۲ نومبر ۱۹۳۰ء	۲۲۵
۶۲	کر دو خبر امید کی منزل پہ گدا زمیں	۱۱	مشاعرۂ اٹاوہ	۲۴ فروری ۱۹۲۳ء	۲۲۶
۶۳	کام ممکن کوئی دورِ غم دوراں میں نہیں	۷	مشاعرۂ جلیسر	۲ مئی ۱۹۲۱ء	۲۲۷
۶۴	جو تھی خدوشِ ترا انتہا جلووں کے طوفاں میں	۱۷	مشاعرۂ جموں	اکتوبر ۱۹۲۵ء	۲۲۷
۶۵	دل میں سب کچھ ہے مگر اظہار کے قابل نہیں	۹	مشاعرۂ امراؤتی	۲۹ نومبر ۱۹۳۰ء	۲۲۹
۶۶	گوارا اتنی زحمت اڑنے والے کارواں کر لیں	۱۲	مشاعرۂ منظر نگر	۲۸ مارچ ۱۹۳۱ء	۲۳۰
۶۷	عزمِ فریاد! ابھی اے دلِ ناشاد نہیں	۱۳	مشاعرۂ علیگڑھ	۹ ستمبر ۱۹۲۸ء	۲۳۰
۶۸	اے رشک ہے یہ کیا انصافِ عاشقی میں	۱۴	مشاعرۂ آگرہ	۲۷ جنوری ۱۹۲۴ء	۲۳۱
۶۹	جس کو نہ تابِ ضبط ہو بارِ وفا اٹھائے کیوں	۱۱	مشاعرۂ آگرہ	۹ نومبر ۱۹۲۹ء	۲۳۲
۷۰	شکستہ پاؤں شریکِ سفر اپنے کارواں میں نہیں	۱۳	مشاعرۂ علیگڑھ	۲۹ نومبر ۱۹۲۷ء	۲۳۳
۷۱	نہیں آشنا مرے حال سے کوئی آنکھ بزمِ مجاز میں	۱۱	گجرات (پنجاب)	۱۹۲۸ء	۲۳۴
۷۲	جس جگہ جمع ترے خاک نشیں ہوتے ہیں	۱۴	مشاعرۂ دہلی	۲۹ نومبر ۱۹۲۹ء	۲۳۶

نمبر سلسلہ	مطلع	تعداد اشعار	مقام تصنیف	تاریخ تصنیف	صفحہ
۷۳	مستی شب ہائے ہستی کا فرا ملتا نہیں	۱۱	مشاعرۂ غازی آباد	۲۲ر اکتوبر ۱۹۲۷ء	۲۳۶
۷۴	مثل شبنم رائیگان عالم برباد ہوں	۱۲	حیدرآباد دکن	۲۸ر نومبر ۱۹۲۵ء	۲۳۷
۷۵	رفعت فہم سے انسان سرافراز نہیں	۱۱	مشاعرۂ آگرہ	۸ر مئی ۱۹۲۴ء	۲۳۸
۷۶	حد ہو کوئی تو صبر ترے ہجر پر کریں	۱۴	مشاعرۂ اجمیر شریف	۱۱ر دسمبر ۱۹۲۱ء	۲۳۹
۷۷	لایا ہوں ساتھ وحشت دیوانہ گر کو میں	۱۰	مشاعرۂ علیگڑھ	۲ر مئی ۱۹۲۴ء	۲۳۹
۷۸	شوق دیدار کا کیوں اُن سے اعادہ نہ کریں	۱۱	مشاعرۂ عظیم آباد	۲۹ر مارچ ۱۹۲۴ء	۲۴۰
۷۹	یہ کس ادا سے کرشمے دکھائے جاتے ہیں	۱۵	مشاعرۂ ڈبائی	۱۱ر مارچ ۱۹۳۴ء	۲۴۱
۸۰	جلوۂ صد رنگ سے نظریں پریشاں ہوگئیں	۱۵	مشاعرۂ آگرہ	۹ر فروری ۱۹۳۴ء	۲۴۲
۸۱	ازل سے تشنۂ صہبائے بیخودی ہوں میں	۹	آگرہ	نومبر ۱۹۳۵ء	۲۴۳
۸۲	جنوں کی نذر سالانا کا ساماں دیکھ لیتا ہوں	۱۱	آگرہ	نومبر ۱۹۳۵ء	۲۴۳
۸۳	دل کی بساط کیا تھی نگاہ جمال میں	۱۵	مشاعرۂ جے پور	۲۱ر اپریل ۱۹۳۵ء	۲۴۴
۸۴	وہ دل کہ جس میں محبت کا اضطرار نہیں	۱۱	مشاعرۂ بریلی	۱۹۳۵ء	۲۴۵
۸۵	محفل عشق میں جب نام ترا لیتے ہیں	۹	مشاعرۂ بنارس	۱۹۲۰ء	۲۴۶
۸۶	دامان عشق وادیٔ سینا سے کم نہیں	۱۳	منگول کا ٹھیاواڑ	۱۹۳۳ء	۲۴۶
۸۷	غم عشق سے سرگراں اور بھی ہیں	۱۱	آگرہ	اگست ۱۹۳۴ء	۲۴۷
۸۸	آؤ پھر گرمی دیار عشق میں پیدا کریں	۱۸	آگرہ	۱۹۳۵ء	۲۴۸
۸۹	نقاب جلوۂ مستور کا حجاب نہیں	۱۹	مشاعرۂ آگرہ	۳۰ر دسمبر ۱۹۳۵ء	۲۴۹
۹۰	پھر اپنے دل میں شورش شباب دیکھتا ہوں میں	۱۵	آگرہ	۱۹۳۲ء	۲۵۰
۹۱	کوئی کیف دل میں ہو نغمہ گر، تو سرود روح نواز ہو	۱۵	مشاعرۂ جموں	اگست ۱۹۲۵ء	۲۵۱
۹۲	برباد حسن ظن سے آباد خانہ ہو	۱۴	مشاعرۂ علی گڑھ	۲۷ر فروری ۱۹۳۲ء	۲۵۳

نمبر سلسلہ	مطلع	تعداد اشعار	مقام تصنیف	تاریخ تصنیف	صفحہ
۹۳	ہماری خانہ ویرانی پہ نے حیراں کیوں ہو	۱۷	مشاعرۂ میرٹھ	۲۶ مارچ ۱۹۳۰ء	۲۵۴
۹۴	رسماً ہی اُن کو نالۂ دل کی خبر تو ہو	۱۷	آگرہ	نومبر ۱۹۳۵ء	۲۵۵
۹۵	صبوحی لا کہ وقتِ صبح ہے اے پیرِ میخانہ	۹	مشاعرۂ دہلی	۱۹۱۸ء	۲۵۶
۹۶	نفس نفس ہے سراپردۂ بہار، نہ پوچھ	۹	آگرہ	۱۹۳۳ء	۲۵۶
۹۷	فرض کی دنیا ہے ساری دنیا یہاں وفا کا چلن نہیں ہے	۷	آگرہ	۱۹۳۳ء	۲۵۷
۹۸	تو بے حجاب ہے آئینہ تجھ کو تکتا ہے	۱۰	مشاعرۂ آگرہ	۱۱ نومبر ۱۹۲۲ء	۲۵۸
۹۹	اب اے بے درد کیا اس کے لئے ارشاد ہوتا ہے؟	۱۲	مشاعرۂ الہ آباد	۲۰ فروری ۱۹۳۳ء	۲۵۸
۱۰۰	ہستیٔ انساں بڑی صنعت کی اک تعمیر تھی	۱۳	مشاعرۂ آگرہ	۱۵ اپریل ۱۹۳۰ء	۲۶۰
۱۰۱	جلوہ ترا امکان سے باہر تو نہیں ہے	۷	مشاعرۂ ٹونک	۲۰ اکتوبر ۱۹۲۵ء	۲۶۱
۱۰۲	مری فطرت وفا ہے، دے رہا ہوں امتحاں پھر بھی	۹	مشاعرۂ بلند شہر	دسمبر ۱۹۳۱ء	۲۶۱
۱۰۳	وہ تنہائی ہو، محفل ہو، تسکیں دل کی مشکل ہے۔	۱۷	مشاعرۂ بردوہ	۲۸ دسمبر ۱۹۳۳ء	۲۶۲
۱۰۴	جگا نہ روح کو نغمہ نواز رہنے دے	۹	آگرہ	۱۹۳۳ء	۲۶۴
۱۰۵	پائے نفا میں لغزشِ مستانہ چاہئے	۱۳	مشاعرۂ فیروز پور	۱۹۲۵ء	۲۶۴
۱۰۶	وہ جب رنگِ پریشانی کو خلوت گیر دیکھیں گے	۱۰	حیدر آباد دکن	۱۷ دسمبر ۱۹۲۵ء	۲۶۵
۱۰۷	نہ وہ شورِ طور و کلیم ہے، نہ وہ زورِ برق و شرار ہے	۱۳	مشاعرۂ آگرہ	۳۰ جون ۱۹۲۳ء	۲۶۶
۱۰۸	کسی حد تک تو تقلید حرامِ یار ہو جائے	۱۸	مشاعرۂ الہ آباد	۱۷ نومبر ۱۹۳۳ء	۲۶۷
۱۰۹	بیٹھا تو عجزِ نقش کفِ پا لئے ہوئے	۱۰	آگرہ	اگست ۱۹۲۴ء	۲۶۸
۱۱۰	معصوم ہے وہ جلوہ لیکن یہ واقعہ ہے	۷	مشاعرۂ اٹاوہ	۹ دسمبر ۱۹۲۳ء	۲۶۹
۱۱۱	خالی نہیں جہاں میں کوئی تظارے سے	۱۶	مشاعرۂ گونڈہ (اودھ)	۱۶ مئی ۱۹۲۴ء	۲۷۰
۱۱۲	اک جہاں میرا شریکِ آرزو محفل میں ہے نظر صرفِ حقیقت ہو رہی ہے	۷ ۱۵	مشاعرۂ کانپور مشاعرۂ ٹونک	۲۳ اکتوبر ۱۹۲۴ء ۱۹۲۴ء	۲۷۱

نمبر سلسلہ	مطلع	تعداد اشعار	مقام تصنیف	تاریخ تصنیف	صفحہ
۱۱۳	تصویر ذہن میں نہیں تیرے جمال کی	۱۰	شاعرۂ آگرہ	۲۹ر جولائی ۱۹۲۳ء	۲۷۲
۱۱۴	ہم اُن کا جلوۂ برق انتساب دیکھیں گے	۱۱	شاعرۂ آگرہ	۱۹۲۳ء	۲۷۳
۱۱۵	اب وہاں دامن کشی کی فکر دامن گیر ہے	۱۲	شاعرۂ مین پوری	۲۷ر مئی ۱۹۲۳ء	۲۷۴
۱۱۶	مختلف ہیولوں میں اک مری تمنا تھی	۱۳	شاعرۂ علیگڈھ	۱۹۲۳ء	۲۷۴
۱۱۷	پرتو سے ہر نگاہ کو اک اضطراب ہے	۱۰	شاعرۂ آگرہ	۷ر جولائی ۱۹۲۳ء	۲۷۵
۱۱۸	بہار تیرے لئے وقف آرزو ہو جائے	۱۳	شاعرۂ آگرہ	۲۷ر اگست ۱۹۲۵ء	۲۷۶
۱۱۹	اللہ اللہ پردہ داری کا بھی کیا دستور ہے !	۹	شاعرۂ آگرہ	۲۳ر مارچ ۱۹۲۴ء	۲۷۷
۱۲۰	نہیں بنتی دل تنہا نشیں سے	۷	آگرہ	۱۹۲۹ء	۲۷۷
۱۲۱	وسعتیں محدود ہیں ادراک انساں کے لئے	۱۴	شاعرۂ گورکھپور	اگست ۱۹۲۴ء	۲۷۸
۱۲۲	ستمزاؤ پہ فطرت کا پھر آئینہ خانہ ہے	۱۳	شاعرۂ آگرہ	۲ر مارچ ۱۹۳۴ء	۲۷۹
۱۲۳	کارگر ہم اپنے اجزائے فغاں دیکھا کئے	۱۵	شاعرۂ آگرہ	۱۹۲۱ء	۲۷۹
۱۲۴	جو وقت نزع کو وقت درائے کارواں سمجھے	۱۴	شاعرۂ لکھنؤ	۲۵ر نومبر ۱۹۲۹ء	۲۸۰
۱۲۵	ہم اک دن جلتے جلتے خاکستر ہو جائیں گے	۱۰	شاعرۂ دہلی	۱۴ر دسمبر ۱۹۲۶ء	۲۸۲
۱۲۶	اگر بیزار پردہ طلعت جانانہ ہو جائے	۱۳	شاعرۂ فیروزآباد	ستمبر ۱۹۲۴ء	۲۸۳
۱۲۷	چمک جگنو کی برق بے اماں معلوم ہوتی ہے	۱۳	شاعرۂ آگرہ	۷ر فروری ۱۹۲۸ء	۲۸۴
۱۲۸	ناوق شکایت غم دنیا کرے کوئی	۱۰	شاعرۂ لاہور	۲۲ر نومبر ۱۹۲۸ء	۲۸۴
۱۲۹	دو ہفتہ ہے مرا جو تیری آنکھوں سے برستی ہے	۱۷	شاعرۂ آگرہ	۵ر جون ۱۹۲۹ء	۲۸۵
۱۳۰	دنیا کہ ایک شعبدۂ اعتبار ہے	۱۱	شاعرۂ آگرہ	۲۲ر نومبر ۱۹۲۹ء	۲۸۷
۱۳۱	سُننے والا ہو تو دنیا مطلقاً الہام ہے	۱۴	شاعرۂ مظفرنگر	۱۹۲۹ء	۲۸۸
۱۳۲	آپ نے بھی کہدیا سودائی محفل مجھے	۱۴	شاعرۂ مین پوری	۲۷ر اپریل ۱۹۳۰ء	۲۸۹

نمبر سلسلہ	مطلع	تعداد اشعار	مقام تصنیف	تاریخ تصنیف	صفحہ
۱۳۳	دل ہے تو کسی کا اسے کاشانہ بنا دے	۱۳	مشاعرۂ ڈبائی	۲۸ر دسمبر ۱۹۲۹ء	۲۸۹
۱۳۴	مدتیں گذری ہیں ساقی دعوتِ سینا کئے	۷	لکھنؤ	نومبر ۱۹۳۰ء	۲۹۰
۱۳۵	جرس ہی کاروانِ اہلِ عالم میں فغاں میری	۱۶	مشاعرۂ ڈیرہ دون	۱۳ر دسمبر ۱۹۳۰ء	۲۹۱
۱۳۶	شوق کے نغمے نہ تھے آوازِ سازِ دل نہ تھی	۱۲	مشاعرۂ مظفرنگر	۲۹ر مارچ ۱۹۳۱ء	۲۹۲
۱۳۷	کوئی کیا مضرِبِ موسیٰ کا ہو امیدوار اب بھی	۱۳	مشاعرۂ آگرہ	۲۷ر مارچ ۱۹۳۳ء	۲۹۲
۱۳۸	محو ہو کر بے نیازِ ما سوا ہو جائیے	۱۴	مشاعرۂ آگرہ	۱۳ر اگست ۱۹۳۲ء	۲۹۳
۱۳۹	لگی دل کی بھڑک اٹھی ہے داغ کہنہ دل سے	۱۴	مشاعرۂ ڈبائی	۳۱ر دسمبر ۱۹۳۱ء	۲۹۴
۱۴۰	سر میں سودائے جنوں، طوفان چشمِ تر میں ہے	۱۵	مشاعرۂ کاندھلہ	۲۸ر اکتوبر ۱۹۳۳ء	۲۹۵
۱۴۱	سرگشتۂ و خراب بہار و خزاں رہے	۱۵	مشاعرۂ میرٹھ	۲۱ر اکتوبر ۱۹۳۳ء	۲۹۶
۱۴۲	آنسوؤں میں حسن کی شمعیں فروزاں کیجئے	۱۳	مشاعرۂ کانپور	۲و۳ر دسمبر ۱۹۳۳ء	۲۹۷
۱۴۳	ایک نازک سی نظر کو دل میں مہماں کیجئے	۱۰	〃	〃	۲۹۸
۱۴۴	آ، مرے غمکدے میں ساز و فا لئے ہوئے	۱۳	مشاعرۂ چھپوٹ	۴ر جولائی ۱۹۳۳ء	۲۹۸
۱۴۵	عشق میں بھی حسن کا انداز ہونا چاہئے	۱۳	مشاعرۂ آگرہ	۱۳ر اگست ۱۹۲۳ء	۲۹۹
۱۴۶	محوِ کیمیائی حسنِ جاوداں ہو جائیے	۹	بریلی	۱۹۳۱ء	۳۰۰
۱۴۷	ادراک خود آشنا نہیں ہے	۹	مشاعرۂ ٹونک	۲۶ر دسمبر ۱۹۲۴ء	۳۰۱
۱۴۸	آیئے بزمِ وفا کے ساز و ساماں دیکھئے	۱۸	مشاعرۂ الہ آباد	۱۱ر فروری ۱۹۳۴ء	۳۰۱
۱۴۹	نزل خود آئے دعوتِ منزل لئے ہوئے	۲۲	مشاعرۂ جین (مالوہ)	۵ر مئی ۱۹۳۴ء	۳۰۲
۱۵۰	ختم اس طرح نزاعِ حق و باطل ہو جائے	۱۵	مشاعرۂ آگرہ	۱۵ر فروری ۱۹۳۵ء	۳۰۴
۱۵۱	دل اور نفس کی یکجائی سازگار نہیں ہے	۱۱	آگرہ	دسمبر ۱۹۳۵ء	۳۰۵
۱۵۲	بھر پور سب کی نظر نہیں ہے	۱۱	فتحگڈھ	۱۹۳۱ء	۳۰۵

نمبر سلسلہ	مطلع	تعداد اشعار	مقام تصنیف	تاریخ تصنیف	صفحہ
۱۵۳	حسن کو اے خدائے حسن فطرت بیقرار دے	۱۱	آگرہ	نومبر ۱۹۳۵ء	۳۰۶
۱۵۴	ساقی ہوا بیگانہ، بیگانے سے کیا کہتے	۷	شملہ	۱۹۳۰ء	۳۰۷
۱۵۵	افسوس گذر گئی جوانی	۹	آگرہ	۱۹۳۴ء	۳۰۷
۱۵۶	ہوا اسیر تو کیوں انتظار میرے لئے ہے	۱۱	آگرہ	دسمبر ۱۹۳۵ء	۳۰۸
۱۵۷	سجدوں پہ میرے طعنہ طرازی	۷	خیر پور میرس	۱۹۳۰ء	۳۰۹
۱۵۸	اے خاک کے پتلے تجھے ادراک نہیں ہے	۱۱	امرتسر	فروری ۱۹۲۵ء	۳۰۹
۱۵۹	خود اُٹھ کے میرے ہاتھ گریباں میں آگئے	۱۱	آگرہ	ستمبر ۱۹۳۵ء	۳۱۰
۱۶۰	دل تیرے تغافل سے خبردار نہ ہو جائے	۹	گورکھپور	۱۹۲۴ء	۳۱۰
۱۶۱	مجھے عمر رفتہ کی پھر آرزو تھی	۱۱	آگرہ	۱۹۳۵ء	۳۱۱
۱۶۲	حجاب حسن سے ہونا ہے آشکارا مجھے	۱۲	مشاعرۂ اورئی	۱۵ جون ۱۹۳۵ء	۳۱۲
۱۶۳	حیران جمال ہے خدائی	۱۱	سورت	۱۹۳۳ء	۳۱۳
۱۶۴	نشاط بزم عالم زندگی کے کیف و کم تک ہے	۱۱	آگرہ	دسمبر ۱۹۳۵ء	۳۱۳
۱۶۵	ہے وقف جہاں فکر میخانہ کشا میری	۷	ناگپور اسٹیشن	۱۹۳۳ء	۳۱۴
۱۶۶	اپنی نگاہ ناز کو جرأت بے رخی نہ دے	۱۱	آگرہ	دسمبر ۱۹۳۵ء	۳۱۴
۱۶۷	آنسوؤں سے نہ دل کی آگ دبی	۹	سہارن پور	فروری ۱۹۳۵ء	۳۱۵
۱۶۸	گیا موسم ابھی تک نقش دیوانہ نہیں اُٹھی	۱۱	آگرہ	دسمبر ۱۹۳۵ء	۳۱۶
۱۶۹	تیری دنیا ہے دنیا الٰہی مگر، مطمئن ذہن دنیا نہیں ہے	۱۵	آگرہ	دسمبر ۱۹۳۵ء	۳۱۶
۱۷۰	اب کہاں وہ گرمی محفل مجاز ہے	۱۱	آگرہ	دسمبر ۱۹۳۵ء	۳۱۸
۱۷۱	بھولی ہوئی یاد آئی کہانی، ہائے محبت ہائے جوانی!	۱۱	آگرہ	جنوری ۱۹۳۵ء	۳۱۹
۱۷۲	تضمین	۸ بند	۰	۰	۳۲۱

نمبر سلسلہ	مطلع	تعداد اشعار	مقام تصنیف	تاریخ تصنیف	صفحہ
۱۷۳	مثلث	۱۱ شعر	۰	۰	۳۲۴
۱۷۴	مثلث	۱۵ شعر	۰	۰	۳۲۵
۱۷۵	مثلث	۱۵ شعر	۰	۰	۳۲۷

بادۂ دوشیں

۱۹۰۹ عیسوی تا ۱۹۱۸ عیسوی

۱۷۶	اس انجمن میں جو عزم ظہور تو نے کیا	۹	آگرہ	۱۹۱۸ء	۳۳۱
۱۷۷	اب تو یہ حال ہے نظر سوگوار کا	۸	آگرہ	۲۲ اپریل ۱۹۱۸ء	۳۳۲
۱۷۸	مذاقِ درد پسندی مرا شعار ہوا	۷	اجمیر شریف	۱۹۱۶ء	۳۳۲
۱۷۹	معجزۂ حسن تخیل کا نمایاں ہو گیا	۹	مشاعرۂ فیروز آباد	۱۹۱۷ء	۳۳۳
۱۸۰	جنت جو لے لاکر میخانے میں رکھ دینا	۵	متھرا	نومبر ۱۹۱۸ء	۳۳۳
۱۸۱	غم میں اُلجھا کر طریق عشق مشکل کر دیا	۷	آگرہ	۱۹۱۰ء	۳۳۳
۱۸۲	خاک سے پاکے نمو، خاک میں پنہاں ہونا	۷	اندور	۱۹۱۸ء	۳۳۴
۱۸۳	بیٹھ کر بزم میں مسرور مرا دل نہ ہوا	۷	مشاعرۂ بمبئی	۱۹۱۶ء	۳۳۴
۱۸۴	مرا دل ہو ترے جلووں کی خلوت میں نہ سمجھا تھا	۵	مشاعرۂ میرٹھ	۰	۳۳۵
۱۸۵	شوقِ جمالِ دوست جو حد سے سوا دیا	۷	مشاعرۂ گونڈلہ	۱۶ جنوری ۱۹۱۷ء	۳۳۵

نمبر سلسلہ	مطلع	تعداد اشعار	مقام تصنیف	تاریخ تصنیف	صفحہ
۱۸۶	لازم آیا انہیں پابند حیا ہو جانا	۷	اجمیر شریف	سنہ ۱۹۰۸ء	۳۳۶
۱۸۷	شرارہ میری آہِ آتشیں کا	۵	کانپور	سنہ ۱۹۰۹ء	۳۳۶
۱۸۸	تھے مجھ میں ترے جلوے، ایسا بھی ہوا ہوتا	۷	اجمیر شریف	۰	۳۳۷
۱۸۹	کاروانِ غم کا مقصودِ نظر اچھا رہا	۷	آگرہ	سنہ ۱۹۰۸ء	۳۳۷
۱۹۰	تجھے ہم نے جو اپنا دوست اے بیداد گر جانا	۷	شکوہ آباد	سنہ ۱۹۱۶ء	۳۳۸
۱۹۱	جی بہل جاتا ہے دل کے داغِ حرماں دیکھ کر	۹	بھوپال	۰	۳۳۸
۱۹۲	فصلِ گل ہو جمع ہیں گلشن میں سامانِ بہار	۵	ٹونک	۰	۳۳۹
۱۹۳	نہ رکھنا پاؤں بھولے سے کہیں گورِ غریباں میں	۹	مشاعرۂ علی گڑھ	۲۷ جولائی سنہ ۱۹۱۵ء	۳۳۹
۱۹۴	کلیم وادیٔ جاں ہوں خلیل کعبۂ دل ہوں	۷	اجمیر شریف	سنہ ۱۹۰۸ء	۳۴۰
۱۹۵	جتنے ستم کئے تھے تجھے کسی نے عتاب میں	۹	آگرہ	سنہ ۱۹۱۲ء	۳۴۰
۱۹۶	حشر میں آہ و اثر کے درمیاں کوئی نہیں	۷	آگرہ	سنہ ۱۹۱۵ء	۳۴۱
۱۹۷	بڑی مشکل سے کچھ تسکین کے پہلو نکلتے ہیں	۵	آگرہ	سنہ ۱۹۱۶ء	۳۴۱
۱۹۸	کوئی چمن نہیں ایسا جہاں بہار نہیں	۹	آگرہ	سنہ ۱۹۱۷ء	۳۴۲
۱۹۹	مجھے رسوائیاں کیوں قبر سے لے آئیں محشر میں	۱۳	مشاعرہ مراد گوالیار	۰	۳۴۲
۲۰۰	دل کہاں جب دل میں حسرت ہی نہیں	۷	مشاعرہ علیگڈھ	سنہ ۱۹۱۸ء	۳۴۳
۲۰۱	کیا سئی عشق، عشق کے قابل تو کوئی ہو	۷	آگرہ	سنہ ۱۹۱۷ء	۳۴۳
۲۰۲	اہلِ دل سے نام کا پردہ ہی یا پردے میں ہو		سکندرہ راؤ	۲۳ اکتوبر سنہ ۱۹۱۸ء	۳۴۴
۲۰۳	وہ کن لفظوں میں صرفِ التجا ہو	۹	ٹونک	۲۶ دسمبر سنہ ۱۹۱۸ء	۳۴۵
۲۰۴	دل کو اُس کی یاد سے آباد رکھ	۷	مشاعرۂ دہلی	۱۹ جولائی سنہ ۱۹۱۵ء	۳۴۵
۲۰۵	ڈھونڈ اے فطرت کسی کو دلربائی کے لئے	۷	مشاعرۂ علیگڑھ	سنہ ۱۹۱۸ء	۳۴۶

نمبر سلسلہ	مطلع	تعداد اشعار	مقام تصنیف	تاریخ تصنیف	صفحہ
۲۰۶	پسپارہ الفت میں تدبیر نظر آئی	۷	.	.	۳۴۶
۲۰۷	یہ تصور کو شیاں ہیں خاطر دلگیر کی	۱۱	مشاعرۂ فیروز آباد	۵ راگست سنہ ۱۹۱۰ء	۳۴۷
۲۰۸	رہی بالا نشیں افتادہ میری	۸	.	.	۳۴۷
۲۰۹	وفا کی میں نے بنیاد آج زیر آسماں رکھدی	۹	مشاعرۂ غازی آباد	سنہ ۱۹۱۸ء	۳۴۸
۲۱۰	اب کیا بتائیں عمر وفا کیوں خراب کی	۱۰	مشاعرۂ ٹونڈلہ	۱۹ر جولائی سنہ ۱۹۱۸ء	۳۴۹
۲۱۱	نوائے درد شام غم نہ کیوں اندوہ گیں ہوتی	۷	مشاعرۂ غازی آباد	سنہ ۱۹۱۸ء	۳۴۹
۲۱۲	کشش دل انہیں چلن میں تولے آئی ہے	۵	آگرہ	سنہ ۱۹۱۲ء	۳۵۰
۲۱۳	وہ دن آئے کہ حیران رنج رعنا کرے کوئی	۱۳	مشاعرۂ آگرہ	۲۴ر نومبر سنہ ۱۹۱۴ء	۳۵۰
۲۱۴	کب تک دل مایوس کو برباد کریں گے	۵	آگرہ	۲۹ر مئی سنہ ۱۹۱۸ء	۳۵۱
۲۱۵	محبت میں خودی حد جہان بے خودی ہوگی	۱۱	آگرہ	۱۰ر جولائی سنہ ۱۹۱۵ء	۳۵۱
۲۱۶	جدھر دیکھو ادھر جنت میں حسن جاودانی ہے	۱۱	مشاعرۂ علی گڑھ	سنہ ۱۹۱۵ء	۳۵۲
۲۱۷	واقف ہو کوئی مرے حال تباہ سے	۱۵	مشاعرۂ علی گڑھ	۱۶ر اگست سنہ ۱۹۱۰ء	۳۵۳
۲۱۸	حیرت جلوہ گری مہر لب خاموش ہے	۹	آگرہ	سنہ ۱۹۱۱ء	۳۵۴
۲۱۹	کیوں ہنسی تو اے اجل فانی اگر سمجھا مجھے	۱۲	مشاعرۂ علی گڑھ	۱۰ر جون سنہ ۱۹۱۶ء	۳۵۴
۲۲۰	موجزن کیا آفتاب صبح پیمانے میں ہے	۹	مشاعرۂ فیروز آباد	۲ر مئی سنہ ۱۹۱۸ء	۳۵۵
۲۲۱	اس درجہ شغل روح تری بندگی رہی	۸	ٹونک	۸ر اکتوبر سنہ ۱۹۱۵ء	۳۵۶
۲۲۲	موجوں میں نفس کی جو تری یاد بھری ہے	۷	بنارس	سنہ ۱۹۱۱ء	۳۵۶
۲۲۳	حشر میں بھی ستم حسن کی پرسش نہ ہوئی	۷	کلکتہ	سنہ ۱۹۱۰ء	۳۵۷
۲۲۴	حسن کے دل میں جگہ پاتے ہی دیوانہ بنے	۱۱	رام پور	سنہ ۱۹۱۳ء	۳۵۷
۲۲۵	موج ناتمام	۱۴	.	.	۳۵۹

صہبائے کہن

سنہ ۱۸۹۸ عیسوی تا سنہ ۱۹۰۸ عیسوی

نمبر سلسلہ	مطلع	تعداد اشعار	مقام تصنیف	تاریخ تصنیف	صفحہ
۲۲۶	گھر ایوں میں روح کی عالم ہے نور کا	۷	اجمیر شریف	سنہ ۱۹۰۰ء	۳۶۳
۲۲۷	نامہ کوئی گیا نہ کوئی نامہ بر گیا	۹	مشاعرۂ بلند شہر	۲۲ر اپریل سنہ ۱۸۹۹ء	۳۶۳
۲۲۸	ہلکا سا اک کفن ہو شہید بہار کا	۸	آگرہ	سنہ ۱۸۹۸ء	۳۶۴
۲۲۹	پرتو سے تیرے رخ کے یہ رنگ ہے چمن کا	۷	مشاعرۂ آگرہ	سنہ ۱۹۰۲ء	۳۶۴
۲۳۰	تری ٹھوکروں میں ظالم جو مرا مزار ہوتا	۷	آگرہ	سنہ ۱۹۰۱ء	۳۶۵
۲۳۱	دل تڑپ جائے نہ کیوں دیکھ کر الٹانوں کا	۷	مشاعرہ آگرہ	سنہ ۱۹۰۱ء	۳۶۵
۲۳۲	دل کی نوائے راز میں ہوں ترجمانِ غیب	۵	کان پور	سنہ ۱۹۰۰ء	۳۶۶
۲۳۳	دل سے ساقی نے مٹایا قلقِ جامِ شراب	۵	اجمیر شریف	سنہ ۱۹۰۵ء	۳۶۶
۲۳۴	ساقیا دے مجھے وہ جام و لائے وارثؒ	۷	دیوہ شریف	سنہ ۱۸۹۹ء	۳۶۷
۲۳۵	منظور اُن کو مشقِ خدنگِ نظر ہے آج	۷	اجمیر شریف	سنہ ۱۹۰۶ء	۳۶۷
۲۳۶	دے نئی بھر کر مجھے ساغرِ میں روح	۷	اجمیر شریف	سنہ ۱۹۰۵ء	۳۶۸
۲۳۷	بھولے سے جس نے کی نہ دلِ مبتلا کی یاد	۶	اجمیر شریف	سنہ ۱۹۰۶ء	۳۶۸
۲۳۸	یہ کیا جانے میں جانا ہے کہ جاتے ہو خفا ہو کر	۷	مشاعرۂ آگرہ	۲۲ر جولائی سنہ ۱۹۰۸ء	۳۶۹
۲۳۹	مجھے پسند نہ کیوں آئے صحنِ صاف قفس	۱۰	اجمیر شریف	سنہ ۱۹۰۷ء	۳۷۰

نمبر سلسلہ	مطلع	تعداد اشعار	مقام تصنیف	تاریخ تصنیف	صفحہ
۲۴۰	رنگ یوں اپنا حسینوں میں جما دیتے ہیں	۸	مشاعرۂ آگرہ	سنہ ۱۹۰۸ء	۳۷۰
۲۴۱	چمن میں صبح کے انوار سے برسی نمو برسوں	۱۳	مشاعرۂ سکندرہ راؤ	۸ رجولائی سنہ ۱۹۰۸ء	۳۷۱
۲۴۲	شاید جگہ نصیب ہو اس گل کے ہار میں	۱۰	مشاعرۂ علی گڑھ	۰	۳۷۲
۲۴۳	ہوں تجلّیٔ رخِ یار کے حیرانوں میں	۹	مشاعرۂ آگرہ	۲۴ رجون سنہ ۱۹۰۰ء	۳۷۲
۲۴۴	خراب فتنۂ بیدادِ یار ہم بھی ہیں	۵	کانپور	سنہ ۱۹۰۰ء	۳۷۳
۲۴۵	مست کر کے نگہِ ہوشربا نے مجھ کو	۵	کانپور	سنہ ۱۹۰۰ء	۳۷۳
۲۴۶	صبر و شکیب بھی تھے دلِ بیخبر کے ساتھ	۵	کانپور	سنہ ۱۸۹۹ء	۳۷۳
۲۴۷	تم مرے پاس رہو پاس ملاقات رہے	۵	لکھنؤ	سنہ ۱۸۹۹ء	۳۷۴
۲۴۸	کٹ چکی فرقت کی رات آرام سے	۸	کانپور	سنہ ۱۹۰۱ء	۳۷۴
۲۴۹	تلافیٔ غم حاصل کی تم نے خوب کہی	۷	اجمیر شریف	سنہ ۱۹۰۸ء	۳۷۵
۲۵۰	رفتہ رفتہ وہ مرے جینے کا ساماں ہو گئے	۷	مشاعرۂ خورجہ	سنہ ۱۹۰۸ء	۳۷۵
۲۵۱	جو تھا برتاؤ دنیا کا وہی اس نے کیا مجھ سے	۱۱	آگرہ	سنہ ۱۹۰۵ء	۳۷۶
۲۵۲	کسے فکرِ آسائشِ زندگی ہے	۷	اجمیر شریف	سنہ ۱۹۰۸ء	۳۷۶
۲۵۳	قدم لے جلدائے دستِ دعا بڑھ حوصلہ کر کے	۹	مشاعرۂ آگرہ	۰	۳۷۷
۲۵۴	سیہ روزی کا یہ عالم زمانے سے نرالا ہے	۶	اجمیر شریف	سنہ ۱۹۰۷ء	۳۷۸
۲۵۵	محتاجِ عبادت کرمِ یار نہیں ہے	۷	اجمیر شریف	سنہ ۱۹۰۸ء	۳۷۸
۲۵۶	رسم اُن سے محبت کی ادا بھی نہیں ہوتی	۷	مشاعرۂ بمبئی	سنہ ۱۹۰۲ء	۳۷۹
۲۵۷	امتحاناً ہی وہ مجبورِ فغاں کر دیکھتے	۹	اجمیر شریف	سنہ ۱۹۰۷ء	۳۷۹
۲۵۸	طاقوں میں جگمگاتے ہیں شیشے شراب کے	۱۱	اجمیر شریف	سنہ ۱۹۰۸ء	۳۸۰
۲۵۹	دل کے بہلانے کا وحشت میں ہو ساماں کوئی	۷	مشاعرۂ علیگڑھ	۲۹ اگست سنہ ۱۹۰۸ء	۳۸۱

نمبر سلسلہ	مطلع	تعداد اشعار	مقام تصنیف	تاریخ تصنیف	صفحہ
۲۶۰	کر غور رنگ و بو کے احساس سے گذر کے	۹	مشاعرۂ آگرہ	۰	۳۸۱
۲۶۱	جلوہ جو تیرے حسن کا نالے میں ہے مرے	۷	آگرہ	سنہ ۱۹۰۸ء	۳۸۲
۲۶۲	کون کہتا ہے کہ قفنے نزا اُٹھاتے چلئے	۸	آگرہ	سنہ ۱۹۰۶ء	۳۸۲
۲۶۳	تری لے چارہ گر حیرت بجا معلوم ہوتی ہے	۵	مشاعرۂ فیروز آباد	۰	۳۸۳
۲۶۴	شور پیدائی کی دیوانو ضرورت کیا ہے	۷	آگرہ	۰	۳۸۳
۲۶۵	اب اس کا فضل میرا، رحمتیں میری، عطا میری	۶	مشاعرۂ علی گڑھ	۰	۳۸۳
۲۶۶	کسی مرد وفا کا کوچ ہے پھر اپنے مسکن سے	۵	عظیم آباد (پٹنہ)	۰	۳۸۴
۲۶۷	ہمیں تو یوں بھی نہ جلوے ترے نظر آئے	۱۰	اجمیر شریف	سنہ ۱۹۰۹ء	۳۸۵
۲۶۸	کسقدر شام شب غم تھی پریشانی مجھے	۹	مشاعرۂ بدایوں	۰	۳۸۵
۲۶۹	کیوں نظر بند کوئی پردۂ حائل میں رہے	۷	اجمیر شریف	۰	۳۸۶
۲۷۰	اس درجہ ہوش بھکے جام شراب پی کے	۷	مشاعرۂ ٹونڈلہ	۰	۳۸۶
۲۷۱	شب غم اے مرے اللہ بسر بھی ہوگی!	۷	آگرہ	۰	۳۸۷
۲۷۲	جرعات	۱۴۳	۰	۰	۳۸۸

صحت نامۂ حصۂ نظم

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۰۲	۵	کہیں سے در جا تم رکف	کہیں ہے جام در کف
۲۲۳	۹	کھلے	کھلے
۲۵۳	۱۱	عالم سکون	عالم سکوں
۲۵۶	۲	شمع زندگی	شمع زندگی
۳۱۱	۱	انان	انساں
۳۱۸	۱۶	ظاہر و نان	ظاہر و نہاں
۳۲۸	۱۶	وہی پہلا	نہیں ہے لا
۳۳۸	۱۲	دل کا	اپنے
۳۴۹	۱۰	نگہ	نگہ
۳۶۸	۱	سلۂ	سلسلہ
۳۷۴	۱	دعدہ	وعدہ
۳۸۵	۷	میرے سامنے	تیرے سامنے
۳۹۸	۱۰	وو	وہ

صحت نامۂ خطباتِ شاعری

اس صحت نامے سے کتاب کی غلطیاں قبلِ مطالعہ صحیح کر لیجئے

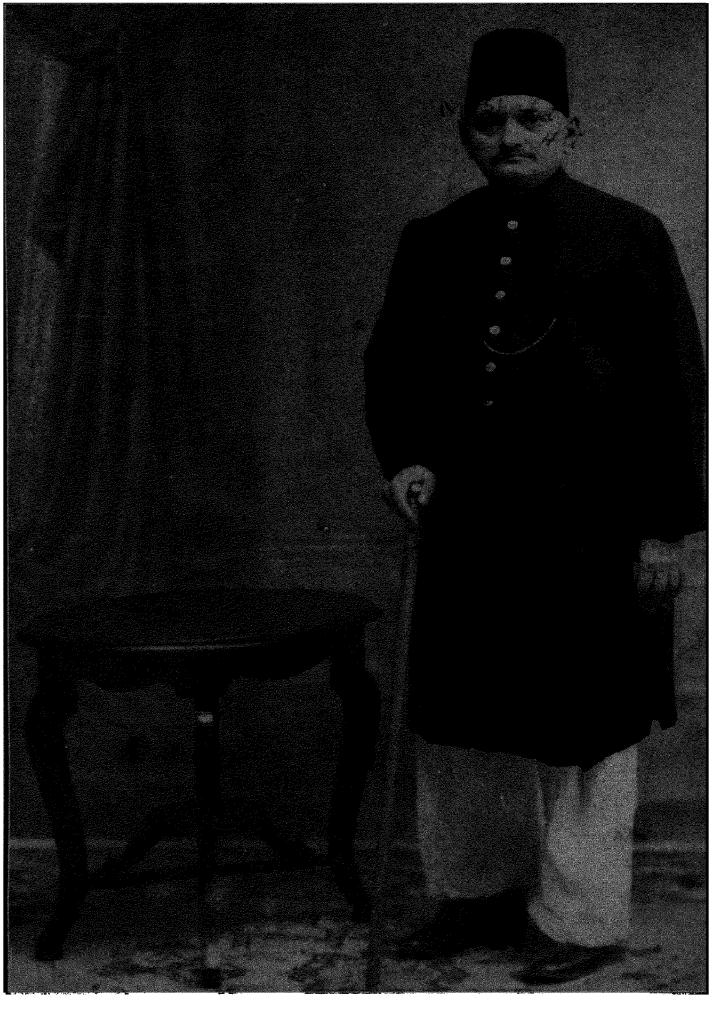
صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۰	۱	قالین	قالیں
۱۰	۶	غیر متاثر	غیر شاعر
۱۰	۱۲	تین	سُنین
۱۱	۱۳	بطور واضح کر دینا چاہتا ہوں	واضح کر دینا چاہتا ہوں
۱۲	آخری سطر	مخلوطِ زبان	مخلوط زبان
۱۷	۳	زمالے	زمانے
۲۰	۱۲	حکومت	حکومت
۳۰	۱۵	ادنی	ادبی
۳۲	۱	کبھی "ورن" یعنی الفاظ	کبھی "ورن" یعنی الفاظ
۴۸	۲۱	شاگرِ رشید	شاگردِ رشید
۵۲	۷	نقس	قفس
۸۹	۳	محررہ دسمبر ۱۹۳۵ء	محررہ دسمبر ۱۹۳۳ء
۱۰۳	۴	۲ردسمبر ۱۹۳۵ء	۲ردسمبر ۱۹۳۳ء
۱۱۶	۹	شاعرے	مشاعرے
۱۱۹	۱۲	کارروان	کاروان
۱۲۳	۱۰	مہتم باشان	مہتم باشاں
۱۲۶	۱۴	کرتے رہیں	کرتی رہیں
۱۲۹	۱۸	غیر مفید ہوں لی	غیر مفید لیکن
۱۲۹	۲۰	کون لون	کون کون
۱۳۱	۱	کہ ں مشاعرون	کہ ان مشاعرون
۱۳۸	۳	متقدت	متقدات
۱۳۸	۵	سیاسی مصاح	سیاسی مصالح
۱۴۰	۳	متاثر	متاثر
۱۵۲	۵	مادر المثال	نادر المثال
۱۵۴	۹	صوفیالے	صوفیانے
۱۵۴	۱۶	سبھا جاتا	سمجھا جائے
۱۵۵	۲	شارۂ الیہ	مشارٌ الیہ
۱۶۲	۶	تیل کا چراغ	تیل کے چراغ
۱۶۶	۳	۱۸۹۸ء	۱۹۱۳ء
۱۶۶	۸	مغفرت کر کے	مغفرت کرے
۱۶۹	۲	عزیز الخطب	عزیز الخطب
۱۷۱	۷	علی اور برکا ترجمہ	علی اور برکا ترجمہ

نشیرِ نو

سنہ ۱۹۱۹ء تا سنہ ۱۹۳۵ء

برقِ ایمن را صلائے بازگشت
آنچہ موسیٰؑ کرد ما ہم می کنیم

نیاب



سهاب اکبر آبادی بعمر ۵۵ سال-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نشیدِ نو

عروسِ فطرت، مری نگاہوں پہ چھا رہا ہے شباب تیرا
لطیف پردوں سے چھن رہا ہے جمالِ زیرِ نقاب تیرا
زوال سے اور نیند سے بے نیاز و بے احتیاج ہے تو
حدوث کی خفتہ کاریوں میں ہوا ہے تقسیم خواب تیرا
اگرچہ صبر آزما بہت ہے تری خموشی و پردہ داری
مگر ہے دامن کشِ عقیدت سکوت تیرا حجاب تیرا
جلال و جبروت نے لگا دی ہے مُہرِ حیرت زبان و لب پر
جبال و صحرا کے ذہن میں ہے اشارۂ انقلاب تیرا
غمِ عذاب و ثواب کیسا؟ یہ دونوں تیری ہی نعمتیں ہیں

نہ اختیاری کرم ہے تیرا، نہ اختیاری عتاب تیرا
ترے جلال و جمال ہی سے ہے اعتدالِ مزاجِ عالم
کبھی غضب بے پناہ تیرا، کبھی کرم بے حساب تیرا
نہ حسن پرتو سے تیرے خالی، نہ بے نیازِ آب و رنگ تھے
تمام کافر جوانیوں پر برس رہا ہے شباب تیرا
تو محوِ آرائشِ مسلسل ہے اپنے جلووں کی انجمن میں
اک آئینہ ماہتاب تیرا، اک آئینہ آفتاب تیرا
مری رسائی سے دور ہی تو، مگر ابھی تجھ کو یاد ہو گا
کہ میں نے ایمن کی وادیوں میں الٹ دیا تھا نقاب تیرا
جبیں سے دل تک بھری ہوئی ہے خلش ترے عشقِ جاں گداز کی
ترے ارادے کو ہو مبارک، کہ درد ہے کامیاب تیرا
ہے روحِ سیماب ساز تیرا، تو سوز بن کر نہاں ہے اس میں
تڑپ رگِ جاں میں ہے یہ کس کی؟ اگر نہیں اضطراب تیرا

ایک ترا وجود ہے آئینہ کائنات کا — ذوقِ نگاہ کو دیا تو نے تجلیات کا
تیری نمود، ارتقا جلوہ گہِ حیات کا — تیرا ورود معجزہ عالمِ ممکنات کا
کھینچ دیں اصل و فرع میں صاف حدودِ امتیاز — ذہن و نظر کو دیدیا علم صفاتِ ذات کا
محشرِ ہست و بود سے جادۂ نو نکال کر — رنگ کچھ اور کر دیا شورشِ کائنات کا

تیرگیِ جمود سے زندگیاں ہوئیں طلوع — عقدہ کیا جو تو نے حل فلسفۂ حیات کا
کشمکشِ عمل سے روح کو کر دیا رہا — آخری رہنما ہے تو مرحلۂ نجات کا
دیرِ خودی و کبر میں تو نے اذانِ صبح دی — تیرا جمالِ زندگی، چاند ہی پچھلی رات کا
رہنے دی محوِ بیخودی خاطرِ پُرخروش کو، — راز کہیں نہ فاش ہو قیدِ تعیّنات کا

اے دل و جانِ وارثی، نور و ضیائے زندگی
تجھ سے فروغ ہے مری ہستیِ بے ثبات کا

اب کیا بتاؤں میں ترے ملنے سے کیا ملا — عرفانِ غم ہوا مجھے دل کا پتا ملا
جب دور تک نہ کوئی فقیرِ آشنا ملا — تیرا نیازمند ترے در سے جا ملا
منزل ملی - مراد ملی - مدعا ملا — سب کچھ مجھے ملا جو ترا نقشِ پا ملا
خود بین و خود شناس ملا خود نما ملا — انساں کے بھیس میں مجھے اکثر خدا ملا
سرگشتۂ جمال کی حیرانیاں نہ پوچھ — ہر ذرّے کے حجاب میں اک آئینا ملا
پایا تجھے حدودِ تعیّن سے ماورا — منزل سے کچھ نکل کے ترا راستا ملا
کیوں یہ خدا کو ڈھونڈنے والے ہیں نامراد — گذرا میں جب حدودِ خودی سے خدا ملا
یہ ایک ہی تو نعمتِ انسان سازتھی — دل مجھ کو مل گیا تو خدائی کو کیا ملا؟
یا زخمِ دل کو پھیل کے سینے سے پھینکدے — یا اعتراف کر کہ نشانِ وفا ملا

سیمابؔ کو شگفتہ نہ دیکھا تمام عمر
کم بخت جب ملا ہمیں غم آشنا ملا

جاگ! اور دیکھ ذرا عالمِ ویراں میرا
صبح کے بھیس میں نکلا ہے گریباں میرا

تو بھی اب چاہے تو ممکن نہیں درماں میرا
مرضُ الموت ہے ظالم غمِ پنہاں میرا

فطرت آرائے جنوں ہے تنِ عریاں میرا
میری بے چارگیاں ہیں سرو ساماں میرا

بند آنکھیں کئے یوں جاگ رہا ہوں شبِ غم
کہ انھیں آئے نظر خوابِ پریشاں میرا

ہے پریشانیٔ دل کا یہی صرف ایک علاج
پوچھ لو حال بہ اندازِ پریشاں میرا

شمع سوزاں ہے مرا دل بھی، مگر فرق یہ ہے
جل کے پھر بجھ نہیں سکتا دلِ سوزاں میرا

غلبۂ یاس بجا، شدّتِ حرماں معلوم
میں سمجھتا ہوں کہ مرنا نہیں آساں میرا

مدتوں ہوئے وفا آئے گی بت خانوں سے
عود بن بن کے جلا ہے دلِ سوزاں میرا

مجھے پروائے تغافل نہیں، شکوہ یہ ہے
کہ ترے علم میں کیوں ہے غمِ پنہاں میرا

عشق دیدارِ طلب، حسن تمنا آزار،
ہو چکا تم سے علاجِ غمِ پنہاں میرا

توڑ کلیاں، گرے خانہ برانداز چمن
عرض یہ ہے کہ نشیمن نہ ہو عریاں میرا

تمھیں کیوں مدِّ نظر اب ہی خرابی اسکی
تم تو کہتے تھے کہ گھر ہے دلِ انساں میرا

پڑ گئی کس کی نگاہِ متبسّم سیمابؔ
ہو گیا حرفِ غلط دفترِ عصیاں میرا

جلوہ گاہِ دل میں مرتے ہی اندھیرا ہو گیا
جس میں تھے جلوے ترے وہ آئینہ کیا ہو گیا

پھر تصوّر نے پڑھا وہی نالۂ موزوں کی ذیل
پھر فضائے درد میں اک شعر پیدا ہو گیا

برہمن کہتا تھا "انحد" شیخ بول اٹھا "احد"
نکتہ رس دونوں نہ تھے، آپس میں جھگڑا ہو گیا

نجد کے ہرنوں سے اعجازِ محبت پوچھئے
پڑ گئی جس پر نگاہِ قیس لیلےٰ ہو گیا

جان دیدی میں نے تنگ آ کر وفورِ درد سے
آج منشائے جفائے دوست پورا ہو گیا

اب کہاں یاسیوں میں ضبط کی گنجائشیں
وہ بھی کیا دن تھے کہ تیرا غم گوارا ہو گیا

دل کھچا جتنا قفس میں آشیانے کی طرف
دُور اتنا ہی قفس سے آشیانا ہو گیا

رفتہ رفتہ ہو گئے جذب اسمیں جلوے سینکڑوں
دل مرا سیمابؔ اک آئینہ خانہ ہو گیا

روزِ فراق ہر طرف اک انتشار تھا
میں بے قرار تھا تو جہاں بیقرار تھا

نقشِ طلسمِ میرا دلِ داغدار تھا
تھا دن کو پھول۔ رات کو شمعِ مزار تھا

یادش بخیر۔ یاد ہیں دل کی مصیبتیں
پہلو میں اک ستم زدۂ روزگار تھا

اللہ رے شامِ غم مرے دل کی شکستگی،
تاروں کا ٹوٹنا بھی مجھے ناگوار تھا

وحشت طراز تھی کششِ شامِ بیکسی
مرکز سے اپنے دور چراغِ مزار تھا

کیا دیتے ہم کسی کو دعائے سلامتی
اپنی ہی زندگی کا کسے اعتبار تھا

سیمابؔ نالہ کر کے پشیماں ہیں فضول
وہ کام کیوں کیا جو انھیں ناگوار تھا

سُنا ہے حسن کا مستقبل مسلک، وفا ہو گا
وفا ہے حسن کا جوہر کسی سے سُن لیا ہو گا

ہوس رکھا ہے اُس نے نام جذباتِ محبت کا
نہ جانے اے مذاقِ دل ترا انجام کیا ہو گا؟

اٹھا ہے حسن پھر محفل سے پیغامِ وفا لے کر
نیا اب شیوہ و آئینِ دنیائے وفا ہو گا

نیازِ عشق کو ہوگی اجازت بار یابی کی — اب اُن کے آستانِ ناز پر سجدہ روا ہوگا
وفا و حسن مل کر اک نئی دنیا بنائیں گے — نہیں معلوم کب ہوگا وہ عالم اور کیا ہوگا
جسے تکلیفِ احساسِ محبت میں سمجھتا تھا — خدا رکھے وہ درمانِ دلِ درد آشنا ہوگا

وفا کے گیت جب حسن و محبت مل کے گائینگے
وہ دورِ عاشقی سیمابؔ کتنا دل رُبا ہوگا،

فضائے گوشۂ دل میں تجھے جب جلوہ گر دیکھا
مری نظروں نے حیرت سے مجھی کو عمر بھر دیکھا
توقع سے ترے فضل و کرم کو بیش تر دیکھا
مجھے شرم آگئی۔ جب اپنا دامن مختصر دیکھا
رہا لب تشنۂ تسکیں مرا امکانِ نظارہ
اگرچہ دیکھنے کی طرح تجھ کو عمر بھر دیکھا
تصوّر کی حدوں کو ناز تھا جن کی تجلّی پر
نظر والوں نے اُن جلووں کو تا حدِّ نظر دیکھا
سب اپنے دل میں اک تیرِ نظر محسوس کرتے ہیں
مگر کوئی بتا سکتا نہیں اُس نے کدھر دیکھا
ترے سجدوں سے مطلب تھا۔ مکان و لامکاں کیا
نہ ہم نے رہگذر دیکھی نہ ہم نے سنگِ در دیکھا

نظر آتا نہ تھا جو گردِ انکار و حوادث میں،
وہ ساحل آنکھ نے طوفانِ غم میں ڈوب کر دیکھا

نیازِ عشق کو آزادِ قیدِ رنگ و بو پایا،
جنوں کو بے نیازِ بندشِ دیوار و در دیکھا

دلِ یک قطرہ خوں اور اُس میں سوز و اضطراب اتنا
ذرا سی چیز میں ہنگامۂ برق و شرر دیکھا

تمہارے سنگِ در کو سنگِ در اب کس طرح کہدوں
کہ جب سجدہ کیا سر کو جبینِ عرش پر دیکھا

وہ آئے نزع میں تجدید کرنے رسمِ الفت کی
بڑھا دی داستاں جب میرا قصہ مختصر دیکھا

عجب منزل تھی اے سیماب اپنی منزلِ ہستی
نہ دم لینے کی فرصت تھی نہ یارائے سفر دیکھا

دل ہے نظارۂ ہم جنس سے حیراں کیا کیا
محو ہے اپنی ہی تصویر میں انساں کیا کیا

دلربا عالمِ صورت میں ہوا انساں کیا کیا
حسن ہے خاک کے پتلے میں نمایاں کیا کیا

یاس کی موج جب اُٹھی تو سنبھالی نہ گئی
یوں تو اُٹھتے مری جذبات میں طوفاں کیا کیا

جب تصور میں وہ ہمراہ ہوا کرتے ہیں
شعر کہتا ہے مرا قلبِ غزل خواں کیا کیا

وہ عبا قیس کی، فرہاد کا وہ جامۂ تنگ
دشت و کہسار نے دیکھے ہیں گریباں کیا کیا

طورِ موسیٰ، دلِ طائف، چمنستانِ خلیلؑ یادگاریں ہیں تری جلوۂ جاناں کیا کیا

ملتفت دیکھ کر احساسِ کرم کو سیمابؔ
جمع ہے خاطرِ اندیشہ بداماں کیا کیا

ہم ہیں سرتاپا تمنّا کیسی امید، کیا تمنّا!
ہو کتنی ہی خوشگوار پھر بھی ہے دل کے لئے بلا تمنّا
دیتے ہو پیامِ آرزو تم جب ترک میں کر چکا تمنّا
دنیا کو فریب دے رہی ہے جلوہ ہی سراب کا تمنّا
اپنی منزل پہ ہم نہ پہونچے جب تک رہی رہنما تمنّا
مابین نگاہ و جلوۂ حسن ہے ایک حجاب سا تمنّا
اُلجھا رہا آرزو میں غافل کیوں خود ہی نہ بنگیا تمنّا
آواز تو دو کسے پکاروں تم ہو مرے دل میں یا تمنّا

سیمابؔ آلِ شوق معلوم!
اُمُّ البلادِ نسیانِ ما تمنّی

جب مرا ذوقِ نظر حسن آزما ہو جائے گا لاکھ پردوں سے بھی وہ جلوہ نما ہو جائیگا
یہ نکمّا پن جمودِ دل کا اک انجام ہے دل سے کوئی کام لے دل کام کا ہو جائیگا
برہمن اور شیخ میں ہے مدتوں سے گفتگو تم کہیں جلوہ دکھا دو۔ فیصلا ہو جائیگا
صفحۂ تاریخ پر کام آئے گا میرا لہو کم سے کم رنگین عنوانِ وفا ہو جائیگا

مصلحت یہ ہے خودی کی غفلتیں طاری رہیں
جب خودی مٹ جائے گی بندہ خدا ہو جائیگا

طالبِ کل ہو کے، فوتِ اکل کی محرومی نہ لے
ایک کا ہو جا تو پھر سب کچھ ترا ہو جائیگا

پردۂ خلوت اُٹھا، پروانہ بن محفل میں آ
سوزِ دل خود درس آموزِ فنا ہو جائیگا

زندگی دو دن کی ہے لمبی سہی میعادِ قید!
آج آیا ہے قفس میں کل رہا ہو جائیگا

سو کے اُٹھنا بھی ہے اے سیمابؔ دنیا میں محال
مر کے جی اُٹھنا مرا اک معجزا ہو جائیگا

شکریہ ہستی کا! لیکن تم نے یہ کیا کر دیا؟
پردے ہی پردے میں اپنا راز افشا کر دیا

مانگ کر ہم لائے تھے اللہ سے اک دردِ عشق
وہ بھی اب تقدیر نے اوروں کا حصّا کر دیا

دو ہی انگارے تھے ہاتھوں میں خدائے عشق کے
ایک کو دل، ایک کو میرا کلیجا کر دیا

جب تجلّی اُن کی برقِ ارزانیوں پر آ گئی
آبلے سے دل کے پیدا طورِ سینا کر دیا

میں تو اپنی بے خودیٔ شوق کا ممنون ہوں
بارہا مجھ کو بھری محفل میں تنہا کر دیا

واقعاتِ عشق کا تھا ایک لمحہ اک صدی
ہر نفس میں میں نے اک دامان پورا کر دیا

مرحمت فرما کے اے سیمابؔ غم کی لذتیں
زیست کی تلخی کو فطرت نے گوارا کر دیا

جلوہ کوئی نگاہ میں باطل نہیں رہا
اب امتیازِ لیلیٰ و محمل نہیں رہا

یہ غم نہیں کہ شاد مرا دل نہیں رہا
ماتم یہ ہے کہ میں تری قابل نہیں رہا

بیدار اُسکا حسن رہا چشمِ خواب میں
مجھ سے تو نیند میں بھی وہ غافل نہیں رہا

ویراں ہی دل کہ تیرے تصور سے جو ہے
یہ آئینہ بھی درخورِ محفل نہیں رہا

گم ہوں رہِ طلب میں بقدرِ کمالِ ذوق
مجھ کو دماغِ ساحل و منزل نہیں رہا

آئے ہیں چارہ ساز بھی نشتر فروش بھی
جب میں دوا، و درد کے قابل نہیں رہا

طوفاں نے زندگی سے مجھے سیر کر دیا
اچھا رہا کہ تشنۂ ساحل نہیں رہا

ممنون ہوں تری نگہِ دلنواز کا
اے دوست شکریہ مگر اب دل نہیں رہا

منظور اُن کو پرسشِ سیماب ہے مگر
سیماب عرضِ حال کے قابل نہیں رہا

جب تک غمِ الفت کا عنصر نہ ملا ہوگا،
انسان کے پہلو میں دل بن نہ سکا ہوگا

خوابِ سرِ منزل سے مقصد نہ فنا ہوگا،
وارفتۂ حیرت کا دل ڈھونڈ رہا ہوگا

میں اور ترا سودا۔ تو اور یہ استغنا!
شاید مجھے فطرت نے مجبور کیا ہوگا

در پردہ گناہوں پر ہے ناز تجھے ناحق
جو دیکھنے والا ہے وہ دیکھ رہا ہوگا

اک دائرہ ذرّوں کا خورشیدِ طریقت تھا
شاید وہ تمہارا ہی نقشِ کفِ پا ہوگا

تم درد کے خالق ہو، میں درد کا بندہ ہوں
جب نام لیا ہوگا دل تھام لیا ہوگا

نغمہ وہ سنا جس سے کونین تڑپ جائے
فریاد ہے بے معنیٔ فریاد سے کیا ہوگا

میں علمِ تغافل پہ مانوسِ تغافل ہوں
مجھ سا بھی نہ دنیا میں مجبورِ وفا ہوگا

سیماب جب اِس دل میں تصویر نہیں اُن کی
یہ آئینہ دھندلا ہے، یہ آئینہ کیا ہوگا

جو انتظار ترا وجہِ اضطراب نہ تھا
تو بات کہ میں کیوں آشنائے خواب نہ تھا؟

مری سکوں طلبی بزمِ دوست میں معلوم
وہاں تو میرا اُتر پنا بھی مستحاب نہ تھا

آلِ اُنس ہے میرا تباہ ہو جانا
بجا کہا کہ تمہیں مجھ سے اجتناب نہ تھا

بنا لیا مجھے دریا نے جانشینِ حباب
جہاں میں ڈوب کے اُبھرا وہاں حباب نہ تھا

لطیف تر تھی ترے انتظار کی تکلیف
کہ اضطراب تھا اور پھر بھی اضطراب نہ تھا

مثالِ رنگِ زمانہ بدل گیا مجھ سے
ترا مزاجِ وفا تھا مرا شباب نہ تھا

یہ اتفاق تھا سویا تو نیند آ ہی گئی
مجھے تو قبر میں بھی اعتبارِ خواب نہ تھا

اک انقلاب زمانے میں تھا شباب کے بعد
نظر اُٹھی تو کسی چیز پر شباب نہ تھا

ہزار رنگ کے پردوں میں چھپ کے پھیل گئے
یہ اک ظہور کی ترکیب تھی حجاب نہ تھا

نہ تھا وہ بھید کہ دنیا مجھے سمجھ لیتی
میں خود بھی اپنے سمجھنے میں کامیاب نہ تھا

یہ تیرا نقصِ طلب تھا کہ تو رہا تشنہ
جو ڈھونڈتا تو یہ سارا جہاں سراب نہ تھا

بخیر حشر کا دن بھی گذر گیا سیماب
ہوئی یہ خیر کہ میں گرمِ اضطراب نہ تھا

اے بیخبری دل کو دیوانہ بنا دینا
ہر سانس کو ہستی سے بیگانہ بنا دینا

ٹوٹا ہوا دل شمعِ بت خانہ بنا دینا
جب رات ڈھلے ساقی، پیمانہ بنا دینا

پر شور گھٹاؤں کا ممنون نہ ہونے دو
تم کو بھی تو آتا ہے دیوانہ بنا دینا

دل سازِ وفا بھی ہے اور سوز نوا بھی ہے
بنجائے تو ناقوسِ بت خانہ بنا دینا

ایسا نہ ہو یہ دنیا پھر ہوش میں لے آئے
دیوانے کی فطرت کو دیوانہ بنا دینا

اس گھر سے نکل کر بت آخر کہیں رہتے بھی
کعبے کی عنایت ہے بتخانہ بنا دینا

وہ نورِ چمن بن کر برسات میں آئے ہیں
منظور ہے بوندوں کو پروانہ بنا دینا

کام آئے گا اے ساقی یہ دامنِ تر میرا
چھوٹا سا کوئی ابرِ میخانہ بنا دینا

تمہید خرابی کی تکمیلِ خرابی ہے
اک بت کا بنانا ہے بتخانہ بنا دینا

اللہ رے سوزِ غم آتش نفسی تیری
جس ساز کو چھو لینا پروانہ بنا دینا

اے حسن، ہو اک رحمت یہ تیری جنوں کاری
انسان بنانا ہے دیوانہ بنا دینا

خود قصۂ غم اپنا کوتاہ کیا میں نے
دنیا نے بہت چاہا افسانہ بنا دینا

سیماب یہ ہیجانِ گرمیٔ محبت ہے،
انساں کو ہم انجامِ پروانہ بنا دینا

ترے خیال سے بھی رسم و راہ کر نہ سکا
میں اپنے دل کے لئے یہ گناہ کر نہ سکا

کوئی تلافیٔ جرمِ نگاہ کر نہ سکا
کیا گناہ تو عذرِ گناہ کر نہ سکا

جہاں ملی وہیں پی لی، یہ بیخودی تھی مری
خیالِ مدرسہ و خانقاہ کر نہ سکا

کوئی گنہ نہ کیا۔ اعترافِ رحم کے بعد
میں کوئی اس سے زیادہ گناہ کر نہ سکا

تمہیں تو حدِ نظر تک درود آساں تھا
اگر بلند میں اپنی نگاہ کر نہ سکا

یہ ایک راز تھا اعلانِ عفو میں اُن کے
کہے نہ کوئی کہ انساں گناہ کر نہ سکا

ہر اک نگاہ میں تھا شوق کچھ نہ کچھ تیرا
مگر میں تجزیۂ ہر نگاہ کر نہ سکا

فغاں کا اُس پہ ہی الزام، واہ ری انصاف
جو زیرِ لب بھی کبھی ایک آہ کر نہ سکا

نہ پوچھ مجھ سے، ترے جبر و اختیار کی خیر،
گناہ ہو نہ سکے، یا گناہ کر نہ سکا

یہ ایک بھول ہوئی مجھ سے وقتِ نظّارہ
کہ اپنی بے خبری کو گواہ کر نہ سکا

جسے تمہاری نگاہیں تباہ کر نہ سکیں
کبھی پھر اُس کو زمانہ تباہ کر نہ سکا

سرائے دہر میں سیمابؔ نیکیاں کیسی!
گناہ بھی تو بقدرِ گناہ کر نہ سکا

ہے کرم مجھ پر، مگر ایسا کرم کس کام کا
تیرے لطفِ خاص میں ہی، رنگ لطفِ عام کا

میں نے اس خوابیدہ عالم کو بنایا کام کا
گرمیٔ محفل نتیجہ ہے مرے پیغام کا

کاہشِ غم ہی مداوا ہے غمِ ایام کا
ہے شفق کے خون سے رنگین گیسوئے شام کا

دل کبھی ٹوٹا، تو سرگشتہ نہ درماں کا ہوا
میں کہ تھا دیکھے ہوئے عالم شکستِ جام کا

سب مرے انجام پر آمادۂ تنقید ہیں
اور پھر ضامن نہیں ہوتا کوئی انجام کا

اسکی مستی وہم، مستی وہم، اور پستی بھی وہم،
نام ہے انسان اک مجموعۂ اوہام کا

ہے فریبِ طولِ عشرت، محفلِ ہستی کی شام
صبح ہونے تک ہی وقفہ گردشِ یک جام کا

کم نگاہی سے تری ساقی وہ کیا مسرور ہو
جس نے ان آنکھوں سے دیکھا ہی چھلکتا جام کا

عشق کے عنوان سے تجدیدِ ایماں کیجئے
بے مزہ نکلا فسانہ کفر اور اسلام کا

صبحِ منزل اور شامِ کارواں ہوں ہمکنار
کاش ایسا دور بھی ہو گردشِ ایام کا

وہ تری خود مست آنکھیں، وہ تبسم بادہ ریز،
آجتک نظر و نہیں عالم ہے چھلکتے جام کا

ہے تپش اندوز دل اک برقِ نامعلوم سے
پوچھئے کس سے پتہ اس جلوۂ بے نام کا

عمر بھر سینے میں درماں کی خلش باقی رہی
ایک کانٹا چبھ گیا تھا آرزوئے خام کا

شامِ غربت کی درخشانی کا یہ ہے انتظام
بن گیا ہے صبح کا آنسو ستارہ شام کا

رونے والو، موت لائی ہے سکوں میرے لئے
یہ خوشی کا وقت ہے یا وقت ہے کہرام کا

رہنے دے درد آشنا نظروں کو صرفِ التفات
تکملہ جب تک نہ ہو میرے جنونِ خام کا

پہلے اے سیماب اس دنیا میں ملتا تھا خدا
اب تو ٹکڑا بھی نہیں ملتا خدا کے نام کا

قفس سے چھٹ کے بڑی دیر میں ٹھکانہ ملا
خیال سے بھی کہیں دُور آشیانہ ملا

تعینات کے پردوں میں چھپ کے بیٹھ گئے
حجاب کا یہ اُنھیں اور اک بہانہ ملا

سُنا ہی طور پہ تم بے حجاب آئے تھے
یہ رشک ہے کہ ہمیں کیوں نہ وہ زمانہ ملا

نگاہ پڑ گئی جب دل پہ پچھلی راتوں میں
بھرا ہوا ترے بھیدوں سے اک خزانہ ملا

کسی کو تو نہ ملا اور کھو دیا سب کو،
تری تلاش میں گمراہ اک زمانہ ملا

جسے نہ دیکھ سکیں میری ظاہری آنکھیں
وہ مجھ سے روح کی خلوت میں غائبانہ ملا

یہ اعتبارِ مرایا ترا تصرف تھا
جدھر گیا مجھے تیرا ہی آستانہ ملا

وفا کی سطح سے گذری ہوئی ملی دنیا
غرض کے رنگ میں ڈوبا ہوا زمانہ ملا

وہ سوز مند ہوں، وہ مرکزِ حوادث ہوں
کہ بجلیوں کو بھی میرا ہی آشیانہ ملا

دراز تھی مری شامِ فراق کی روداد
زبانِ شمع پر اک آخری فسانہ ملا

یہ میری تیرہ نصیبی یہ سادگی یہ فریب، گری جو برق، میں سمجھا چراغِ خانہ ملا
ہجومِ بزم ہوا حائلِ وصالِ نظر تمہاری دید نگاہی کو اک بہانہ ملا
سرائے دہر میں سیماب دل لگا نہ سکا
سفر کی بات تھی سب سے مسافرانہ ملا

دامانِ سحر پر کندہ ہے اب تک دامانِ غم میرا
یہ تارے میری آنکھیں ہیں، یہ گریہ ہے شبنم میرا
اب مایوسی امیدِ مری، اب عین خوشی ہے غم میرا
اب عشق نئے عالم میں ہے، اب دیکھ ذرا عالم میرا
ہر آنسو تسکیں پائے گا اک دن ایسا بھی آئے گا
ساحل خود ہی بن جائے گا، یہ طوفانِ پیہم میرا
ہے روزِ ازل سے دنیا کی اس دست میں محفل میری
میں ہر ذرے سے واقف ہوں ہر ذرہ ہے محرم میرا
جب ہستی میری ہستی تھی جب مستی میری مستی تھی
فطرت کی معصوم آنکھوں نے دیکھا ہے وہ عالم میرا
عریاں ہے میری نظروں میں گہرائی فریبِ عشرت کی
اک رحمت ہے میری کاہش، اک نعمت ہے ہر غم میرا
جو کچھ موجودِ خلقت ہے، یا شعر ہے یا شعریت ہے

یہ ذوقِ عطائے فطرت ہے، یہ ذوقِ ہے کیف و کم میرا
شام اور سحر دو میرے ہی ہموار و پریشاں جلوے ہیں
یہ میری جبینِ تاباں ہے، وہ گیسوئے برہم میرا
سیماب وہ دن اب دور نہیں، سیماب وہ دور اب آتا ہے
جب دنیا کی ہر رفعت پر لہرائے گا پرچم میرا

ابھی درمانِ جنونِ غمِ پنہاں ہوتا
چارہ گر کاش ترے ساتھ بیاباں ہوتا

کوئی نغمہ جو ترا جذبِ رگِ جاں ہوتا
میں غزلخوانِ سرِ پردۂ امکاں ہوتا

ننگِ گلشن تھا، تو ہمرنگِ بیاباں ہوتا
گلِ بداماں نہ سہی، خاکِ بداماں ہوتا

چند اجزائے پریشاں سہی تھی میری ترکیب
اب نہ ہوتا تو پسِ مرگ پشیماں ہوتا

کاش ہوتا کہ تہِ قتلِ غلامی مجھ سے
مکراتا ہوا میں داخلِ زنداں ہوتا

موت، سنتے ہیں کہ ہے دردِ محبت کا علاج
مر نہ جاتا میں اگر قابلِ درماں ہوتا؟

اُسے معلوم تو ہی میری پریشاں خوابی
کیوں مرے خواب میں آ کر وہ پریشاں ہوتا؟

خود غرض آدمی آوارۂ آزادی ہے
درد ہوتا تو شریکِ غمِ زنداں ہوتا

عہدِ موسیٰ میں نہ تھا قابلِ جلوہ کوئی دل
ورنہ وہ، اور پہاڑی پہ نمایاں ہوتا!

میں جس انداز میں دیتا تجھے پیغامِ طلب
سازِ فطرت بھی اُسی میں غزلخواں ہوتا

بجلیاں کوندتیں اس باغ میں بے موسم بھی
میں اگر شاخِ نشیمن سے پرافشاں ہوتا

شوخیِ جلوۂ طرازِ ازل ہم سے ہے
ہم جو افسانہ نہ بنتے تو یہ عنواں ہوتا؟

نقصِ نظّارہ سے ہے حاصلِ نظّارہ تباہ — دیکھتا تجھ کو سمجھ کر تو نہ حیراں ہوتا
دل کے بجھنے سے ہوا تاریک فضائے ہستی — دل سے لَو اُٹھتی تو دنیا میں چراغاں ہوتا

کفر کی ضد پہ ہے سیمابؔ اساسِ اسلام
عشق کافر تھا اگر حسن مسلماں ہوتا

مرتّب ہو کے اک محشر غبارِ دل سے نکلے گا — نیا اک کارواں گردِ رہِ منزل سے نکلے گا
نیا حاصل ہماری سعیِ لاحاصل سے نکلے گا — نہ نکلا کام جو ماضی سے، مستقبل سے نکلے گا
خرابِ رہگذارِ قیس رکھ اپنی نگاہوں کو — جو لیلےٰ بن کے نکلیگا اسی منزل سے نکلے گا
ہمارے مُنہ سے اور شکوہ تمہارا، ہو نہیں سکتا — تمہارا نام بھی شاید بڑی مشکل سے نکلے گا
نہ ہوگا گوشۂ دامن مرا وابستۂ منزل — نہ جب تک ہاتھ تیرا پردۂ منزل سے نکلے گا
مری آنکھیں ہیں بزمِ رنگ و بو میں منتظر تیری — نہیں معلوم تو کب تک حجابِ دل سے نکلے گا
سمجھ لے ناخدا یہ بات، اور پھر ڈوب جانے دے — ہمارا حال سُن کر کیا لبِ ساحل سے نکلے گا
جو کچھ کھویا ہے، پرانے ہو یا ہوں سمع کے آنسو — یہ سب کچھ ایک دن خاکسترِ محفل سے نکلے گا
قیامت میں نہ ہو پردہ دری حسن و محبت کی — سنا ہے قیس، اے لیلےٰ ترے محمل سے نکلے گا
خدا کی جستجو کر یا نہ کر، رکھ بے خودی طاری — وہ خود تیری خودی کے پردۂ حائل سے نکلے گا
تو دل کو دیکھتا رہ، اور پچھلی رات ہونے دے — جلوسِ حسن تیری جلوہ گاہِ دل سے نکلے گا
نکالا تم نے محفل سے مگر اتنا نہ سمجھے تم — کہ اک حسرت زدہ تنہا بھری محفل سے نکلے گا

میں اپنے دل کو یوں پیشِ نظر سیمابؔ رکھتا ہوں

کہ میرا چاند جب نکلا اسی منزل سے نکلیگا

مجھ سے پہلے کوئی جلوہ نگرِ دل نہ ہوا
یہ وہ منصب ہے کہ موسیٰ کو بھی حاصل نہ ہوا

میں پسِ پردۂ آئینۂ محفل نہ ہوا
تم جسے دیکھ رہے تھے وہ مرا دل نہ ہوا

اس لئے کیفِ حقیقت تجھے حاصل نہ ہوا
کہ تو حق میں تو ہوا، عارفِ باطل نہ ہوا

میں وہ پروانہ ہوں، جو نازشِ محفل نہ ہوا
سوز کا ظرف نہ تھا، ساز کے قابل نہ ہوا

اے خبر وسعتِ کونین کی رکھنے والے!
باخبر وہ ہے کہ جو بے خبرِ دل نہ ہوا

منزل اک پردۂ غفلت تھی سرِ راہِ عمل
خیر گذری کہ میں دامن کشِ منزل نہ ہوا

کیا بساط اسکی تھی اک پارۂ لرزاں کے سوا
دل پہ جب تک تری نظریں نہ پڑیں دل نہ ہوا

جذبِ خورشید ہو ذرہ، تو ہے عینِ خورشید
حسرت اُس محوِ تماشا پہ جو محفل نہ ہوا

سینۂ حسن کو ہلکی سی خلش مل جاتی
تھی جہاں حسن کی تخلیق وہاں دل نہ ہوا

تھا نہ ہم قسمتِ آئینہ، تو پتھر ہوتا
میں کہ اب تک نگہِ دوست کے قابل نہ ہوا

بھول ہنگامِ ازل ہو ہی گئی فطرت سے
صبر مجھ کو نہ ملا، تجھ کو عطا دل نہ ہوا

پھر وہ ہی شورِ جرس اور وہی بانگِ درا
میں تو منزل پہ بھی آسودۂ منزل نہ ہوا

سہل و دشوارِ محبت کا خلاصہ یہ ہے
ضبط آسان نہ تھا، صبر بمشکل نہ ہوا

ختمِ ہستی پہ ہے اور اک حقیقت موقوف
اور اگر ختم یہ ہنگامہ یا طل نہ ہوا؟

اے غمِ عشق ترے ظرف میں کچھ آگ بھی ہے؟
آنسوؤں سے تو علاجِ تپشِ دل نہ ہوا

کوئی نسبت بھی ہو، اُس طور کو میرے دل سے
جو تری ایک نظر کا متحمل نہ ہوا

ہائے وہ کشتۂ اغراض و ہوس اے سیمابؔ
جس نے دی جان مگر عشق کے قابل نہ ہوا

تو اب اُن سے بھی بیزار اے دلِ دیوانہ خُو ہو جا
نظر سے ماسوا کو محو کر کے تو ہی تو ہو جا

مثالِ نکہتِ آوارۂ گل چار سو ہو جا
سکوں چاہے تو آزادِ قیودِ رنگ و بو ہو جا

سپہرِ گرد باد دشت کر دے اپنی خاکستر
کہیں مل جائیگی منزل، خرابِ جستجو ہو جا

اگر تو چاہتا ہے آرزو تیری کرے دنیا
تو دل پر جبر کر کے۔ بے نیازِ آرزو ہو جا

تصور میں کسی کی طلعتوں کا منتظر کیوں ہے؟
خود اپنا آئینہ بن جا۔ خود اپنے روبرو ہو جا

بہار آئی تھی گلشن میں تو کرتی بارشِ لیکیں
یہ کس نے کہدیا تھا شورشِ فریادِ نمو ہو جا

فضا میں گھوم کے رہجاتی ہیں بیچارہ دلوں کی فریادیں
طوافِ عرش کرنا ہے تو دیوانے کی ہُو ہو جا

مٹا دے اپنی غفلت پھر جگا اربابِ غفلت کو
اُٹھیں سمجھے نہ دنیا پہلے نیند سے بیدار تو ہو جا

سُنا جا برق بن کر ہی ترانہ لن ترانی کا
نہ ہو ہم سے تو آنکھوں ہی سے گرمِ گفتگو ہو جا

غرض تو صرف اے سیمابؔ ہستی کا مٹانا ہے
نتیجہ ایک ہی ہے۔ خاک ہو جا یا لہو ہو جا

غمِ قیدِ زندگی میں بھی صبر آزما ہوا
پُتلہ ہوا عذاب کا انسان کیا ہوا!

تقدیر میں اضافۂ سوز و فا ہوا
دل میں جو تم نے آگ لگا دی تو کیا ہوا

عرفانِ نفس ہی مجھے عرفانِ دوست تھا
خود آشنا ہوا تو خدا آشنا ہوا

کہتے ہیں جس کو موت، ہے اک بیخودی کی نیند
اُس کو فنا کہاں ہے جو تجھ پر فنا ہوا

ہے شمع آج صورتِ پروانہ رقص میں
شاید مزاجِ حسنِ شریکِ وفا ہوا

میرا ہی ایک جلوۂ نادیدہ حسن تھا
اپنی ہی اک ادا پہ رہا میں مٹا ہوا

یوں تو فنا دگی ہے مذاقِ سرِ نیاز
سجدہ وہ تھا جو تیرے قدم پر ادا ہوا

اے خادمانِ حسن یہ کیا انتظام ہے؟
اب تک چراغِ طور پڑا ہے بجھا ہوا!

ہستی و نیستی کی حدیں دور رہ گئیں
یہ آ گیا کہاں میں تجھے ڈھونڈتا ہوا؟

منہ سے دعا نکل ہی گئی وقتِ قتل بھی
کہنا یہ تھا کہ حق محبت ادا ہوا

محفل کسے دکھاؤں کہ ہے زندگی اداس
اب شمع کیا جلاؤں کہ دل ہے بجھا ہوا

کیوں ہمنشیں یہی تو نہیں ساقیٔ بہار؟
جاتا ہے میکدہ سا ہوا پر اڑا ہوا

بحثِ نیاز و ناز تھی کل بزمِ حسن میں،
سیماب کچھ خبر نہیں کیا فیصلا ہوا؟

مجبورِ التفات تغافل کسی کا تھا
اللہ کیا اثر نگہِ ملتجی کا تھا

وہ دل جو ایک سازِ مری زندگی کا تھا
درصل نغمہ پسِ پردہ کسی کا تھا

سوز و فا کی پہلی ہی منزل میں رہ گیا
جگنو کہاں حریفِ مری عاشقی کا تھا

یاس جس نے قافلے والوں کو کر دیا
پہلا وہ حادثہ مری واماندگی کا تھا

تم آرزو کی زندگیاں لیکر آئے تھے
یادش بخیر ایک وہ دن زندگی کا تھا

حسرت کہ اپنے دل میں جگہ دی نہ دوست کے
میں دشمنوں میں بھی تھا تو کسی کی کمی کا تھا

تا چند اعتبار پہ یوں سجدۂ نیاز
ہوتے وہ سنگِ در تو فریبِ بندگی کا تھا

شیشوں سے پوچھتا ہوں جب آتا ہوں ہوش میں
کیا ذکر انجمن میں مری بیخودی کا تھا ؟

نازک سا امتیاز رہا جانبین میں
جو رنگ تھا خودی کا وہی بیخودی کا تھا

جو قدسیوں کے درس میں تھا درسِ آخری
ایک جزو مختصر وہ مری آگہی کا تھا

نسیماب، غمگسار نہ تھے وہ، نہیں سہی
احساس تو انھیں مری آزردگی کا تھا

دلِ خوں گشتہ کو سیلاب بہ داماں دیکھا
ایک قطرہ تھا جسے خالقِ طوفاں دیکھا

کسی کہسار پہ پہونچے نہ بیاباں دیکھا
پاؤں وحشت میں نکالے تھے کہ زنداں دیکھا

اس نے کیا رنگِ مریضِ شبِ ہجراں دیکھا؟
شمع کو پچھلے پہر طشت میں لرزاں دیکھا

غالباً فطرتِ دنیا ہی پریشانی تھی ،
جسے دیکھا اُسے دنیا میں پریشاں دیکھا

اُنس کے واسطے مشروط تھی انسانیت
دیدۂ منصبِ الفت جسے انساں دیکھا

نغمۂ عشق کو ہنگامہ گہِ دل پایا
حُسن کی چھیڑ کو مضرابِ رگِ جاں دیکھا

جو تماشا تھا وہ اب میرا تماشائی ہے
تو نے کچھ اور بھی اے دیدۂ حیراں دیکھا!

شبِ غم جب نظر آتا تھا بھرا گھر خالی
میں نے چند آنسوؤں کو دولتِ داماں دیکھا

دلِ ویراں کو ہے یہ خبط کہ محفل بن جائے
آپ نے حوصلۂ بے سر و ساماں دیکھا؟

شمع ہو، گرمیِ محفل ہو کہ پروانے ہوں
جسے دیکھا اُسے اک رات کا مہماں دیکھا

طور پر پھر نظر آجا، نظر آنے کی طرح
یوں دکھا جلوہ کہ موسیٰ بھی کہیں ہاں دیکھا!

کتنی رنگین و مبارک تھیں قفس کی راتیں
آنکھ جب بند ہوئی خوابِ گلستاں دیکھا

ہوش آیا تو ہنسی آگئی وحشت پہ مجھے
اپنی ہاتھوں میں جب اپنا ہی گریباں دیکھا

کوئی گریاں مجھے سمجھا کوئی آسودۂ خواب
سب نے آنکھوں پہ مرا گوشۂ داماں دیکھا

کس سے سیماب پریشانیٔ دل کہتے ہم
ہم نے اپنی ہی طرح سب کو پریشاں دیکھا

رات کا جانا، وداعِ شیشۂ و پیمانہ تھا
صبح کا تارا نہ تھا، قفلِ درِ میخانہ تھا

حسن تنگ آکر بھڑک اٹھا فضائے طور پر
کیا سوالِ طالبِ دیدار گستاخانہ تھا؟

ڈھونڈتا پھرتا تھا چشمِ آرزو کی روشنی
میں شبِ فرقت اندھیری رات کا پروانہ تھا

دشتِ غربت میں یہی تھے نغمگارِ بے کسی
شبنم آوارہ تھی یا سبزۂ بیگانہ تھا

میری خاکستر سے پیدا تھا جہانِ آرزو
جو پتنگا دل کے شعلوں سے اڑا پروانہ تھا

یہ ہمارا کعبۂ دل ہے ابھی تک بت کدہ
لوگ کہتے ہیں دلِ کعبہ کبھی بت خانہ تھا

آنکھ والو سوز فطری کے کرشمے دیکھنا
ہے ابھی خاکسترِ محفل، ابھی پروانہ تھا

محشرِ پندار برپا تھا بمقدارِ خودی
بت نہ تھے تخیلِ عالم میں، مگر بتخانہ تھا

رات دن سیماب میں دنیا میں سرگرداں رہا
پاؤں کا چکر، جوابِ گردشِ پیمانہ تھا

محرومِ تصور کر نہ دیا، مجبورِ تماشا کر نہ دیا
محفل کو مری برہم کر کے، تم نے مجھے تنہا کر نہ دیا!
پیغامِ محبت کے دے کر، ہم ذوقِ زلیخا کر نہ دیا!

آخر ہمنے اے حسن تجھے پابندِ تمنّا کر نہ دیا؟!
انسان کے دل میں گھٹ گھٹ کر جو روح کو کھائی جاتا ہے
ہمت تھی اگر تو دنیا نے اُس راز کو افشا کر نہ دیا!
اب میرے دلِ خوں گشتہ کی ہر موج تمنا پرور ہے
یاؤسِ محبّت کر کے مجھے بیزارِ تمنا کر نہ دیا!
اب تک میرا ظلمت خانہ ہے بے شمع و بے پروانہ
تاروں نے چراغاں کر نہ دیا، سورج نے اُجالا کر نہ دیا!
میں ایک نظر سے آسودہ اپنی خلوت میں بیٹھا ہوں
اے جلوۂ ہر سوئے فطرت، تو نے مجھے رسوا کر نہ دیا!
ایوانِ تصور سے اپنے نکلا نہ طلب کی دنیا میں
جب تک ہر ذرّے کو میں نے پھیلا کر دنیا کر نہ دیا!
میں نے تو کہا تھا پہلے ہی، ڈوبا تو اُبھرنا مشکل ہے
اے بے خبری کھو کر مجھ کو پھر تو نے پیدا کر نہ دیا!
سیمابؔ جو ترکِ دنیا پر طعنے مجھے اکثر دیتے ہیں
اُن لوگوں نے دامن کو مرے وابستۂ دنیا کر نہ دیا!

[1] دل اک قطرہ لہو ہے، یہ ہے اس کے سوا کیا پھر اس کی آرزو کیا، پھر اس کا مدعا کیا

[1] مفاعیلن فعولن، مفاعیلن فعولن۔

حریمِ دل رہے گا یوں ہی بے آشنا کیا
نہیں دنیا میں کوئی، پرستارِ وفا کیا

محبت اور دل پر، کسی کا بس نہیں ہے
وہ ہم سے کیوں خفا ہیں، ہماری ہے خطا کیا؟

دلِ نالہ سرا سے نہ بہلے گی طبیعت
صدائے چنگ و نے سن، نوائے بے نوا کیا!

محبت کا ستانا تمھیں شایاں نہیں ہے
ستم آخر ستم ہے، روا کیا ناروا کیا

سرِ وادیِ ایمن گھٹائیں اٹھ رہی ہیں
کہیں سے دورِ جام و کف، کوئی پھر آ گیا کیا

یہ فطرت کی عنایت، یہاں بھی ہے وہاں بھی
قفس ہو یا نشیمن، غمِ آب و ہوا کیا

تخیل کی حدوں سے نکل کر ڈھونڈ جلوے
ہو جب صورت نظر میں، تصور کا مزا کیا!

جوانی سے الٰہی نہیں ہوں سیر ابھی میں
یہ موسم جا رہا ہے، تو پھر بھی آئے گا کیا؟

جبیں سائی سے تیکیں، نہ سجدوں سے تسلی
اٹھا کر سر میں رکھ لوں، تمہارا نقشِ پا کیا؟

پریشاں ہو چکے ہیں محبت میں ہزاروں
پھر اے سیماب میں کیا، مرا خواب و وفا کیا

آیا مری محفل میں غارتگرِ ہوش آیا
صد جام بکف آیا، صد شیشہ بدوش آیا

مستانہ مرا ساقی، ہنگامہ فروش آیا
خاموش ہوائے مطرب، ہنگامِ خروش آیا

وہ خود لئے بیٹھے تھے آغوشِ توجہ میں
بیہوش ہی اچھا تھا، ناحق مجھے ہوش آیا

میخانے میں کیا موجِ بادہ مترنم تھی!
بے کیف گیا تھا میں، صد نغمہ بگوش آیا

اڑ کر دلِ ویراں سے آنکھوں میں کچھ آیا ہے
پیمانۂ خالی میں کیا تھا جسے جوش آیا؟

تو محفلِ الفت میں فریاد بہ لب کیوں ہے؟
اس بزم میں جب آیا، پروانہ خموش آیا

کیوں دامنِ ہستی تک بڑھنے دیا ہاتھوں کو؟ دیوانہ اگر تھا میں، دنیا کو نہ ہوش آیا!
ہے سعیِ طرب کوشی، پھر مائلِ مے نوشی پھر آج مرے آگے ذکرِ غمِ دوش آیا

سیماب میں جنت میں جب شعر بہ لب پہونچا
اک شور رہا برپا، مہمانِ سروش آیا

بقدرِ شوق اقرارِ وفا کیا ہمارے شوق کی ہے انتہا کیا
دلِ آفت زدہ کا مدعا کیا شکستہ ساز کیا، اُس کی صدا کیا
محبت کا یہی جب شغل ٹھہرا تو پھر آہ رسا کیا، نارسا کیا
میں اپنے حال سے خود بے خبر ہوں تمہاری کم نگاہی کا، گِلا کیا
دعا دل سے جو نکلے کارگر ہو یہاں دل ہی نہیں، دل سوز دعا کیا
قفس کی زندگی پھر زندگی ہے غمِ ہنگامۂ رنگ و نوا کیا
ڈبویا تھا جہاں طوفاں نے ہم کو وہاں سب تھے، خدا کیا ناخدا کیا،
جو کہتے ہیں "اب اس میں کچھ نہیں ہے" کوئی اُن سے یہ پوچھے، مجھ میں تھا کیا
مری ہستی مری ہستی نہیں ہے تمہیں تم ہو تو ذکرِ ما سوا کیا
نہ اس پر اختیار اپنا نہ اُس پر سرِ آغاز و فکرِ انتہا کیا

سلامت دامنِ امید **سیماب**
محبت میں کسی کا آسرا کیا

ایک طوفاں تھا مگر گوزہ نشیں ہوتا رہا ہائے وہ آنسو کہ جذبِ آستیں ہوتا رہا

جذبۂ عیشِ دو عالم دل نشیں ہوتا رہا
اور میں با اینہمہ اندوہ گیں ہوتا رہا

مجھ پہ آخر گرم وہ سورج ہو کیوں جو مہ توں
آشیاں کے سائے میں پردہ نشیں ہوتا رہا

میرے سجدوں کو وہ سنگِ آستاں سمجھا کئے
منفعل کیا کیا مرا ذوقِ جبیں ہوتا رہا

بزمِ فطرت، روز فردوسِ نظر بنتی رہی
روز سامانِ نشاطِ بہتریں ہوتا رہا

یہ زمیں خود ایک دن کیا جانے کیا بن جائیگی
گر یونہی انسان پیوندِ زمیں ہوتا رہا

منتہائے ذوقِ خاطر دیکھ اے کنجِ قفس
تجھ پر اپنے آشیانے کا یقیں ہوتا رہا

ہم نشیں ذوقِ رسا، خوابِ جادہ کچھ نہ پوچھ
ہر نفس میں اپنی منزل سے قریں ہوتا رہا

بادۂ الفت تھا اے سیمابؔ کتنا خوشگوار
اس کی تلخی پر گمانِ انگبیں ہوتا رہا

دل کی آنکھوں سے ترا میں نے نظارا نہ کیا
غیرتِ رشک نے اتنا بھی گوارا نہ کیا

مجھے مرہونِ غمِ دوست دوبارا نہ کیا
آپ نے خوب کیا، درد کا چارا نہ کیا

خلوتِ دل نے کیا شمعِ تمنا کو پسند
انجمن بن کے تجھے انجمن آرا نہ کیا

تو نے دیکھا نہ ہمیں نیم نگاہی سے کبھی
ہمنے پھر بھی تری محفل سے کنارا نہ کیا

ادب آموز تھی پاکیزگیٔ نیتِ عشق
بے وضو میں نے کبھی ذکر تمہارا نہ کیا

شوق تھا وقتِ سحر گشتِ جبیں بوسی کا
تیرہ بختی نے مجھے صبح کا تارا نہ کیا

غیر مشروط معافی مجھے دیدی سیمابؔ
اس نے منظور گناہوں کا کفارا نہ کیا

زندانِ کائنات میں محصور کر دیا
محفل سے اپنی تم نے بہت دور کر دیا

اب کیوں ہمارے سامنے آتے ہو بیحجاب
جب خود گرِ تجلّیِ مستور کر دیا

ہم اور تیری بزم میں آتے محال تھا
لیکن کسی خیال نے مجبور کر دیا

آئے ہو دینے دعوتِ دیدار ہم کو کیوں
جب ہم نے ترکِ شیوۂ منصور کر دیا

فطرت یہی ازل سے ہے برقِ جمال کی
اس نے جسے تباہ کیا، طور کر دیا

تم نے ہمارے ظرفِ نظر پر نہ کی نگاہ
سارے جہاں کو حُسن سے معمور کر دیا

مخصوص میرا ذوقِ وفا تھا تری لئے
تائیدِ عام نے جسے دستور کر دیا

اب میں ہوں اور وسعتِ رنگینِ کائنات
تم نے ٹھکا کے پاس بہت دور کر دیا

سیمابؔ کوئی مرتبہ منصور کا نہ تھا
لفظِ خودی کی شرح نے مشہور کر دیا

سکوں پذیر جنونِ شباب ہو نہ سکا
شگفتِ موسمِ گل کامیاب ہو نہ سکا

شباب، سرخوشِ کیفِ شباب ہو نہ سکا
ہمیں تو نشہ بقدرِ شراب ہو نہ سکا

نظر سے چھیڑ دیا جس کو حُسن کافر نے
ہلاکِ نغمۂ چنگ و رباب ہو نہ سکا

میں تیری کم نگہی کا رہینِ منت ہوں
مرا نظامِ تمنا خراب ہو نہ سکا

چمن بہارِ سراپا تو بن گیا لیکن
جوابِ رنگِ بہارِ شباب ہو نہ سکا

یہ کیوں سنوں کہ ہو رسوائے دہر جلوۂ دوست
یہ کیوں کہوں کہ مجھی سے حجاب ہو نہ سکا

مری سکوں طلبی سے نصیب کو ضد تھی
پیامِ موت بھی، پیغامِ خواب ہو نہ سکا

نگاہ و دل نے دیے رازداریوں کے فریب
نہاں کسی سے مرا اضطراب ہو نہ سکا

ہزاروں پردوں سے تنزیہہ کے نکل آیا
وہ جلوہ ہوں جو اسیرِ حجاب ہو نہ سکا

وہاں ہم آرزوئے خوابِ عیش کیا کرتے
جہاں قیام بمقدارِ خواب ہو نہ سکا

اُڑائے برق و گل و لالہ نے بہت خاکے
مگر کوئی مرے دل کا جواب ہو نہ سکا

فروغِ میکدہ، صبحِ نشاطِ عید نہ پوچھ
غروبِ شام کو بھی آفتاب ہو نہ سکا

تمام عشق پہ ہے اختیارِ حسنِ تمام
پھر اس پہ طعن کہ میں کامیاب ہو نہ سکا

بدل گئیں وہ نگاہیں یہ حادثہ تھا اخیر
پھر اس کے بعد کوئی انقلاب ہو نہ سکا

وہاں پیام کی گنجائشیں کہاں سیمابؔ
جہاں سلام مرا مستجاب ہو نہ سکا

میں نے خاک میں مل کر منصبِ بقا پایا
اے اجل بتا تو نے مجھ کو کھو کے کیا پایا

ترکِ مدعا کر کے کیا بتائیں کیا پایا
ہم نے ساری دنیا کو حسبِ مدعا پایا

"ہوش" و "رازِ فطرت" میں دشمنی ازل سے تھی
جس نے پا لیا کھویا۔ جس نے کھو دیا پایا

گو غلط سہی، فطرت آرزو سمجھتی ہے
تخت کی دعا مانگی اور بوریا پایا

جادۂ محبت میں دل کا نام لینا کیا
ہم نے کچھ یہاں پھینکا، تم نے کچھ پڑا پایا

بادہ تند تھا جتنا، کیف بھی تھا اتنا ہی
حسن کے تناسب سے عشق کا مزا پایا

پھر نئی ترے غم سے مانگ لی خلش ہمنے
جب کسی مسرت کو صبر آزما پایا

کم سے کم فرشتوں کو چین تو ملا دل کا
آپ کی محبت میں آدمی نے کیا پایا؟

عشق و حسن دونوں تھے مائلِ خودی سیماب
اُس کو خود غرض دیکھا، اِس کو خود نما پایا

حریمِ گلستاں میں تو اگر ہو ہم نشیں میرا
داغِ افسردہ کر دے کیوں ہوائے یاسمیں میرا

الٰہی مائلِ معراج ہے ذوقِ جبیں میرا
اُٹھا سکتی نہیں اب بارِ سجدہ یہ زمیں میرا

قبولِ حسن کوئی کام ہی گویا نہیں میرا
نہ ہنسا دل نشیں میرا، نہ رونا دل نشیں میرا

میں اس کی روشنی میں اُنکے جلوے دیکھ لیتا ہوں
چراغِ طور سے کیا کم ہے داغِ آستیں میرا

بنائے قصر و ایواں میں کروں کیوں وقت صرف اپنا
سمجھتا ہوں مری منزل ہے دنیا گھر نہیں میرا

یہ عادت ہی سہی، عادت بھی کتنی خوبصورت ہے
جمالِ دوست سے دل سیر ہوتا ہے کہیں میرا!

تمہارے ساتھ ہوں ہر وقت خلوت ہو کہ جلوت ہو
جہاں تم ہو فضا افروز، دل بھی ہے وہیں میرا

گذرگاہِ جہاں سے بے تحاشا جا رہا ہوں میں
نظر جمتی نہیں میری، قدم رُکتا نہیں میرا

میں جس میں آگ بھر کر عشق کی دن رات پیتا ہوں
کوئی چھو بھی نہیں سکتا وہ جامِ آتشیں میرا

یہی دو صورتیں جلوہ نمائے حُسنِ کامل ہیں
ہے کچھ تصویرِ رعنا، کچھ تصوّر ہے حسیں میرا

چمن سے تا عدن سیماب ہے فیضِ سخن جاری
عرب بھی خوشہ چیں میرا، عجم بھی خوشہ چیں میرا

پھر مری تخیل کی زینت ہوائے جانِ شباب
مجھ کو آج اک نظم کہنی ہے بہ عنوانِ شباب
چھیڑ وہ نغمہ، ہو پیدا جس سے طوفانِ شباب

اے جواں آہنگ مطرب، اے غزل خوانِ شباب
ہائے وہ فصلِ جوانی اور وہ جوشِ جنوں،
وہ شبِ مہتاب اور وہ اک پریشانِ شباب!
عشق ہے اک جوشِ سیلابِ جوانی، تند و تیز
حسن ہے اک موجۂ رنگینِ طوفانِ شباب
آخرِ شب کھل نہ جاتی آنکھ گھبرا کر اگر
دیکھنے کی چیز تھا خوابِ پریشانِ شباب
ہیں تبسم میرا تارے، کھلکھلاں انگڑائی ہے
ہر شبِ ہستی میں ہے میرا ہی سامانِ شباب
دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے پنہاں ہوگئی
لائی تھی عمرِ شفق شامِ گلستانِ شباب
کچھ تو اس دن کے لئے محفوظ رکھتے مستیاں
یہ خبر کیا تھی کہ بے کیفی ہے پایانِ شباب
مدتوں سیمابؔ روشن کی ہے شمعِ آرزو
رنگ و بو کی انجمن میں، زیرِ دامانِ شباب

کھل گیا آخر مرا رازِ نہانِ اضطراب
ہوگیا آخر میں رسوائے جہانِ اضطراب
قلبِ مضطر میں نہ تھی گنجایشِ طوفانِ غم
بڑھ گیا منزل سے آگے کاروانِ اضطراب

مٹنے والے اضطرابِ عشق میں، کیا چیز تھے
ان کی مٹی سے بھی ملتا ہے نشانِ اضطراب

درد کے ہر لحظۂ مضطر میں ہیں حق سے قریب
اللہ اللہ رے عروجِ بے کرانِ اضطراب

لیکے آیا تھا ازل سے فطرتِ برق و شرار
عمر بھر میں نے نہ چھوڑا آستانِ اضطراب

لگ گئی آسودگانِ عیش کے محلوں میں آگ
برقِ خاطف بن گئی آہِ جہانِ اضطراب

عندلیبِ عشق کو گلشن نہ تھا کوئی پسند
شاخِ نخلِ دل پہ باندھا آشیانِ اضطراب

بیقراری ابتدائے عشق کی کیا ہوگئی
دیکھنے کی چیز تھا وہ عنفوانِ اضطراب

التہابِ عشق کی ذرّہ نوازی دیکھئے
اک مرا چھوٹا سا دل ہے اک جہانِ اضطراب

ہو رہے ہیں تذکرے میری دعائے ہجر کے
کیا فرشتے بھی سمجھتے ہیں زبانِ اضطراب!

سُننے والے کیوں نہ وں سیمابؔ سُنکر مضطرب
بیقرار ایسی زباں، ایسا بیانِ اضطراب

تا نہ آنے پائے کوئی خواب میں بھی سوئے دوست
رات بھر فرضِ تصوّر ہے طوافِ کوئے دوست

پھر مجھے آنے لگی اپنے نفس سے بوئے دوست
آگیا شاید دلِ گم گشتۂ گیسوئے دوست

اختیارِ دوست دل پر، ضبط پر قابوئے دوست
یہ مرا نالہ نہیں، دراصل ہے یا ہوئے دوست

یاد آیا میں کہ تھا ہمرنگ ذوقِ حسن و عشق

رفتہ رفتہ میری عادت ہو گئی تھی خوئے دوست
ہو چکا ہوں بارہا عذرِ نزاکت کا شہید
کر چکا ہوں امتحانِ قوّتِ بازوئے دوست
رنجِ غربت کیا کہ تیرا دوست تیرے ساتھ ہے
اے مسافر، اے غریب، اے رہگرائے کو دوست
بزمِ کثرت میں مری وحدت پرستی دیکھنا
اک نظر ہے سوئے دنیا، اک نظر ہے سوئے دوست
التفاتِ دوست پر جن کو ہے نازِ مستقل
اُن سے کہدو اک تلوّن بھی ہے جزوِ خوئے دوست
کعبے کی بنیاد اک محراب میں رکھی گئی
میکدہ کھولا گیا زیرِ خمِ ابروئے دوست
ہے ہوس کو ہمکناری وہم آغوشیِ نشاط
یعنی اک ہنگامہ ہے اندیشۂ پہلوئے دوست
کارفرمائے دو عالم ہیں اشارے دوست کے
دونوں عالم ہیں خراب جنبشِ ابروئے دوست
تکیۂ سر تھا کبھی سیماب زانو دوست کا
اب مرا سنگِ لحد ہے تکیۂ زانوئے دوست

عشق خود مائلِ حجاب ہے آج — حُسن مجبورِ اضطراب ہے آج
نالۂ دل کو دل سے لاگ نہیں — نغمہ، آزردۂ رباب ہے آج
میکدۂ غم کدہ ہی تیرے بغیر — سرنگوں شیشۂ شراب ہے آج
بزمِ عالم کو فرصتِ انجام! — میری نیت میں انقلاب ہے آج
متغیر ہے عالمِ جذبات — کون اس دل میں باریاب ہے آج
زندگی جس میں سانس لیتی تھی — وہ زمانہ خیال و خواب ہے آج

مٹ گئے دل کے ولولے سیماب
ختم افسانۂ شباب ہے آج

ہے حقیقت کی چمن کو جستجو میری طرح — رنگ و بو بھی ہے اسیرِ رنگ و بو میری طرح
تو بھی ہو سکتا ہے جانِ رنگ و بو میری طرح — پہلے پیدا کر چمن میں آبرو میری طرح
پھر ذرا ماہ و کواکب کا تکلم دیکھئے — کیجئے خاموش ہو کر گفتگو میری طرح
خونِ دل روتا ہوں نامونسِ وفا کے درد سے — کون ہے انسانیت کا چارہ جو میری طرح؟
کیا عجب میری گرفتہ خاطری کو ہو شگفت — پھول نے پائی ہے کانٹوں میں نمو میری طرح
دیکھ وقتِ صبح جب چھنتی ہے تاروں سے شراب — آ کبھی فطرت کے میخانے میں تو میری طرح
صبح کا ساقی صبوحی لے کے خود آجائیگا — بیٹھ جا آ کر کنارِ آب جو میری طرح
منہ شفق کے آئینے میں دیکھ کر نازاں نہ ہو — خود ہوا اپنے ہی لہو سے سرخرو میری طرح
لالۂ و گل کی ہے میرے بعد شکل تازگی — کون انہیں اپنا پلائے گا لہو میری طرح

محفلِ رندی و سرمستی میں ساغر بن کے آ — جذب کر کیفیتِ جام و سبو میری طرح
شش جہت سیماب ہے گہوارۂ نورِ جمال
غور سے دیکھے تو کوئی چار سو میری طرح

جسم پھر بنتے ہیں، صرفِ خاکداں ہونے کے بعد — جمع پھر ہوتے ہیں ذرّے رائیگاں ہونے کے بعد
حاصلِ سوزِ محبت تھا فنا ہونا مرا — ذوقِ پروانہ ملا، آتش بجاں ہونے کے بعد
مانعِ امن و مسرت ہے حیاتِ آشیاں — یہ سکوں ملتا ہے خاکِ آشیاں ہونے کے بعد
دود دل سے سوختہ جانی میری تعبیر کر — ناگہاں اک آگ بھڑکے گی دھواں ہونے کے بعد
پھر مجھے کرنا پڑا آغازِ غم کا انتظار — شادمانی کیوں ملی ناشادماں ہونے کے بعد
شکوۂ ہمسایہ برحق اے دلِ غمگیں، مگر — ہوش رہتا ہے کسے محوِ فغاں ہونے کے بعد
بجلیاں ٹوٹیں، بلائیں آئیں، دیکھے انقلاب، — یہ ملا ربطِ زمین و آسماں ہونے کے بعد
سیکڑوں شمعیں جلا دیتی ہے فیضِ سوز سے — چند پروانوں کی مٹی رائیگاں ہونے کے بعد
غور کر کے دیکھ، کیا تھا اور کیا ہو جائے گا — آدمی بننے سے پہلے، رائیگاں ہونے کے بعد
وصل کو سمجھا ہے دیوانے نے شاطِ زندگی — وصل ہوتا ہے فراقِ جسم و جاں ہونے کے بعد
وسعتِ ذوقِ طلب کو ختم ہوتا دیکھ کر — لوٹ جاتا ہوں قریبِ آستاں ہونے کے بعد
آگے آگے اشک، پھر کچھ دل کے ٹکڑے، پھر لہو — یوں ہوا راہی، مرتب کاروانِ نے کے بعد
ہمنوائے طائرِ سدرہ ہوں اے سیماب میں
ہمزبانِ بلبلِ ہندوستاں ہونے کے بعد

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

تسلط ہے جنوں کا اس قدر میرے بیاباں پر
اُٹھاتا ہوں جو پتھر، ہاتھ پڑتا ہے گریباں پر

لہو سے میں نے لکھا تھا جو کچھ دیوارِ زنداں پر
وہ بجلی بن کے چمکا دامنِ صبحِ گلستاں پر

اسی سے روشنی پھیلی بساطِ بزمِ امکاں پر
محبت اک بڑا احسان ہے تاریخِ انساں پر

جنوں ہوتا تو اڑتیں دھجیاں دامانِ ہستی کی
کمالِ ہوش ہے یہ ہاتھ کا رکنا گریباں پر

نظامِ جزر و مد میں ہر نفس کی آمد و شد ہے
نئے ساحل کیے ہیں میں نے قائم موجِ طوفاں پر

نہ دنیا ہے، نہ عقبیٰ ہے، نہ ہستی ہے نہ مستی ہے
یہ ہنگامہ ہے سب میری نواہائے پریشاں پر

مغنی تو اگر سن لے سراپا سوز ہو جائے
جو نغمے گائے جاتے ہیں مرے سازِ رگِ جاں پر

نہ رہ جائے یہیں نقشِ غلامی بعدِ آزادی
مری تصویر کس نے کھینچ دی دیوارِ زنداں پر

جب اے سیماب اُٹھتے ہیں کبھی الہام کے بادل
برس جاتے ہیں کچھ نغمے مرے قلبِ غزل خواں پر

اُن کی نظروں تک سائی اپنی مشکل دیکھ کر
لوٹ آتا ہوں در و دیوار محفل دیکھ کر

خاطرِ آزردہ ہوں کیوں خاکسترِ دل دیکھ کر
اب تو محفل سے اُٹھیں گے صبحِ محفل دیکھ کر

یادِ آشوبِ گذشتہ کی تباہی آ گئی
رو دیئے ہم عشرتِ یارانِ ساحل دیکھ کر

ہو گئی تکمیلِ تعمیرِ محبت یہ شکست
تم نہ گھبراؤ مرا ٹوٹا ہوا دل دیکھ کر

دل کی تنقیدِ مناسب سے نہ یوں تو بدل
مدتوں نکھرا ہے تو آئینۂ دل دیکھ کر

اب یہ سوچا ہے پیامِ بے نیازی دوں تجھے
اپنے اعلانِ وفا کو حدِ فاصل دیکھ کر

میں حدودِ عالمِ ظاہر سے آگے بڑھ گیا
اس جہانِ رنگ و بُو کا حسنِ باطل دیکھ کر

ذرّہ ذرّہ رہگذرِ کارواں گیا ہے راہبر
کاروانِ شوق کو آوارۂ منزل دیکھ کر

آگئی ہستی فریبِ عشرتِ تخلیق میں
ایک دُھندلا سا خوشی کا نقشِ باطل دیکھ کر

بے تعیّن ہو گیا منزل سے وہ دیرآشنا
کوششِ پائے طلب منزل آ منزل دیکھ کر

اب بتا اے جانِ محفل تجھ کو دیکھوں یا نہیں
شوخیٔ نظارۂ یارانِ محفل دیکھ کر؟

میرا ذوقِ حسن کوشی بن گیا دامانِ طور
تیرے جلووں کو شریکِ قسمتِ دل دیکھ کر

اک تری تصویر رعنا بھی قلم نے کھینچ دی
خوب سوجھی فطرتِ رنگینیٔ دل دیکھ کر

خامۂ تقدیر کی قوت میں لرزش آگئی
پھٹ گیا سینہ مری قسمت کا حاصل دیکھ کر

آدمیّت کے حجابوں میں کیا پیدا تجھے
آدمی کو تجھ پہ مٹ جانے کے قابل دیکھ کر

ایسی دولت، اور بے مانگے، بہت مسرور ہوں
غم کو اپنی سعیٔ لاحاصل کا حاصل دیکھ کر

کر نہ تکلیف اپنی محفل سے اُٹھانے کی ہمیں
ہم تو خود اُکتا رہے ہیں رنگِ محفل دیکھ کر

آ کہ دل میں ہیں تری اندازکی گنجائشیں
تجھ کو رعنائی ملی ہے وسعتِ دل دیکھ کر

میں نے پھر طوفاں کی جانب اپنی کشتی پھیر دی
پھر گیا دل انتشارِ گردِ ساحل دیکھ کر

اب یہی ضد ہے تو ان ٹکڑوں کو پھر ترکیب دے
لیکن اندازِ شکستِ شیشۂ دل دیکھ کر

یاد آجاتا ہے اے سیمابؔ عہدِ قبلِ عشق
دل بھر آتا ہے سکونِ ماہِ کامل دیکھ کر

جو سالک ہے تو اپنے نفس کا عرفان پیدا کر

حقیقت تیری کیا ہے؟ پہلے یہ پہچان پیدا کر
وجود اک نقطۂ ایجاد ہے، ثابت اسے کر دے
نیا پہلو میں دل، پھر دل میں تازہ جان پیدا کر
مذاقِ "بے ہمہ بودن" اگر پیدا ہی کرنا ہے
نہ ہو سامان جس میں کوئی، وہ سامان پیدا کر
حصولِ مدعا بھی کوئی شئے ہے، چھوڑ دے اسکو
حصولِ مدعا سے بڑھ کر ایک ارمان پیدا کر
مزہ جب ہے سراپا اضطرابِ شوق بن جائے
تُو اپنے دل کی یکسوئی میں بھی ہیجان پیدا کر
جہاں جانے کو سب دشوار ہی دشوار کہتے ہیں
وہاں جانے کا کوئی راستہ آسان پیدا کر
جمالِ آشنا سے اپنے دل کو کر نہ آسودہ
کوئی بیخود کہیں سے لا، کوئی حیران پیدا کر
تصور اُڑ کے جانے ہی نہ پائے چشمِ عرفاں سے
جہاں اُس کا تصور ہے وہیں ایمان پیدا کر
حقیقت کا کہے جو حال، کر ایسی زباں پیدا
محبت کے سنیں جو گیت ایسے کان پیدا کر

حدودِ عالمِ تکوین میں سب ممکن ہی ممکن ہے
تو نا ممکن کے جھگڑے میں نہ پڑ، امکان پیدا کر

الٰہی بھید تیرے اس نے ظاہر کر دیئے سب پر
کہا تھا کس نے، تو سیمابؔ کو انسان پیدا کر

بصیرت کو عطا کر دستیں، جلوہ نما ہو کر
حقیقت آشنا ہو جاؤں، صورت آشنا ہو کر

وہ بامِ طور پر کیوں آئے عالم آشنا ہو کر
مذاقِ دید پیدا کر دیا جلوہ نما ہو کر

نہ ضبطِ جور آساں ہے، نہ ترکِ عشق ممکن ہے
میں کس مشکل میں ہوں یارب پریشانِ وفا ہو کر

میں اب سمجھا، تمہارے جورِ پیہم کا یہ مطلب ہے
کہ مانوسِ جفا ہو جاؤں مایوسِ وفا ہو کر

اُسی دل کی ضرورت پھر ہوئی ہے عہدِ پیری میں
جسے ہم پھینک آئے تھے جوانی میں خفا ہو کر

مُرادے آرزو دل کی، دلوں کی آرزو بن جا
کہاں بیٹھا ہوا ہے سر گرانِ مدعا ہو کر

جنونِ عاشقی اور قیدِ زنداں، اے معاذ اللہ
مری کیفیتیں خود رہ گئیں زنجیرِ پا ہو کر

خلافِ رسمِ دنیا، جو شعارِ عشق ہوتی ہے
وہ ہی اک بات رہ جاتی ہے قانونِ وفا ہو کر

پراگندہ کیا ہے دفترِ حسنِ محبت کو
ہوس کے چند حرفوں نے شریکِ مدعا ہو کر

بڑھانا چاہتا ہے حسن، نظارے کی حیرانی
ہر اک صورت، ہر اک تصویر سی جلوہ نما ہو کر

انہیں سے کائنات اک نغمۂ نو اخذ کرتی ہے
مرے دو بول رہ جاتے ہیں محفوظِ فضا ہو کر

چھپی برقِ تجلی کو نہ کر، موسیٰ، تو شکوہ کیا
تماشا تھا، بامدادِ تمنا رہ گیا ہو کر

خودی دیجو خدایا سیمابؔ کچھ مجھ میں نہیں لیکن

مرے پندار میں کوئی جھلکتا ہے خدا ہو کر

آ، کہ ہستی بے لبِ بے گوش ہے تیرے بغیر
کائنات اک محشرِ خاموش ہے تیرے بغیر

تو نہیں تو رات ہے محرومِ سوزِ زندگی
شام ہی سے چاندنی روپوش ہے تیرے بغیر

ایکہ تیرے حسن میں قصاں ہیں لاکھوں میکدے
تشنۂ بادہ لبِ مے نوش ہے تیرے بغیر

آ، کہ پھر دل میں نہیں اٹھتی کوئی موجِ نشاط
سرد پانی، بادۂ سرجوش ہے تیرے بغیر

نیند آ آ کر اچٹ جاتی ہے تیری یاد میں
تارِ بستر نشترِ آغوش ہے تیرے بغیر

جلوۂ ہر روز، جو ہر صبح کی قسمت میں تھا
اب وہ اک ہندلا سا خوابِ دوش ہے تیرے بغیر

زندگی تجھ سے عبارت تھی، مگر جب تو نہیں
زندگی کا اپنی کس کو ہوش ہے تیرے بغیر

زحمتِ تکیہ ترے زانو کو دیتا ہے خیال
سر بہ ہر پہلو دبالِ دوش ہے تیرے بغیر

بیٹھ کر بوندوں میں کس کے ساتھ دیکھوں گا بہار
ابر کی آمد و داعِ ہوش ہے تیرے بغیر

آ، کہ موضوعِ غزل کو ڈھونڈتی ہے ہر نگاہ
نغمۂ مطرب بلائے گوش ہے تیرے بغیر

کیا خبر سیماب کب گھبرا کے دیدے اپنی جان
ضبط گو اب تک تحمل کوش ہے تیرے بغیر

مجھے فکرِ سرِ وفا ہے ہنوز
بادۂ عشق نارسا ہے ہنوز

بندگی نے ہزار رخ بدلے
جو خدا تھا وہی خدا ہے ہنوز

او نظر دل سے پھیرنے والے
دل تجھی پر مٹا ہوا ہے ہنوز

ساری دنیا ہوئی امید تو کیا
مجھے تیرا ہی آسرا ہے ہنوز

نہ وہ سرمستیاں نہ فصلِ شباب — عاشقی صبر آزما ہے ہنوز
دل میں تجھ کو چھپائے پھرتا ہوں — جیسے تو میرا مدعا ہے ہنوز
آستاں سے ابھی نظر نہ ہٹا — کوئی تقدیر آزما ہے ہنوز
دل میں باقی ہے سوزِ غم شاید — ہر نفس میں گداز سا ہے ہنوز

محویت بے سبب نہیں سیمابؔ
روح پر کوئی چھا رہا ہے ہنوز

میری مرگِ قفس کی عمر دراز — لے اڑی مجھ کو کاہشِ پرواز
کر نہ جام و سبو پر اتنا ناز — تو ہے ساقی تو میں ہوں ساقی ساز
کوئی در ہے نہ کوئی سجدہ نواز — یہ کہاں جھک گئی جبینِ نیاز؟
شورِ ہستی ابھی ذرا ٹھہرے — سن رہا ہوں ضمیر کی آواز
رفتہ رفتہ سمجھ میں آئے گا — میرا نغمہ ہے دور کی آواز
اپنی نظروں پر اعتبار نہ کر — ہیں مظاہر یہاں بصیغۂ راز
میری بے اختیاریوں کی نہ پوچھ — نہ حقیقت ہی بس میں ہے نہ مجاز
کر رہی ہے خود آشیاں سے قریب — میرے لیل و نہار کی پرواز
روح میں نغمہ خواں ہے کوئی ضرور — ہر نفس میں ہے ساز کی آواز

نہیں مایوسِ بندگی سیمابؔ
اُسکا بندہ ہوں جو ہے بندہ نواز

دے ابتو مجھے نہ طعنۂ ہوش — لے تجھ کو بھی کر دیا فراموش!
فرقت تری موت سے نہیں کم — ہے قبر کی طرح رات خاموش
وہ ایک جھلک حیاتِ کونین — وہ ایک نظر وداعِ صد ہوش
اب رات نہ آئے یہ دُعا ہے — کیا عرض کروں فنا نہ دوش
وہ ہوتے ہیں ہمکلام مجھ سے — جب ہوتی ہے کائنات خاموش
اللہ رے فروغِ خلوتِ غم — کون آگیا آفتاب بردوش!

ہے اب بھی تصور انکا سیماب
فردوسِ نظر بہار آغوش

اب اجتناب اُنھیں مجھ سے ہے بجائے خلوص — مرے خلوص کا یہ ہے مآل ہائے خلوص!
مجھے خلوص کی حسرت تھی بربنائے خلوص — وہاں وہ ہی ہے فریبِ کرم سزائے خلوص
ہزار شکوے ہیں بے مہریٔ جہاں کے مجھے — سُنے بھی کوئی مگر میرا اجرائے خلوص
یہ آبگینہ نہیں، آبِ آبگینہ ہے — نہ دیکھو گرم نظر سے، نہ چوٹ کھائے خلوص!
نگاہ پاک ہے، نیت ہے صاف، دل خالص — ہمارے پاس نہیں کچھ بھی ماسوائے خلوص
مجھے بتا کہ سزائے خلوص کیا ہو گی؟ — الٰہی جور و ستم ہے اگر جزائے خلوص
نگاہِ حُسن سے کیا لوں میں انتقامِ فریب — نہ اقتضائے محبت نہ اقتضائے خلوص

نہ کر خلوص بڑھانے کی فکر اے سیماب
بہت خراب ہے انجامِ انتہائے خلوص

التفات اُن کا مرے حالِ پریشاں کیطرف ایک موجہ سا ہی نکہت کا بیاباں کی طرف
مطمئن ہو کے کبھی سُن تو سہی سازِ ضمیر اب بھی در پردہ ہی مائل کوئی اُنساں کی طرف
روح پر چھائے ہوئے ہیں وہ بصد رنگ و نوا دلمیں بیٹھے ہیں نگاہیں ہیں رگِ جاں کی طرف
پھر کوئی جلوہ ترنم میں ہوا جمرہ کشا سب کی نظریں ہیں مرے قلبِ غزلخواں کی طرف
پردہ رکھ لی میری رسوائی کا اے مستِ شباب آستیں اپنی بڑھا چاک گریباں کی طرف
جن کی نظروں میں یہ مستی ہے فقط عیش و نشاط بھیجدے یارب اُنھیں گورِ غریباں کی طرف
پھر گئی میری نگاہوں میں مساواتِ زوال چاند جب چھپنے لگا گورِ غریباں کی طرف
اُف رے یہ زورِ جنوں اُف رے یہ ایامِ بہار ہر ایک شے کی کشش میری ہی داماں کی طرف

فصلِ رنگیں کا ہوا سیمابؔ اثر جلوہ نما
اُڑ کے پروانہ چلا شمعِ فروزاں کی طرف

عشق ہے ہمنوائے حسن، حسن نوازِ عشق رحمتِ کائنات ہے نغمۂ حسن و سازِ عشق
اہلِ وفا گذر گئے مٹ گیا جادۂ رضا دامنِ ریگزار پر پھر نہ ہوئی نمازِ عشق
تیرے حریمِ ناز میں سجدے وہ کیوں ادا کرے جس کو خدا عطا کرے فطرتِ بے نیازِ عشق
محفلِ اہلِ حسن میں آئے ہیں اس کو بیچنے عشق کا دل خرید لے ہو کوئی دلنوازِ عشق
عشق کی تھی جو ابتدا، ہے وہ ہی اسکی انتہا کس کی سمجھ میں آئیگا یہ سلسلۂ درازِ عشق
باطنِ عشق سے ترا ذہن نہیں ہے آشنا تو یہ کہاں ٹھہر گیا، حیرتیِ مجازِ عشق
فارغِ مدعا بھی ہے، پھر ہوسِ وفا بھی ہے کیا تو جنوں زدہ بھی ہے؟ واہ ری پاکبازِ عشق!

جل گئی اُس کی روح میں شمعِ حیاتِ جاوداں
جس کو خدا نے وارثیِ بخشِ یا گدازِ عشق

نظر کو عجزِ رفعت ہے تجلّی گاہِ جاناں تک
تجلّی خود چلی آئے کسی دن چشمِ حیراں تک

برائے قبر لیتی آئے خاکِ آشیاں میری
ہوائے گل اگر تکلیف فرمائے بیاباں تک

نظر کو علم ہے چشمِ تماشا کی اسیری کا
پشیماں کیوں ہو جا کر روزنِ دیوارِ زنداں تک

بڑے تاریک، لمبے، اور پیچیدہ دوراہے ہیں
تری زلفِ پریشاں سے مری قلبِ پریشاں تک

تماشا در تماشا، محوِ نازش، صرفِ حیرانی
نظر کس رنگ سے پہونچی تجلّی گاہِ جاناں تک

یہی قطرے جھلکتے ہیں یہی ذرے چمکتے ہیں
فضائے شبنمستاں سے بساطِ انجمستاں تک

الٰہی کام آ جائے دعا یارانِ ساحل کی،
تباہی کھینچ لائی ہے مری کشتی کو طوفاں تک

مٹایا کاہشِ واماندگی نے اس قدر مجھ کو
کہ آخر ایک ذرّہ بھی نہ پہونچا کوئے جاناں تک

شعاعِ آفتابِ عشق کتنی شوخ فطرت تھی
فرشتوں کی نظر سے چھپ کے پہونچی قلبِ انساں تک

جسے کہتے ہیں رنگِ بزم ہے موقوفِ ویرانی
یہ سب رونق ہے پروانوں کی اجزائے پریشاں تک

مبارک ہو دلِ سیمابؔ کو آشوبِ سینائی
نگاہِ شوق جا پہونچی تجلّی گاہِ جاناں تک

ہر سحر کو ہے سرِ ہر مگئی صبحِ رنگ
مشرقِ حسنِ جوانی ہے فریبِ آب و رنگ

تنگنائے دل میں طوفانِ مستی یہ اُمنگ!
بند اک نقطے میں ہے گویا طلسمِ کیف و رنگ

ہے فنا فی الحسن ہونا عشق میں عینِ بقا
آگ ہو جاتا ہے خود بھی آگ میں جل کر پتنگ

فصلِ گل میں ہو فلک پرداز، پروازِ نمو
نکہتیں بنکر فضاؤں میں اڑا پھرتا ہے رنگ

دل ہدف ہونے تک اک رنگین آنسو رہ گیا
تھا فقط یک قطرہ خوں مقسومِ آغوشِ خدنگ

سبزۂ مینائی پر سینے سے ہیں ابھرے ہوئے
ہو شبابِ صبحِ گلشن چند کلیوں کی اُمنگ

عشقِ رسوائی کی لاکھوں منزلیں طے کر چکا
عقل ہو اب تک اسیرِ اعتبارِ نام و ننگ

کس قدر وسعت ہو اے سیماب ظرفِ عشق میں
حسن کے صد رنگ جلوے اور ایک آغوشِ تنگ

کھل گیا صبح سے پہلے درِ میخانۂ دل
جسقدر پھول کھلے بن گئے پیمانۂ دل

سازِ فطرت ہو مرا آوازِ طرب خانۂ دل
سر جھکا کر کبھی سن نغمۂ مستانۂ دل

مدتیں ہوگئیں لب خشک ہے پیمانۂ دل
پھر ضرورت ہو تری ساقیٔ میخانۂ دل

تھا کبھی عرش درِ آغوش نہاں خانۂ دل
اب تو انسان کا گھر بھی نہیں کاشانۂ دل

یوں تو پتھر لئے پھرتے ہیں سبھی پہلو میں
دل وہ دل ہو جو محبت میں ہو دیوانۂ دل

شکریہ اے نگہِ ظرف شناسِ ساقی
اب نہ خالی ہے نہ لبریز ہو پیمانۂ دل

بجھ گئی برقِ سرِ طورِ زمانے گزرے
سر دا بتک نہ ہوئی گرمیٔ افسانۂ دل

کس سے لوں داد تپش ہائے محبت یارب
بھیجدے شمع کوئی قابلِ پروانۂ دل

کعبۂ دل تو حقیقت کی ہو پہلی منزل،
اور کچھ بڑھ کے پہونچ تا درِ بتخانۂ دل

دیکھ اے شمعِ جوانی کے بجھانے والے!
ہے بدستور ابھی رقص میں پروانۂ دل

کس نے دیکھی ہو حقیقت کی تجلی سیماب

ہے غنیمت کہ نگاہیں نہیں بیگانۂ دل

شبستاں میں ہو شمع پروانہ چیں تم — گلستاں میں ہو بوئے غنچہ نشیں تم
کبھی مصر کی نکہتِ نازنیں تم — کبھی طور کا جلوۂ سرمگیں تم
کہیں حسن کی تم ہو رنگیں بشارت — کہیں عاشقی کا پیامِ حزیں تم
کبھی پھول بن کر کبھی اشک بن کر — ہو رنگینیٔ دامن و آستیں تم
بیاباں کے ذرّوں میں تم جلوہ آرا — پہاڑوں کی چوٹی پہ تنہانشیں تم
اشاروں میں بجلی کے تم کوندتے ہو — ستاروں میں ہو لرزشِ شرمگیں تم
کہیں رازِ جذباتِ الہام تم ہو — کہیں سازِ نغماتِ روح الامیں تم
کھلے تو ہوئے رنگِ کثرت کا مظہر — چھپے تو ہوئے لامکاں کے مکیں تم
غرض یہ کہ اٹھیں جدھر بھی نگاہیں — بصد رنگ بو جلوہ گر تھے تمھیں تم

مگر جب بصد غور ڈھونڈا تو پایا
کہ ہو ہر جگہ اور کہیں بھی نہیں تم

کتابِ محبت کا حرفِ غلط میں — نگاہِ مسرّت کا حق الیقیں تم
ہے پائے طلب خستۂ دیر و کعبہ — کسی شکل سے مل بھی جاؤ کہیں تم
فریبِ طلب ہیں تمہاری ٹھکانے — کسی کو تو ملتے جو ہوتے کہیں تم
تمہاری مسیحائی میں جانتا ہوں — کہ ہو دل کی ہر رگ رگ میں نشتر آفریں تم
یہ ہے حاصلِ داستانِ محبت — ہو جانِ فسانہ کہیں میں کہیں تم

کڑی ہے ہمارے فسانے کی دنیا کبھی قیس و لیلیٰ بنے تھے ہمیں تم
تمہارا ہی سیماب ہو عکسِ لرزاں
ہو سیماب کے دل میں پرتو نشیں تم

اک تڑپ رکھتے ہیں دل میں، برقِ صد کاشانہ ہم
کیوں کسی سے مانگنے جائیں چراغِ خانہ ہم

ضبط سے ناآشنا ہم، صبر سے بیگانہ ہم
انجمن میں ہیں شریکِ قسمتِ پروانہ ہم

کیوں در و دیوار بھی ہوں واقفِ حالِ تباہ
توڑ دیتے ہیں چراغِ شامِ ماتم خانہ ہم

خود ہی سازِ بے خودی کو چھیڑ دیتے ہیں کبھی
خود ہی سنتے ہیں حدیثِ ساغر و پیمانہ ہم

دفعتاً سازِ دو عالم بے صدا ہو جائے گا
کہتے کہتے رک گئے جس دن ترا افسانہ ہم

وحدت و کثرت میں ہیں دو جلوہ گاہیں دوست کی
اک تجلی خانہ دنیا، اک تجلی خانہ ہم

شمعِ ایوانِ حرم ہو یا چراغِ طاقِ دیر
ہم کو دونوں سے تعلق ہے کہ ہیں پروانہ ہم

غم کی تاریکی میں خود جل کر لگا لیں کیوں نہ آگ؟
خود بھڑک کر کیوں نہ بن جائیں چراغِ خانہ ہم
اے معاذ اللہ! شبِ تاریکِ غم کا اہتمام
صبح سے کرتے ہیں تجویزِ چراغِ خانہ ہم
یہ تڑپ، یہ سوز آگینی، یہ ظرفِ مختصر
غور سے دیکھا کئے پیراہنِ پروانہ ہم
دل جلا، پھر خود جلے، پھر ساری دنیا جل اٹھی
سوز لائے تھے بمقدارِ پرِ پروانہ ہم
جب ہمیں دیوانہ بننا ہے تو کیسی مصلحت؟
مصلحت کو بھی بنالیں گے ترا دیوانہ ہم
بسکہ ہے سیمابؔ بے مہری یگانوں کا شعار
ہیں رہینِ التفاتِ خاطرِ بیگانہ ہم

تجلیاتِ حقیقت کا آئینا ہوں میں،
خدا نمائی یہی ہے کہ خود نما ہوں میں
نہ ابتدا ہوں کسی کی نہ انتہا ہوں میں،
بس ایک خوابِ سحر نا تمام سا ہوں میں
خجل ہے ذوق، نہ شرمندۂ وفا ہوں میں،
جو کام مجھ سے ہے ممکن وہ کر رہا ہوں میں
نہ سمجھیں بزم میں یارب وہ میرازِ سکوت
خموش رہ کے بھی اک بات کہہ رہا ہوں میں
نہ پوچھ مجھ سے وفا و جفا کی خود غرضی
کہ ان حدود سے آگے نکل گیا ہوں میں

اسی سے فیصلہ کر مشکلاتِ طوفاں کا — خدا پکار رہا ہے کہ ناخدا ہوں میں!
سنبھالنے مجھے آئی ہے احتیاطِ خودی — جب اپنی موج میں تا دُور بہہ گیا ہوں میں
نوید میرے تصور کے دست و بازو کو — حریمِ حسن کے پردے اُٹھا رہا ہوں میں
تُو انتظار میں اپنے یہ میرا حال تو دیکھ — کہ اپنی حدِّ نظر تک تڑپ رہا ہوں میں
جلالِ مشربِ منصور، اے معاذ اللہ! — کسی نے پھر نہ کہا آج تک خدا ہوں میں

صدا کہاں کہ سراپا میں سوز ہوں سیماب
جو ساز ہوں تو کہوں، ساز بے صدا ہوں میں

کر دو خبر امید کی منزلِ پاگداز میں — پھر ہے نمودِ کارواں رہ گذرِ نیاز میں
یوں نہ جلا مثالِ شمع تو مجھے بزمِ ناز میں — طُور بنا کے پھونک دے وادیٔ سوز و ساز میں
کیفِ مئے الست تھا، نغمہ نے نواز میں — ہو گیا نے سراں خموش ایک نوائے راز میں
سجدۂ عشق کے لئے حیلۂ عجز چاہیے — فلسفۂ نیاز ہی مشغلۂ نماز میں
عشق میں گھُل کے جان دے مُردۂ صد حیات لے — ہے نئی ایک زندگی شمع کے ہر گداز میں
پیکرِ غزنوی میں دی عشق نے دادِ بندگی — حسن نے کیں حکومتیں بندگیٔ ایاز میں
نظرتِ حسن سے کہو اور کلیم بھیجدے! — خامشیٔ ناگوار ہے انجمنِ نیاز میں
تم تو خدائے حسن ہو، تم سے گلہ نہیں، مگر — چاہیے کچھ نیاز بھی بادہ کشانِ ناز میں
مشربِ حسن و عشق میں ترکِ گنہ قصور تھا — میری وفا کھٹک گئی چشمِ خطا نواز میں
سرخوشِ بادۂ نظر تشنۂ جام و مے نہیں — جب سے کھلا ہے میکدہ نرگسِ نیم باز میں

رقص میں آئے وارفتہ سیکڑوں آستانِ ناز
سجدے ابھی بنے ہی تھے میری سرِ نیاز میں

کام ممکن کوئی دورِ غمِ دوراں میں نہیں
مجھے دھوکا ہے کہ میں عالمِ امکاں میں نہیں

کثرتِ داغ سے ہوں میں چمنستاں بکنار
کون سا پھول ہے جو میرے گلستاں میں نہیں

اشکِ افتادہ کے کچھ قطرے ہیں سرمایۂ غم
گوہر و لعل مرے گوشۂ داماں میں نہیں

دلِ افسردہ بتا اب کے یہ کیسی ہے بہار؟
پاؤں چکر میں نہیں ہاتھ گریباں میں نہیں

اک تمنا سے کبھی دل میں تھے لاکھوں ساماں
اب تمنا بھی دلِ بے سر و ساماں میں نہیں

صحنِ گلشن میں بنے پھرتے ہیں دامانِ بہار
چند ٹکڑے جو مرے چاکِ گریباں میں نہیں

ہے فقط دل سے یہ ہنگامۂ عالم سیمابؔ
دل بدستور ہے باقی، مگر انساں میں نہیں

جو تھی مخدوشِ ترے بے انتہا جلووں کے طوفاں میں
وہ بجلی جذب ہو کر رہ گئی ترکیبِ انساں میں

کوئی آسودگی ممکن نہ تھی دنیائے امکاں میں
مسلسل اک تباہی تھی مرے خوابِ پریشاں میں

جنوں پہونچا بیاباں میں، بہار آئی گلستاں میں
یہ دونوں کیوں نہ آ بیٹھے مرے چاکِ گریباں میں؟

شباب اک سانحہ تھا، ہو چکا، اب صرف کاہش ہے

مری راتیں مجھے الجھا گئیں خوابِ پریشاں میں
بس اب رہنے بھی دے اے مدعی، میں تجھ سے کیوں کہہ دوں
کہ مجھ کو کیا نظر آنے لگا تصویرِ جاناں میں
دلِ غمگیں مداراتِ ستم کی بات رہ جائے
لہو کی بوند بن کر جذب ہو جا نوکِ پیکاں میں
تصور نے اُبھر کر نقشِ حسرت کر دیا پھیکا
نئی دنیا نکل آئی مری دنیائے حرماں میں
تجلّی کے لئے انسان ہے آوارۂ عالم
تجلّی خود پناہیں ڈھونڈتی پھرتی ہے انساں میں
وہ جوہر جو فضا کو رنگ و بو تقسیم کرتا ہے
پھر آجاتا ہے شبنم بن کے دامانِ گلستاں میں
دمِ گریہ حدیں ملتی ہیں دنیائے تصوّر کی
یہ لرزش میرے اشکوں میں ہے یا تصویرِ جاناں میں
تو اپنا غم عنایت کر، کہ ہنگامہ ترے غم کا
سما سکتا نہیں تو گونج سکتا ہے رگِ جاں میں
بتا اے ناخدا ساحل بتا، یا غرق ہونے دے
یہ طوفاں میں دلاسے! اور پھر اس تیز طوفاں میں!!

مرے سامان خود خلّاق ہیں میری تباہی کے
جنوں نے پرورش پائی ہے آغوشِ گریباں میں
نہ جانے کون سی، یہ صنف ہے اسرارِ قدرت کی
ابھی تک کاوشیں ہیں عقل کو تحقیقِ انساں میں
ذرا کھل کر پکارا اے صورِ مجذوبانِ الفت کو
یہ دیوانے کہیں بیٹھے نہ رہ جائیں بیاباں میں
روایاتِ محبت میں نہ تبدیلی ہوئی اب تک
ہزاروں انقلاب آتے رہے تاریخِ انساں میں
کسی کا عشق ہے سیمابؔ صرفِ کارفرمائی
یہ اک پہلو نہاں ہے میرے ہر کارِ نمایاں میں

دل میں سب کچھ ہے مگر اظہار کے قابل نہیں
دوسرا دل ہی ہمارا عقدۂ مشکل نہیں
دل کو مٹنے سے بچا لینا کوئی مشکل نہیں
میں تو چپ ہوں کہ وہ کافر خدائے دل نہیں
لذتِ ایذا سے خوش ہے خاطرِ ایذا پسند
میں وہ مضطر ہوں کہ محتاجِ سکونِ دل نہیں
سادگیہائے تمنا کے فریبی کیوں چھوڑ دوں؟
مجھ کو پروائے حصولِ مدعائے دل نہیں
کثرتِ حسنِ تماشا ہے ہجومِ حشر میں
میں ہوں کثرت تصور سے ترے غافل نہیں
شکوۂ بے التفاتیہائے بیگانہ فضول
دوستوں سے لذتِ حسنِ وفا حاصل نہیں
سرفروشانِ محبت کو نویدِ امتیاز!
محشرِ اہلِ وفا میں پرسشِ قاتل نہیں

قیس بن کر پھر نہ اٹھا کوئی خاکِ نجد سے عاشقی دشوار ہے لیلیٰ وشی مشکل نہیں

بحرِ ہستی میں ہوں میں سیمابؔ ہم کیشِ حباب
مجھ کو فکرِ ناخدا و کشتی و ساحل نہیں

گوارا اتنی زحمت اُٹھانے والے کا رواں کر لیں اسیروں کی طرف سے بھی طوافِ گلستاں کر لیں
اجازت دے کہ اپنی داستانِ غم بیاں کر لیں ترے احساس اور اپنی زباں کا امتحاں کر لیں
حیاتِ جاوداں بھی عشق میں برباد کر لیں گے متاعِ ہستیٔ فانی تو پہلے رائیگاں کر لیں
بہارِ بوستاں کی ہستی رنگیں بس اتنی ہے کوئی اک گیت گا لے پھول پڑ اور ہم فغاں کر لیں
نشاطِ ذوق بھی ہیں اور تکلیفِ تمنا بھی حقیقت میں وہیں ویسے ہی جیسا ہم گماں کر لیں
یہ سازش کر رہے ہیں چند تنکے آشیانے کے کہ بجلی کو کسی صورت اسیرِ آشیاں کر لیں
شبِ غم اے تصور، ان کو مجبورِ تبسم کر مرتب اس اجالے میں ہم اپنی داستاں کر لیں
ذرا انبوہ سے منزل پہ پہونچیں قافلے والے جنازے مرنے والوں کی شریک کارواں کر لیں
ہنسے پھول، اور کلیاں تھرتھرائیں، اڑ گئی شبنم ارادہ تھا کہ ان پر اعتبارِ رازداں کر لیں
یہ خاکستر ہے پروانوں کی، اور اتنی گذارش ہے کہ ہم اک دل بنا لیں آپ اس کا امتحاں کر لیں

ٹھکانہ ہو کہاں سیمابؔ پھر ناز آفرینی کا
اگر ہم اپنے دل کو بے نیازِ دو جہاں کر لیں

عزمِ فریاد، ہیں اے دلِ ناشاد نہیں! مسلکِ اہلِ وفا ضبط ہے فریاد نہیں
حاصلِ عشق بجز خاطرِ ناشاد نہیں یہ غنیمت ہے کہ محنت مری برباد نہیں

نشۂ شبنم سے نہیں ربطِ شمیم و نکہت — شبنم آوارہ ہے، پھر یہ کہ چمن زاد نہیں
غم کی حد یہ ہے کہ احساسِ خوشی تک نہ رہے — ابھی شائستۂ تسکینِ دلِ ناشاد نہیں
انھیں بکھرے ہوئے پھولوں میں ہمارا دل تھا — تجھے اے خانہ برانداز چمن یاد نہیں!
اور بھی ذہنِ مصور میں ہیں نقشے محفوظ، — خوبصورت ہو، مگر حاصلِ ایجاد نہیں
میرے معیارِ محبت کا خدا حافظ ہے — تم بھی اب وجہِ سکونِ دلِ ناشاد نہیں
تم نہ آئے مرے دل کے لئے غم بھیج دیئے — شکریہ، اب بھی مری انجمن آباد نہیں
اے مری قیدِ تمنا کے بڑھانے والے — غیرِ محدود ترے حسن کی میعاد نہیں
دل کی تجدید کا تھا عزم مگر کیا کہئے — ذہنِ تخلیق میں گنجائشِ ایجاد نہیں
بزمِ افسانہ کرو ختم، جوانی گذری — قابلِ ذکر اب آگے کوئی روداد نہیں
آہ غم خانۂ غربت کی جنوں سامانی — ہے جہاں تک مری دنیا کوئی آباد نہیں

موت ہے روح کی معراج تو پھر اے سیماب
یہ علو ہے مری دانست میں اُفتاد نہیں

اے رشک! ہو یہ کیا انصاف عاشقی میں، — تصویرِ مدعا ہے، آغوشِ مدعی میں
پوجا ہے جب سے تجھ کو محرابِ بیخودی میں — سو حسن بڑھ گئے ہیں آدابِ بندگی میں
میں ترجمانِ دل تھا تصویر بے کسی میں — اک مدعا نظر ہیں، اک بات خامشی میں
تھے خود نمائیوں کے انداز بے خودی میں — ہم ہو گئے تماشہ آخر تری گلی میں
بعدِ شباب کتنی بے لطفیاں ہیں طاری — جیسے کوئی کمی ہو سامانِ زندگی میں

کشتی ہی تو بیٹھی میری شکستہ بخستی، ساحل نظر جب آیا، تاروں کی روشنی میں
آنسو کا قطرہ قطرہ، موجِ حیات نکلا لختِ جگر کسی میں خونِ جگر کسی میں
فرقت میں آنسوؤں کے دریا بہا رہا ہوں موجیں بڑھا رہا ہوں طوفانِ زندگی میں
یہ تیری جستجو کا انجام سوچتا ہوں میں جستجو سے تھک کر کھو جاؤں گا کبھی میں
بے پردہ جلوہ گر ہو گل خانۂ نمود سے او مسکرانے والے کھلتی ہوئی کلی میں
شاید پتہ لگا لے یک رنگیٔ تخیل میں ڈھونڈنے خدا کو نکلا ہوں بیخودی میں
کی اپنے ڈھونڈنے کی تحریک بھی مجھی سے پھر یہ ستم ظریفی! وہ آپ چھپا مجھی میں
معمورۂ فنا کی کوتاہیاں تو دیکھو اک موت کا بھی دن ہے دو دن کی زندگی میں

سیمابؔ کب ہے دنیا، حسن وفا سے خالی
اب بھی وفا ہے باقی، لیکن کسی کسی میں

جس کو نہ تابِ ضبط ہو، بارِ وفا اٹھائے کیوں؟
وصل میں انتظار کیا، ہجر میں ہائے ہائے کیوں!
کیوں ہو گلی گلی تباہ، ٹھوکریں سب کی کھائے کیوں؟
تیرا خراب آرزوؤ بزم سے تیری جائے کیوں؟
کیوں نہ ازل میں ہو گئے۔ ضبط و وفا کے فیصلے
حسن اگر ہو مطمئنِ عشق کو آزمائے کیوں؟
سارا جہاں ہے تیرا گھر، چاہیئے وسعتِ نظر

سعی کرے کوئی اگر تیرا پتہ نہ پائے کیوں؟

ذرّۂ رہگذارِ دوست کعبۂ اہلِ عشق ہے
جس کو مذاقِ عجز ہو خاک سے سر اُٹھائے کیوں؟

سوزِ وفا کی معرفت شمع کو ہو اگر نصیب
اپنی ہی لَو میں خود جلے دوسروں کو جلائے کیوں؟

مجھ کو ہے تیرا انتظار، اس لئے ہوں میں بیقرار
گر نہ ہو تجھ پہ اعتبار، صبر بھر آنہ جائے کیوں؟

حشر سُنا نہیں ہے کیا، میری شبِ فراق کا؟
جس کا ہے سب کو انتظار اب وہ قیامت آئے کیوں!

وحشتِ دل ہوئی فزوں، چارہ گروں کو ہے جنوں
بدِ نظر جو تھا سکوں اُس کی گلی میں لائے کیوں؟

جس کو یقین ہو کہ تو جلوہ نما ہے چار سو
وہ تری جلوہ گاہ میں اپنی نظر اُٹھائے کیوں؟

غم تھا اگر نہ سازگار، موت نہ تھی جو خوشگوار،
آدمی بنکے وارثی بزمِ جہاں میں آئے کیوں؟

شکستہ پا ہوں، شریکِ اپنے کارواں میں نہیں، مرے نصیب کی گردش بھی آسماں میں نہیں
یہی تو قوتِ تحقیق باغباں میں نہیں، کہاں گئیں وہ بہاریں جو بوستاں میں نہیں!

حواس جمع نہیں، ربط جسم و جاں میں نہیں
جو چاہتا ہوں وہ ترتیب کارواں میں نہیں

ہر ایک دل کو ہے دشوار معرفت میری
وہ راز ہوں جو ابھی ذہن رازداں میں نہیں

محیطِ غلبۂ وحدت ہے فطرتاً انساں
سمجھ رہا ہے کہ مجھ سا کوئی جہاں میں نہیں

اچھالے دیتی ہے غمازیٔ نگاہ مجھے
میں راز بن کے بھی قابوئے رازداں میں نہیں

قفس کی قید سے چھوٹے بڑے زمانے میں
ہمارے وقت کا تنکا بھی آشیاں میں نہیں

درائے صبح کی آواز ہے نہ بانگِ جرس
خیال یہ ہے کہ میں اپنے کارواں میں نہیں

تعلقات کا رونا ہے۔ یاد کی فریاد
یہ جانتا ہوں کہ میں ذہن نوحہ خواں میں نہیں

وہاں ثبوت محبت کا دینے آیا ہوں
جہاں شریک فرشتے بھی امتحاں میں نہیں

خدا کا شکر ادا کر رہا ہوں غربت میں
کہ میرے پاؤں میں کانٹے سہی زباں میں نہیں

میں چاہتا ہوں کہ نزل ہی منہ سے بول اٹھے
فغاں شناس کوئی میرے کارواں میں نہیں

جہانِ عشق کی مٹی خراب ہے سیماب
زمین تنگ ہے گنجائش آسماں میں نہیں

نہیں آشنا مرے حال سے کوئی آنکھ بزم مجاز میں
ہوں وہ آئینہ جو ہے ناتمام ابھی ذہنِ آئینہ ساز میں

یہی راز تھا کہ حقیقتیں رہیں راز بزم مجاز میں
وہ ہی غزنوی کی نظر میں تھی جو گرہ تھی زلفِ ایاز میں

مرا داغ سجدہ مٹائے کیوں، فلک اسکو چاند بنائے کیوں

کہ یہ داغ حاصلِ عاشقی ہے مری جبینِ نیاز میں

نہ یہ شمعِ بزم فروز ہو، نہ یہ زندگی نہ یہ سوز ہو،
جو نگاہِ گرم اثر تری، نہ بھرے نوا مرے ساز میں

یہ رکوع کیا، یہ قیام کیا، یہ سجود کیا، یہ سلام کیا
فقط اک فریبِ نیاز ہے جو نہ محویت ہو نماز میں

ترا نغمہ موجِ شگفتگی، مرا نالہ شعلۂ زندگی،
ہی یہی تو فرق مغنیہ، مرے سوز میں ترے ساز میں

ہوا خاک ذوقِ نیاز سے، تو سمجھ نہ یہ کہ حقیر ہوں،
مجھے جذب ہونے کا شوق ہے تری بزمِ ذرہ نواز میں

نہیں آنکھ جلوہ کشِ سحر، یہ ہے ظلمتوں کا اثر مگر
کئی آفتاب غروب ہیں مرے غم کی شام دراز میں

وہ عروجِ ماہ وہ چاندنی، وہ خموش رات، وہ بیخودی
وہ تصورات کی سرخوشی، ترے ساتھ راز و نیاز میں

مجھے خوئے توبہ نہیں تو کیا مرے جرم بخشے نہ جائینگے؟
ابھی اور چاہئیں وسعتیں کرمِ بہانہ نواز میں

عربی نہیں عجمی سہی، مگر آرزو ہے کہ وا رقی،
کبھی اپنا نغمۂ مشرقی میں سنوں نوائے حجاز میں

جس جگہ جمعِ ترے خاک نشیں ہوتے ہیں
غالباً سب میں نمودار ہمیں ہوتے ہیں

وہ عیاں صبحِ حرم سے بھی نہیں ہوتے ہیں
ہم تو اب شام سے بتخانہ نشیں ہوتے ہیں

حشر اُٹھتا ہے نہ کہرام کہیں ہوتے ہیں
تم جہاں ہوتے ہو، فتنے بھی وہیں ہوتے ہیں

اپنی آوارہ سری روشنیٔ شمع میں دیکھ
ہے فروغِ انگبو جو یوں گوشہ نشیں ہوتے ہیں

کہنے جاتے ہیں کوئی رازِ بہارِ نو سے
ٹوٹ کر پھول جو پیوندِ زمیں ہوتے ہیں

دردِ دل اُن کے لئے کیوں ہے مرا عجز و نیاز
میرے سجدوں سے وہ کیوں چیں بجبیں ہوتے ہیں؟

پوچھتا پھرتا ہوں جنت میں علیٰ قدرِ مذاق
کیا یہاں حُسن کا چرچا ہے حسیں ہوتے ہیں

اُن کی محفل سے تصوّر کا تعلق ہے ہمیں
آنکھ کر لیتے ہیں جب بند، ہیں ہوتے ہیں

نظر آتا نہیں حیرت گہہ جلوہ میں کچھ اور
قابلِ دید بس اک چیز ہمیں ہوتے ہیں

پوچھتا کیا ہے خیالات کی محویت کو
ڈوبتے ہیں تو سرِ عرش بریں ہوتے ہیں

عشق کا سر نہیں جھکتا ہے، فلک جھکتا ہے
یہ وہ سجدے ہیں جو محسوسِ زمیں ہوتے ہیں

آئے جب کُنجِ قفس میں تو قفس چوم لیا
ہم سے آزاد اسیر و نہیں کہیں ہوتے ہیں!

تیرے جلووں نے مجھے گھیر لیا ہے اے دوست
اب تو تنہائی کے لمحے بھی حسیں ہوتے ہیں

اعتکاف ان دنوں ہے فرض، سُنا ہے سیماب
رمضان آ گئے، میخانہ نشیں ہوتے ہیں

مستیٔ شب ہائے ہستی کا مزا ملتا نہیں
دیکھنے کو اب کہیں خوابِ وفا ملتا نہیں

ڈھونڈنے والوں کو نقشِ مدعا ملتا نہیں
کچھ محبت میں نہ ملنے کے سوا ملتا نہیں

گو گو ہے فرطِ نیرنگی سے رازِ کائنات
انتہا سے بھی سراغِ ابتدا ملتا نہیں

جام و بادہ چاہئے زادِ عدم کے ساتھ ساتھ
یہ سنا ہے راستے میں میکدہ ملتا نہیں

رہنمائی تو بہت مشکل ہے بزمِ عیش تک
اب تو سجدے کو بھی تیرا نقشِ پا ملتا نہیں

میں بتوں کی گمرہی سے منکرِ یجب فکر ہوں
وہ خدا خود ہی بتے ہوں جن کو خدا ملتا نہیں

کون پہچانے مجھے، بیگانۂ محفل ہوں میں
آئینہ بھی کوئی صورت آشنا ملتا نہیں

بے کسی لے آ کسی کو میری ویراں قبر تک
کیا مسافر بھی کوئی بھٹکا ہوا ملتا نہیں!

جذب کر لیتی ہے بڑھ کر میرے سینے کی خلش
پاؤں میں چبھتے ہی کانٹے کا پتا ملتا نہیں

واقعہ یہ ہے کہ بندوں میں خدا موجود ہے
تجربہ یہ ہے کہ بندوں میں خدا ملتا نہیں

عشق اے سیمابؔ جبتک ہو نہ جزوِ روح و تن
زندگی کا لطف مرنے کا مزا ملتا نہیں

مثلِ شبنم رائیگانِ عالمِ برباد ہوں
میں چمن کے پتے پتے کو ابھی تک یاد ہوں

پردہ آرائے فنائے عالمِ ایجاد ہوں
جس کی آبادی عبارت ہو میں وہ برباد ہوں

اب مہ و خورشید کو مشکل ہے میرا ڈھونڈنا
گوشۂ تاریک میں اک ذرۂ برباد ہوں

بود ہر موجود ہے انفاسِ فانی پر مرے
ہوں بنائے قصرِ ہستی اور بے بنیاد ہوں

تکملہ ہے داستاں میری حدیثِ باغ کا
یاسمیں و یاسمن کی آخری روداد ہوں

ہے مری تخلیق تعبیرِ تمنائے "کن"
میری فطرت ہی تمنا ہے میں تمنا زاد ہوں

اشک کہتے ہیں کہ ہم ہیں نغمۂ سازِ فغاں
درد کہتا ہے کہ مضرابِ لبِ فریاد ہوں

ابتدا ہے میری عریاں، خاک ہی میری سرشت
خلقتاً میں بے نوا ہوں، فطرتاً برباد ہوں

حادثات و نقص سے محدود ہی دنیا مری
وسعتِ عالم سمجھتی ہے کہ میں آزاد ہوں

ظلمتاک رُخ ہے مری اغلاط کی تصویر کا
پھر نہیں معلوم میں کیوں شاکیٔ بیداد ہوں

صرف ہونگی حشر تک روحیں مری تکمیل میں
میں تو نقشِ ناتمامِ عالمِ ایجاد ہوں

کوئی ہمدم ہے نہ اے سیمابؔ کوئی ہم نفس
آج کل خود غمگسارِ خاطرِ ناشاد ہوں

رفعتِ فہم سے انسان سرافراز نہیں
کون سی بات ہے وہ جسمیں ترا راز نہیں

شکر ہی کوئی غمِ عشق کا غماز نہیں
اب مرے رنگ کو بھی طاقتِ پرواز نہیں

آہ بیکار، کہ مایوسِ پذیرائی ہے
نالہ بے سود، کہ تو گوش برآواز نہیں

بے پر و بال سہی، سیرِ چمن کیوں چھوڑوں
میری تطر میں بھی کیا قوتِ پرواز نہیں؟

وجد میں روح مری آتی ہی۔ رہجاتی ہی
قفسِ جسم میں گنجائشِ پرواز نہیں

ہو لحد میں تری اے خوابِ اجل عمر دراز
اب مری نیند میں کوئی خلل انداز نہیں

دیکھ انجامِ ستم پردے سے باہر آ کر،
عرصۂ حشر ہے۔ یہ، انجمنِ ناز نہیں

رازِ دل کہنے پہ مجبور ہوا جاتا ہوں
گو سمجھتا ہوں کہ میرا کوئی ہمراز نہیں

عشق کی دلمیں وہ تصویر لئے بیٹھا ہوں
جو تری انجمنِ ناز میں ممتاز نہیں

صرف یک سجدہ مسافت ہی کئی منزل کی
ورنہ کچھ دور تری انجمنِ ناز نہیں

میری فطرت میں ہے سیمابؔ نیاز آگینی

ناز ہے مجھ پہ زمانے کو، مجھے ناز نہیں

حد ہو کوئی تو صبر ترے ہجر پہ کریں
آخر ہم ایک حال میں کب تک بسر کریں؟

اہلِ نظر وسیع گر اپنی نظر کریں
ذرّے نقاب اُلٹ کے تجھے جلوہ گر کریں

خود ہوگا چاک پردۂ رازِ شبِ فراق
احباب انتظارِ نمودِ سحر کریں

انجامِ اطلاع سے واقف ہیں چارہ گر
پھر کیوں ہمارے حال کی اُن کو خبر کریں؟

مر جائیں تیرے غم میں تو چرچے ہوں جا بجا
ہو داستاں طویل اگر مختصر کریں

فرسودہ طور ہو چکا، موسیٰ گزر چکے
شاید وہ اب مجھی کو خرابِ نظر کریں

اے اقتضائے ضبط، یہ ضد ہے کہ حیرہے
کیا آنکھ ہم بجدِّ مژہ بھی نہ تر کریں!

اک محشرِ نظر ہے تماشائے خیر و شر
فرصت کہاں کہ فیصلۂ خیر و شر کریں

فطرت ہر اعتبار سے ہے ہمنوائے حسن
آمین تم کہو تو دعائیں اثر کریں

ہو نقشہ نہ سلسلۂ حسن و عشق اگر،
نالے براہِ راست تجھی پر اثر کریں

تم نے تو اپنے حسن کو محفوظ کر لیا
ہم کس کے ساتھ عمرِ محبت بسر کریں؟

جب تُو نہیں تو خلوتِ دیر و حرم فضول
اب کیا یہاں پرستشِ دیوار و در کریں؟

اُس مرکزِ جمال پر اب ہے مری نگاہ
جلوے بھی دیکھ لیں تو طوافِ نظر کریں

سیمابؔ ہم میں عیب و ہنر خود ہیں بے حساب
ہم کیا کسی کے عیب و ہنر پر نظر کریں!

لایا ہوں ساتھ وحشتِ دیوانہ گر کو میں
کر لوں گا جلوہ گاہِ جنوں اپنے گھر کو میں

کھو کر تری گلی میں دلِ بے خبر کو میں
فکرِ خودی سے چھوٹ گیا عمر بھر کو میں

سازش بقدرِ ربطِ تھی طور و جمال میں
سمجھا ہوں آج عقدۂ سنگ و شرر کو میں

قربِ مقامِ دوست کی دیتا رہے نوید
سجدے قدم قدم پہ کروں ہم سفر کو میں

ہے مدعیٔ گم شدگی راہِ کوئے دوست
کھو جاؤں یا تلاش کروں راہبر کو میں

خلوت کو اپنی مشرقِ سجدہ بناؤں گا
لے جاؤں گا اٹھا کے تری رہگذر کو میں

اب ہر نگہ میں سیکڑوں مہلک جمال ہیں
سمجھا تھا پہلے کھیل مذاقِ نظر کو میں

اب ہے، تو مستقل ہو فروغِ شبِ وصال
ایسا نہ ہو چراغ جلاؤں سحر کو میں

صحرا سے بار بار وطن کون جائے گا
کیوں اے جنوں نہیں نہ اٹھا لاؤں گھر کو میں!

جھوما کیا سرور سے سیمابؔ رات بھر
دیکھا کیا کسی کی نشیلی نظر کو میں

شوقِ دیدار کا کیوں اُن سے اعادہ نہ کریں
لاؤ وہ کام کریں ہم جسے موسیٰ نہ کریں

پاسِ آدابِ وفا چاہیے مجبوروں کو
شکوۂ درد سے توہینِ تمنا نہ کریں

کتنا دشوار یہ مسلک ہے خدا والوں کا
رہیں دنیا میں مگر خواہشِ دنیا نہ کریں

اثرِ نقصِ علاجِ دلِ بیمار نہ پوچھ
اب ضرورت بھی کبھی ہو تو مداوا نہ کریں

یہ مسلّم کہ ہر انساں میں ہے پرتو اُسکا
تو ہم اب اپنی ہی ترکیب کو سجدا نہ کریں؟

کیوں تمنا نہ کریں تیری بہ اندازۂ شوق
کیوں تری یاد بہ اندازِ تمنا نہ کریں؟

دوست کی بات کا بالواسطہ افشا ہے گناہ
پھر مزہ کیا جو تجھی سے ترا شکوا نہ کریں

نوحۂ دل کا جہاں میں شنوا کوئی نہیں
اب بھی اللہ سے فریاد کریں یا نہ کریں

دوستی تشنۂ تکمیل رہی جاتی ہے
وہ ابھی ترکِ عداوت کا ارادا نہ کریں

اُن سے کہتا ہوں جو ہیں شاکیٔ بے لطفیٔ عشق
غمِ الفت کو شریکِ غمِ دنیا نہ کریں

دامنِ حسن و وفا چھوڑ دیں کیونکر سیماب
ہم نے اب تک نہ کیا ہے کبھی ایسا نہ کریں

یہ کس ادا سے کرشمے دکھائے جاتے ہیں
ادا شناس بھی دھوکے میں آئے جاتے ہیں

جو عمر تیری طلب میں گنوائی جاتے ہیں
کچھ ایسے لوگ بھی دنیا میں پائے جاتے ہیں

بنا کے دل مری مٹی سے لائے جاتے ہیں
اُنھیں ستم کے سلیقے سکھائے جاتے ہیں

جنھیں سپرد ہے گلشتِ حسن کا ساماں
وہ پھول صبح سے پہلے کھلائے جاتے ہیں

لگاؤ ہے مری تنہائیوں سے فطرت کو
تمام رات ستارے جگائے جاتے ہیں

سمائی جاتی ہیں دلیں وہ کفر بار آنکھیں
یہ تبکدے مرے کعبے پہ چھائے جاتے ہیں

جو ساری رات میسّر نہیں ستاروں کو
قریبِ صبح وہ جلوے دکھائے جاتے ہیں

حجاب اپنی نظر سے تو ہم اُٹھا نہ سکے
انھیں کے حسن سے پردے اٹھائے جاتے ہیں

جنوں کدہ ہے جسے لالہ زار کہتے ہیں
یہیں بہار میں وحشی بنائے جاتے ہیں

کوئی تو سرخیٔ افسانۂ یادگار رہے
ہم اپنا خون قفس میں لگائے جاتے ہیں

دراز سلسلۂ امتحانِ وحشت ہے
دلِ آزما کے قدم آزمائے جاتے ہیں

وہاں چمن میں ہے تعمیرِ آشیاں پہ عتاب
یہاں ہوا پہ نشیمن بنائے جاتے ہیں

ہوائے مرگ یہ سیری اُڑی ہے زنداں میں
چراغ پچھلے پہر سے بجھائے جاتے ہیں

سمجھ حقیر نہ ان زندگی کے لمحوں کو
ارے انہیں سے زمانے بنائے جاتے ہیں!

ہیں دل کے داغ بھی کیا دل کے داغ اے سیماب
ٹپک رہے ہیں مگر مسکرائے جاتے ہیں

جلوۂ صد رنگ سے نظریں پریشاں ہوگئیں
پھر سجاؤ محفلیں میری جو ویراں ہوگئیں

جو امیدیں غم کی راتوں کا چراغاں ہوگئیں
صبح ہوتے ہوتے سب خوابِ پریشاں ہوگئیں

شورِ وحشت کو سلیقہ ہی نہ آیا ضبط کا،
اور کڑیاں واقفِ آدابِ زنداں ہوگئیں

عشق کی دشواریاں ہیں حاصلِ ناممکنات
مشکلیں ہی وہ نہ تھیں شاید جو آساں ہوگئیں

کسقدر تھیں شوخ، سوزِ عشق کی چنگاریاں
راکھ ہو کر شاملِ ترکیبِ انساں ہوگئیں

میں نے کچھ دل میں لگا رکھی تھیں گرہیں ضبط کی
وہ بھی صرفِ نجیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں

اپنے اپنے رُخ سے تھیں ہموار راہیں عشق کی
جب قریبِ منزل آپہونچیں پریشاں ہوگئیں

کثرتِ تعمیرِ عالم و جبرِ بربادی ہوئی
بڑھ گئیں آبادیاں اتنی کہ ویراں ہوگئیں

میں نے جن اینٹوں پر آزادی کی رکھی تھی اساس
میری قسمت سے وہی بنیادِ زنداں ہوگئیں

پوچھتا کیا ہے غلط اندیشیٔ ذہنِ نشاط
خوبصورت نیکیاں جتنی تھیں عصیاں ہوگئیں

تیرے دیوانے نے چھیڑا سازِ غم کچھ اسطرح
جھوم کر زنداں کی دیواریں غزلخواں ہوگئیں

تو نے تازہ تربتیں گن کر بہت ماتم کیا
جمع کر ان میں وہ قبریں بھی جو ویراں ہوگئیں

اپنی دُھن میں عشق نکلا صدتباہی در نگاہ
جو زمینیں سامنے آئیں بیاباں ہوگئیں

چھپنے والی صورتوں کو دے نہ الزامِ حجاب
خاک میں کردی گئیں پنہاں کہ پنہاں ہوگئیں؟

جھک گئیں سجدے میں اے سیماب تیرے پاؤں پر
آج وہ کافر نگاہیں بھی مسلماں ہوگئیں

ازل سے تشنہ لبھائے بیخودی ہوں میں
خودی کی گود میں اک سوزِ زندگی ہوں میں

نہ پوچھئے مری ہمرنگیٔ دہمہ رنگی
جو کچھ سمجھ لیا جس نے مجھے وہ ہی ہوں میں

ہیں مجھ سے دور سب آثارِ شادمانی کے
آہی ہوں غمِ مطلق کہ آدمی ہوں میں

نہیں متاعِ مسرت پہ دسترس میری
برائے نامِ مسرت کا مدعی ہوں میں

ہے سر بمہر بدستورِ معرفت تیری
فریب خوردۂ عرفان و آگہی ہوں میں

کہاں سے لاؤں شرر کی طرح بلند سری
بنا ہوں خاک سی۔ نقشِ فتادگی ہوں میں

نہ جانے کب تجھے ایفائے عہد کا ہو خیال
یہ مصلحت ہے کہ مجبورِ زندگی ہوں میں

یہ سوچتا ہوں، تو سجدے سے سر نہیں اٹھتا
جو تھا فرشتوں کا مسجود کیا وہی ہوں میں؟!

ازل سے سہو و خطا ہے سرشت میں میری
ہے اعتراف کہ سیماب آدمی ہوں میں

جنوں کی نذر سالانہ کا سامان دیکھ لیتا ہوں
بہار آتے ہی پہلے میں گریباں دیکھ لیتا ہوں

نزاکت ہے یہ اُنکی بالطافت ہے تصوّر کی
اُنھیں میں برگِ گل پر بھی خراماں دیکھ لیتا ہوں

ضرورت کیا کہ راتیں تیرے غم خانے کی روشن ہوں
کہ میں تو روزِ فطرت کا چراغاں دیکھ لیتا ہوں

مآلِ عہدِ وحشت ہے یہی سرمایۂ باقی،
بحسرت پارہ ہائے جیب و داماں دیکھ لیتا ہوں

اسیری میں مذاقِ سیر مٹ جانیکا ماتم کیا
یہ کیا کم ہے در و دیوارِ زنداں دیکھ لیتا ہوں

پریشانی کو یہ وابستگی میرے سکوں سے ہے
کہ نیند آتے ہی اک خوابِ پریشاں دیکھ لیتا ہوں

ہو کوئی اور شے انسانیت میرے تخیل میں
خیالوں میں کبھی تصویرِ انساں دیکھ لیتا ہوں

ہر اشکِ مختصر اک موج ہے دل کے سمندر کی
اُٹھا کر ایک قطرہ نبضِ طوفاں دیکھ لیتا ہوں

حدیثِ مشقِ تصور کی مکمل ہو چکیں شاید
کھلی آنکھوں سے اب میں روئے جاناں دیکھ لیتا ہوں

خمارِ زندگی سے جب خودی کی موج اُٹھتی ہے
تو ہنس کر جانبِ گورِ غریباں دیکھ لیتا ہوں

سُناتا ہوں حدیثِ عشق اے سیماب مشکل سے
میں پہلی ہی نظر میں ظرفِ انساں دیکھ لیتا ہوں

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

فطرت سے چوک ہو گئی میرے خیال میں
ہلکا سا رنگِ عشق بھی ہوتا جمال میں

صبر آ ہی جائے گر ہو بسر ایک حال میں
امکاں اک اور ظلم ہے قیدِ مجال میں

دنیا کرے تلاش نیا کوئی جامِ جم
اسکی جگہ نہیں مرے جامِ سفال میں

پھر طور کی نمود ہے خاکِ کلیم سے
پھر تیرا انتظار ہے بزمِ جمال میں

آزردہ اسقدر ہوں سرابِ خیال سے
جی چاہتا ہے تم بھی نہ آؤ خیال میں

مٹی کے ٹھیکرے پہ نہ جا میرا ظرف دیکھ
کونین جذب ہے اسی جامِ سفال میں

تنگ آ کے توڑتا ہوں طلسمِ خیال کو
یا مطمئن کرو کہ تمہیں ہو خیال میں

ابتک ہے نازِ حسن کو تارِ نگہِ طور پر
اے عشق کاش تو کبھی آتا جلال میں!

دنیا ہے خواب حاصلِ دنیا خیال ہے — انسان خواب دیکھ رہا ہے خیال میں
یا دش بخیر پھر نہ ملاقات کا سکوں — اک دن سحر ہوئی تھی حریمِ جمال میں
بجلی گری اور آنچ نہ آئی کلیم پر — شاید منہی بھی آگئی ان کو جلال میں
عمرِ دو روزہ واقعی خواب و خیال تھی — کچھ خواب میں گذر گئی باقی خیال میں
دنیا نے جس کو شعلۂ ایمن سمجھ لیا — تھا اعترافِ شوق زبانِ جمال میں

سیماب اجتہاد ہے حسنِ طلب مرا
ترمیم چاہتا ہوں مذاقِ جمال میں

وہ دل، کہ جس میں محبت کا اضطرار نہیں — ہے سنگِ خام جو شائستۂ شرار نہیں
شراب جوش میں ہے صبح لالہ زار نہیں — یہ اور کیا ہے اگر مستیِ بہار نہیں؟
بہار آئی ہے پھر آتشیں لباس کیساتھ — شفق کی گود ہے صحنِ نبفشہ زار نہیں
کسی کے جلوۂ رنگیں کی یہ نوازش ہے — میں شاکیِ ستمِ شامِ انتظار نہیں
قفس سے تا بہ چمن جاؤں اور پھر آؤں — خطا معاف، میں لب تشنۂ بہار نہیں!
مذاقِ بوسۂ گل، احتیاط اہلِ چمن — یہ بزمِ رنگ و نوا خلوتِ بہار نہیں
وہ جلوہ ڈھونڈ رہا ہوں جو پھونکدے مجھ کو — کلیم میں بھی نہیں، تم اگر شرار نہیں
جنوں زدہ سہی کانٹوں پہ نیند کیوں آئے — مری نگاہ میں کیا فرشِ سبزہ زار نہیں
سوادِ صبحِ چمن کی ضیا فشانی دیکھ — طلوعِ بادہ ہی، خورشید کا ابھار نہیں
کبھی نشاطِ سماعت، کبھی جراحتِ روح — مغنیہ، ترے نغموں کا اعتبار نہیں

تلاشِ عشق میں ہے حسنِ فطرتِ معصوم
شعاعِ ماہ میں سیمابؔ اضطرار نہیں

محفلِ عشق میں جب نام ترا لیتے ہیں
پہلے ہم ہوش کو دیوانہ بنا لیتے ہیں

روز اک درد تمنا سے نیا لیتے ہیں
ہم یونہی زندگیٔ عشق بڑھا لیتے ہیں

دیکھتے رہتے ہیں چھپ چھپ کے مرقع تیرا
کبھی آتی ہے ہوا بھی تو چھپا لیتے ہیں

ہم پہ کیوں بزم میں ہیں گرمِ نگاہیں؟ یعنی
دور بیٹھے ہوئے ہیں آپ کا کیا لیتے ہیں

تجھے کر لیتے ہیں یوں اپنی مصیبت میں شریک
تیری تصویر پہ کچھ اشک گرا لیتے ہیں

حسن کا نام نہ لے عشق کے بندے خاموش!
کہیں یہ نام غلامانِ وفا لیتے ہیں؟

رنگ بھرتے ہیں وفا کا جو تصوّر میں ترے
تجھ سے اچھی تری تصویر بنا لیتے ہیں

جرعۂ عیش جو پیتے ہیں کبھی مجبوراً
اُس میں تلخی بھی ترے غم کی ملا لیتے ہیں

دے ہی دیتے ہیں کسی طرح تسلّی سیمابؔ
خوش رہیں وہ جو مرے دل کی دعا لیتے ہیں

دامانِ عشق وادیٔ سینا سے کم نہیں
آنسو کی آبرو ید بیضا سے کم نہیں

کیفِ خیالِ نشّۂ صہبا سے کم نہیں
قطرہ بھی اپنی موج میں دریا سے کم نہیں

قطعِ امید زود اثر ہے امید سے
جو یاس ڈھب کی ہو وہ تمنا سے کم نہیں

یارب مری جبیں ہے، کہ اک رہگذارِ حسن
ہر داغِ سجدہ نقشِ کفِ پا سے کم نہیں

وہ سامنے نہ ہوں تو تصور سے کام لے
یہ چیز بھی نگاہِ تماشا سے کم نہیں

یوسف کی طرح عشق میں خوددار یاں کہاں
ورنہ مذاقِ حسن زلیخا سے کم نہیں

پرسانِ غم بھی کوئی نہیں چارہ گر کہاں
اب پرسشِ غلط بھی مداوا سے کم نہیں

موسیٰ کے بعد پھر نہ وہاں جل سکا چراغ
گو عمر طورِ عمر کلیسا سے کم نہیں

یوں کی ہے مشقِ دشتِ نوردی کہ تا ہنوز
صحرا کی یاد، دورۂ صحرا سے کم نہیں

احساسِ شرکتِ غمِ دنیا سجا، مگر
ایک اپنا غم مجھے غمِ دنیا سے کم نہیں

ہر وقت اُن کے ساتھ ہوں ایک انتظام میں
میرا خیال خوابِ زلیخا سے کم نہیں

جوہر نفس سے چھیڑ دے اک نغمۂ طلب
وہ خامشی بھی حسنِ تقاضا سے کم نہیں

سیمابؔ دل حوادثِ دنیا سے بجھ گیا
اب آرزو بھی ترکِ تمنا سے کم نہیں

غمِ عشق سے سرگراں اور بھی ہیں
جہاں ہم ہیں شاید وہاں اور بھی ہیں

کچھ آج اُس نے ایسی نگاہوں سے دیکھا
میں سمجھا مرے رازداں اور بھی ہیں

یہ دنیا اگر میرے قابل نہیں ہے
ترے پاس یارب جہاں اور بھی ہیں

بہت راز دنیا سے میں کہہ چکا ہوں
کچھ اسرارِ دل میں نہاں اور بھی ہیں

یہ نازش، یہ خود فہمیاں، یہ تفاخر،
تمہیں تو نہیں نوجواں اور بھی ہیں

مرے دشت وحشت میں آ تو دکھاؤں
زمیں پر کئی آسماں اور بھی ہیں

بڑھاؤ نہ منزل کی شمعیں ابھی سے
ابھی راہ میں کارواں اور بھی ہیں

میں اپنے نشیمن کی کیا خیر مانگوں
مرے سامنے آشیاں اور بھی ہیں

اثر سوزِ پروانہ سے لینے والے! یہاں چند آتش بجاں اور بھی ہیں
اگر میرے سجدوں سے ایسی ہی صدہے تو بندہ نواز آستاں اور بھی ہیں

نہیں میں نواسنج سیماب تنہا
بھرا باغ ہے، نغمہ خواں اور بھی ہیں

آؤ پھر گرمیِ دیارِ عشق میں پیدا کریں طور کی مٹی سے تخلیقِ یدِ بیضا کریں
حسن کو پھر جلوہ ارائی پر آمادا کریں پھر حدیثِ برق و ایمن کو فضا پیرا کریں
جن پہ صدیوں سے مسلط ہے غبارِ بیخودی ان نگاہوں کو حریفِ مشربِ موسیٰ کریں
موج اندر موجِ بادہ۔ مختصر پیمانۂ شوق ہر نفس سے، ہر نظر سے ایک دل پیدا کریں
دل کئی پہلو میں رکھیں، قابلِ سوز و گداز ایک ہی قطرے کو کیا پھیلائیں کیا دریا کریں!
دو حقیقی اور فطری نعمتیں ہیں حسن و عشق مادیت سے انہیں کیوں لعنت آلودا کریں
مدتوں سے کر رہے ہیں سیرِ دنیائے مجاز اب حقیقت کے مناظر کا بھی اندازا کریں
عشق کی خودداریوں سے ہم اگر ہوں آشنا حدِ ممکن تک نگاہِ حسن سے پردا کریں
عشق اک شعلہ ہے، شعلہ ہے ہمیشہ سربلند کس کے آگے سر جھکائیں ہم کسے سجدا کریں!
عشق کا دل ہے بجائے خود محیطِ کائنات فضلِ گل میں کیوں طوافِ امنِ صحرا کریں
حسن بھی ہے عشق ہی کی خوبصورت اک ادا عکسِ آئینہ سے، آئینے کو حیراں کیا کریں
آؤ یہ پردے الٹ بھی دیں نیاز و ناز کے ربطِ حسن و عشق سے عالم نیا پیدا کریں
حسن میں ہو عشق کی بو، عشق میں ہو رنگِ حسن پھر مرتب رنگ و بوئے نو سے اک دنیا کریں

جتنے نغمے ہو چکے ہیں گم فضائے دہر میں — انکو پھر آواز دیں، اک ساز میں کھا کریں
مل چکے ہیں خاک میں جو ٹوٹ کر پھولوں کے جام — انکو دستِ شاخ میں پھر ساغر و مینا کریں
لاؤ پھر ڈھالیں نئی شمعیں نئی کا نور سے — خاکِ پروانہ سے پروانے نئے پیدا کریں
لیگئی ہے موت جن جلووں کو ہم سے چھین کر — انکو مدفن سے نکالیں، انجمن آرا کریں

زندگی دو دن کی اُس پر یہ جہاں ایجادیاں!
اہتمام اتنا کریں سیماب، اور پھر کیا کریں؟

نقاب، جلوۂ مستور کا حجاب نہیں، — تلاش کردہ نگاہیں جو کامیاب نہیں
فریبِ جلوہ یقیناً ہے یہ، جو خواب نہیں — کہ آج حدِّ نظر تک کوئی حجاب نہیں
کوئی ادا ہی محبت کی کامیاب نہیں — ہنسی تو کیا مرا رونا بھی مستجاب نہیں
خرد فریب ہے نیرنگیٔ جہانِ خراب — کہ سب خراب ہیں اور پھر کوئی خراب نہیں
بقدرِ شوق ہے، رنگینیٔ بہارِ جمال — یہ ہے نظر کی جوانی، ترا شباب نہیں
حقیر ہوں، مگر اتنا حقیر بھی نہ سمجھ — میں ذرّہ بھی تو نہیں ہوں جو آفتاب نہیں
وہ دن گئے، یدِ بیضا ملا تھا انساں کو — اب ایک داغِ شگفتہ بھی دستیاب نہیں
دہک رہا ہے شبستانِ عشق کا عالم — یہاں نہیں کوئی نارا جو آفتاب نہیں
ہے ذرّہ ذرّہ سمندر جو ہو نظر سیراب — یہ تشنگی کا تری عکس ہے سراب نہیں
ہر ایک جلوہ ہے اک جلوہ گاہِ حسن و جمال — نگاہِ شوق کو یارائے انتخاب نہیں
نظر ہو پاک، تو ہو حسن ہمکنارِ نظر — ہوس سے پردہ سہی عشق سے حجاب نہیں

نگاہِ عشق کی گرمی، ارے معاذ اللہ! نگاہِ حسن کو بھی دیکھنے کی تاب نہیں
ہے انتظار میں فطرت کسی کے، میری طرح اسے بھی نیند نہیں ہے مجھے بھی خواب نہیں
صلائے بادہ کشی دے نہ مجھ کو اے ساقی ترے کرم سے ابھی زندگی خراب نہیں
الٰہی خلد میں رنگیں شبابِ رفتہ دے یہ زہد کا سا بڑھاپا! مرا شباب نہیں
سکھا تو دے مجھے آدابِ خواب اے شبِ قبر ہوئی ہے عمر کہ میں آشنائے خواب نہیں
لگائے بیٹھے ہیں اک شمع لاشریک سے لَو ہماری بزم میں پروانہ باریاب نہیں
اگر ہے ذوقِ تماشا تو بند کر آنکھیں جہاں نگاہ نہیں ہے وہاں حجاب نہیں

بغیر واسطہ مخمورِ عشق ہوں سیماب
خدا کا شکر کہ شرمندۂ شراب نہیں

پھر اپنے دل میں شورشِ شباب دیکھتا ہوں میں الٰہی جاگتا ہوں میں کہ خواب دیکھتا ہوں میں!
پھر آج اپنی خلوتِ خموش و بے خروش میں نشیدِ ساز و چنگ باریاب دیکھتا ہوں میں
جہاں اداسیوں سے قبر کا سا اک سکوت تھا وہاں سرود و بربط و رباب دیکھتا ہوں میں
حیات کی نشاط کے، کھلے ہوئے ہیں میکدے تمام مستیوں کو بے نقاب دیکھتا ہوں میں
جسے ترس گئی تھی دیکھنے کو چشمِ آرزو، اُسے بقدرِ شوق بے حجاب دیکھتا ہوں میں
نوید، میرے نالہ ہائے سحر اعتبار کو! کسی کے دل میں اپنا اضطراب دیکھتا ہوں میں
جو گر رہے ہیں میری آستیں پہ چشمِ حسن سے اُن آنسوؤں میں موتیوں کی آب دیکھتا ہوں میں
مبارک انتظار کی شبِ کرشمہ کار کو! زمین پر نجوم و ماہتاب دیکھتا ہوں میں

سجود میں جو سر تھا، اب وہ ہے کسی کے دوش پر
جمود کی رگوں میں انقلاب دیکھتا ہوں میں

نظر فروز عقل سوز و روح تاب و جلوہ ساز
پھر اپنی گود میں اک آفتاب دیکھتا ہوں میں

سمٹ کے رہ گیا ہے حسن تنگیٔ کنار میں
نظر کو بے اُٹھائے کامیاب دیکھتا ہوں میں

دماغ میں مہک رہا ہے اک جہانِ رنگ و بو
نگاہ میں بھرے ہوئے گلاب دیکھتا ہوں میں

نفس میں بو ہے پھر کسی حنائی دستِ ناز کی
لبوں کے پاس شیشۂ شراب دیکھتا ہوں میں

جو لب فسردگی سے بے نیازِ کیف و رنگ تھے
لب و عذار پر اُنھیں خراب دیکھتا ہوں میں

ورودِ دوست کی یہ سب جوانیاں ہیں وارثی
نہ یہ فریبِ نشہ ہے نہ خواب دیکھتا ہوں میں

کوئی کیف دل میں ہو نغمہ گر۔ تو سرود روح نواز ہو
وہی نغمہ کیوں نہ سنائے تو جو شکستِ عالمِ ساز ہو

جو نظر نہ واقفِ راز ہو، اُسے سوزِ عشق سے ساز ہو
نہ کھلی ہوں جس پہ حقیقتیں، وہ اسیرِ حسنِ مجاز ہو

تری چشمِ مست حسیں نہ ہو تو رہینِ حسنِ مجاز ہو
اُسے کیا ضرورتِ آئینہ جو نگاہ آئینہ ساز ہو

پھر اُسی فضا کا ہوں منتظر جو ازل میں روح نواز تھی
وُہی بزم ہو، وہ ہی کیف ہو، وُہی نغمہ ہو، وہ ہی ساز ہو

مے و میکدہ ہو جس آنکھ میں وہ کسی کے سامنے کیوں جھکے

اُسے کیوں کسی سے نیاز ہو جو خدائے عالمِ ناز ہو

یہ مقدّراتِ عجیب ہیں یہ تباہیاں ازلی سی ہیں
کہ ترے شباب کے ساتھ ہی مری عمرِ عشق دراز ہو

اُنھیں خود نمائی سکھا تو دوں مگر اس خیال میں غرق ہوں
پڑے آئینہ پہ نظر وہ کیوں، جو شکستِ آئینہ ساز ہو؟

یہی حسرتیں ہمیں طور پر کئی بار کھینچ کے لے گئیں
کبھی ہم حریفِ کلیم ہوں، کبھی ہم سے رازِ دنیاز ہو

جو سرِ ساعتِ نالہ ہو تو بہ یک نظر مجھے چھیڑ دو
میں وہ نوحہ زارِ خموش ہوں جو اسیرِ پردۂ ساز ہو

ہوں کلیم سیکڑوں رقص میں سرِ طورِ شعلۂ ناز پر
اگر آج مستعدِ طلب، کششِ جہانِ نیاز ہو

یہ تمہاری ناز نما خودی یہ مرا نیاز یہ بندگی!
میں سمجھ چکا ہوں حقیقتاً کہ تمہیں خدائے مجاز ہو

ترے انتظار میں زندگی ہوئی ختم شام سے صبح تک
نہ فریب دے مجھے آرزو، نہ یہ رات اتنی دراز ہو

چل اُدھر مغنّیِ خوش بیاں، یہ تکلفات نہ ہوں جہاں
ترا حسن صرف ہو نغمہ خواں، نہ یہ چنگ ہو نہ یہ ساز ہو

مرے دل کو حسن سے ہے سکوں، وہ رمیدہ خو نہ مجھ جنوں
میں کلیمِ ایمنِ ناز ہوں اُسے کیوں نہ مجھ سے نیاز ہو!

جو ہوس ہے شربِ مدام کی تو بجھے گی مے سے نہ تشنگی
وہ نگاہ ڈھونڈیے واعظو جو نگاہ میکدہ ساز ہو

بربادِ حسنِ ظن سے آلِ وفا نہ ہو — ایسا نہ ہو کہ حقِ محبت ادا نہ ہو
ہوں آشنائے دوست، مجھے کیوں عطا نہ ہو؟ — ایسی جبین جو دیر و حرم آشنا نہ ہو
ہوتا نہیں اثر دلِ آتش پرست پر — جبتک فضا میں کوندنے والی صدا نہ ہو
مر مر کے طے کیا ہے بمشکل یہ مرحلہ — پھر زندگی نتیجۂ ذوقِ فنا نہ ہو
حسن اختیار کرلے اگر وضعِ التفات — میرے لئے عذابِ مذاقِ وفا نہ ہو
پھر چاہتا ہوں رابطۂ حسن و عشق سے — وہ ابتدا کہ جس کی کوئی انتہا نہ ہو
پھر مانگتا ہوں اُس نگہِ دلنواز سے — وہ عالمِ سکون جو ابد تک فنا نہ ہو
ابھارہا ہوں زلفِ تصور میں دستِ شوق — اور اس طرح کہ موجِ ہوا آشنا نہ ہو
بھر دو مری نگاہ میں اتنی تجلیاں، — نظارے کو کبھی ہوسِ ماسوا نہ ہو
وہ سرخوشی کا وقت ہے جب کائنات میں — دل بولتا ہو اور کوئی بولتا نہ ہو
رہنے دی امتیاز کے پردے پڑے ہوئے — اے حسن ہر نقاب سے جلوہ نما نہ ہو
محوِ خودی نہ ہو جو وہ کافر تو کیا کرے — جس کی نظر میں حدِ خودی تک خدا نہ ہو
آ، اور آخری نگہِ یاس دیکھ جا! — شاید پھر اس کے بعد عبادت روا نہ ہو

شباب ترکِ عشق و غمِ زندگی غلط،
وہ کام کیوں کریں جسے دل مانتا نہ ہو

ہماری خانہ ویرانی زمانے پر عیاں کیوں ہو؟ جلے جتنا نشیمن، سرخ اتنا آسماں کیوں ہو؟
رہ و رسم آشناہوں، سعیِ میری رائیگاں کیوں ہو جو منزل سے بھٹک جائے وہ میرِ کارواں کیوں ہو؟
یہ بےچینی، یہ بےکیفی یہاں کیوں ہو وہاں کیوں ہو؟ جو سرشارِ محبت ہو تو دنیا سرگراں کیوں ہو؟
قفس اور آشیاں پستی و بالا کے نمونے ہیں قفس میں کوئی رہ کر بے نیازِ آشیاں کیوں ہو؟
چلو تو ہر جگہ یعنی تعیّن کی حدیں توڑو، نہیں ہے جب مکاں کی قید قیدِ لامکاں کیوں ہو؟
جبیں ہم جس جگہ رکھ دیں گے اک کعبہ بنا لیں گے سلامت ذوقِ سجدہ، آپ ہی کا آستاں کیوں ہو؟
محبت اور ایسی کس مپرسی، ہائے مجبوری! کوئی رسماً ہی مجھ سے پوچھے ناشادماں کیوں ہو؟
جہاں میں تھک کے جا بیٹھوں زمینِ کوئے جاناں پر وہیں سے ابتدائے انقلابِ آسماں کیوں ہو؟
وہ اکثر خلوت و جلوت میں میرے پاس رہتے ہیں حجاب اُن کا تصوّر کی نزاکت پر گراں کیوں ہو؟
سمیٹا دفترِ غم میں نے اک لفظِ تمنا تک مجھے محفل میں حکمِ اختصارِ داستاں کیوں ہو؟
جوانی اور مرگِ عشق! یہ ہے رقص کا موقع! غزلخواں ہو مرے ماتم میں کوئی نوحہ خواں کیوں ہو؟
کسی نے یہ نہ سوچا جب بنی تقدیر انساں کی کہ یہ جنسِ گرانمایہ خراب خاکداں کیوں ہو؟
اعادہ کر اسی تکبیر وقتِ قتل کا آ کر مری میّت پر اے قاتل نمازِ بےاذاں کیوں ہو!
نہ پہونچا میں اگر منزل پہ میری نعش تو پہونچی، نہ ہو جانِ اتنی جسمیں وہ شریکِ کارواں کیوں ہو؟
مجھے ہے اعتبار اے ہم قفس اپنی رہائی کا، بنی جس سے قفس وہ میری شاخِ آشیاں کیوں ہو!

جھکادے سر اُسی پر سامنے آجائے جو ذرّہ
کہ جب سجدہ ہی کرنا ہے تو قیدِ آستاں کیوں ہو؟

شہیدانِ بہار اپنا تصرّف گر نہ فرمائیں
تو پھر زنگین اے سیمابؔ صبحِ گلستاں کیوں ہو؟

رسماً ہی اُن کو نالۂ دل کی خبر تو ہو
یعنی اثر نہ ہو تو فریبِ اثر تو ہو

افسانۂ فراق کہیں مختصر تو ہو
شامِ چمن نہ ہو جو میسر سحر تو ہو

کثرت میں جس کو حُسن کے جلوے نصیب ہوں
خلوت میں کم سے کم وہ نظر عرش پر تو ہو

ہم بھی تمہاری بزم میں ہیں در خورِ کرم
اچھا وہ مستقل نہ سہی اک نظر تو ہو

ہے ہر حجابِ حسن فقط نام کا حجاب
پردے میں دم کہاں ہے کوئی پردہ در تو ہو

سب کچھ اسی نظر میں ہے، بادہ بھی کیف بھی
کوئی ہماری طرح خرابِ نظر تو ہو

کیا فرض ہے کہ ہم نہ ہوں تقدیر آزما
دینا پڑی ہوئی ہے درِ یار پر تو ہو

دیر و حرم میں سجدے کریں کون رائیگاں
گر ہو نہ تیرا پاؤں تری رہگذر تو ہو

سب کہہ رہے ہیں ہمپہ گراں ہے شبِ فراق
اسکا بھی کچھ علاج کریں گے سحر تو ہو

یہ بارِ دوش، بار نہ ہو پائے ناز پر
سجدہ کریں، مگر ترے سجدے کو سر تو ہو

ہر پھول منتظر ہے گریباں لئے ہوئے
دیوانے سیکڑوں، کوئی دیوانہ گر تو ہو

شب ہائے زندگی میں یہی تھا مرا انیس
مدفن میں کوئی ہو کہ نہ ہو، چارہ گر تو ہو

جامِ شراب اور شبابِ وجمالِ دوست
یہ دورِ نا ابد نہ سہی عمر بھر تو ہو

آوارگی نصیب ہوں شکوہ یہی تو ہے
صحرا ہو یا چمن، کہیں رہنے کو گھر تو ہو

ہاں عرش کا بھی ہے اسی منزل سے راستہ — لیکن کسی کا منزلِ دل تک گذر تو ہو
پروانے سے بھی ہیچ ہے کیا شمع زندگی؟ — یارب اسے فروغ بقدرِ شرر تو ہو

سیماب آدھی رات کو آئیں وہ بے قرار
تیری دعائے نیم شبی میں اثر تو ہو

صبوحی لا کہ وقتِ صبح ہے اے پیرِ میخانہ — تھکا ہارا ہے ساری رات کا رہگیرِ میخانہ
وداعِ ہوش ہو ہر نقشِ پرتاثیرِ میخانہ — وفورِ شوق سے گویا ہوں میں تصویرِ میخانہ
مجھے پھر کھینچ لایا شوقِ دامنگیرِ میخانہ — کدھر ہے ساقیٔ کمسن، کہاں ہے پیرِ میخانہ؟
نگاہیں مست ہو کر بار یابِ محفل ہوں ہوں — درِ کعبہ پہ کوئی کھینچ دے تصویرِ میخانہ
الٰہی عمر بھر مجھ کو ملے افتادگی ایسی — سرِ صہبا زدہ ہو اور پائے پیرِ میخانہ
شبابِ شامِ عشرت ہے، اک ایسا جام بھر کر دے — جوانی صبح تک جھومتا کرے اے پیرِ میخانہ
مرا رنگِ جوانی غازۂ پیمانۂ دینا — مرے اشکِ مسرت روغنِ تصویرِ میخانہ
یہ آنکھیں ساغرِ مے یہ جوانی نشۂ صہبا — خدا رکھے تمہیں، تم بھی تو ہو تصویرِ میخانہ

خودی کا شور رہے سیماب ہے توہینِ سرمستی
حدیثِ بیخودی ہے آیۂ تطہیرِ میخانہ

نفس نفس ہے سراپا وہ بہار، نہ پوچھ — مرے تصورِ رنگیں کا اعتبار نہ پوچھ
یہ جبر دل میں جسے جمع کر کے رکھا تھا — کہاں گئی وہ مری دولتِ قرار نہ پوچھ
ہوئے زمانے، کہ آوارۂ بیاباں ہوں — مرے چمن کو کہاں لے گئی بہار نہ پوچھ

خود اختیار میں اپنے نہیں وہ غارتِ دل
ملا ہے کس کو مرے دل پر اختیار نہ پوچھ

فضا پہ چھائی ہوئی موت کی اُداسی تھی،
یہ ابتدا تھی، اب انجام انتظار نہ پوچھ

بہ ہر نفس مری بیتابیوں کی شدت دیکھ
بہ ہر نظر مجھے کس کا ہے انتظار نہ پوچھ

میں بعدِ مرگ بھی بزمِ وفا میں زندہ ہوں
تلاش کر مری محفل، مرا مزار نہ پوچھ

تمام رات تصور، تمام دن تصویر
ہماری عمرِ محبت کے کاروبار نہ پوچھ

نہیں نشانِ مسرت کا روح تک سیماب
درازدستیٔ غمہائے روزگار نہ پوچھ

غرض کی دنیا ہے ساری دنیا یہاں وفا کا چلن نہیں ہے
مجھے کہیں اور لے چل اے دل کہ یہ مری انجمن نہیں ہے

نگل بنائی ہوئی حدوں سے نگاہ کو وسعتیں عطا کر
تمام عالم وطن ہے تیرا اگرچہ تیرا وطن نہیں ہے

میں عرش سے بھی کچھ اور بڑھ کر ہوں طالبِ مرکزِ تماشا
مری نگاہ بلند کی حد بساطِ چرخِ کہن نہیں ہے

یہی اگر شرطِ گفتگو ہے تو ہم سے بھی روز گفتگو ہو
ہمیں بھی مثلِ کلیم تم سے مجالِ عرضِ سخن نہیں ہے

دوئی کے پردے اُٹھا رہی ہیں صدا انا کی لگا رہے ہیں
ہماری دنیائے بیخودی میں وجود و دار و رسن نہیں ہے

تھی روح کا قیدخانہ دنیا، ہے قبر زندانِ جسم خاکی
اگر وہ میرا وطن نہیں تھا تو یہ بھی میرا وطن نہیں ہے

شگفتہ چہرے ہیں جنکے سیماب، دل نہیں شاید اُنکے سینے
چمن کا ظاہر چمن ہے لیکن چمن کا باطن چمن نہیں ہے

تُو بے حجاب ہے آئینہ تجھ کو تکتا ہے — سنبھل! سنبھل!! یہ ستم کون دیکھ سکتا ہے
وہ اُس کی سُنتے ہیں جو بات کر نہیں سکتا — وہ ہے کلیم جو ہر لفظ پر اٹکتا ہے
مرا یہ حال، کہ سب کچھ ہوں اور کچھ بھی نہیں — ترا جمال، کہ سب میں ہی اور یکتا ہے
ہجومِ غم سے ٹپکتی تھی چشمِ تر کل تک — دوامِ اشک سے آج آشیاں ٹپکتا ہے
سکوتِ مرگ ہے اک انتہا تحیّر کی — طریقِ عشق میں مرنے کا نام "سکتا" ہے
بتائیں تو مری ہستی بگاڑنے والے! — بگاڑ کر کوئی مجھ کو بنا بھی سکتا ہے
اسیرِ کنجِ قفس کا یہ حال ہے اب تو — خود اپنے زمزمے سُنتا ہے خود پھڑکتا ہے
تصوراتِ کی خلوت میں کر تلاش اُسکو — تحیّرات کی دُنیا میں کیوں بھٹکتا ہے!
تجھے نہ دیکھ سکوں میں تو کچھ ملال نہیں، — یہی بہت ہے کہ تو مجھ کو دیکھ سکتا ہے

گیا شباب بھی، پیری بھی آگئی سیماب
مگر یہ تکیۂ پہلو کہیں سرکتا ہے!

اب اے بیدرد کیا اس کے لئے ارشاد ہوتا ہے؟
پھر اپنی خاک سے پیدا دلِ برباد ہوتا ہے!

تصوّر جب انیسِ خاطرِ ناشاد ہوتا ہے
جہانِ دل تری تصویر سے آباد ہوتا ہے
اسیرانِ وفا گھبرائیں کیوں تجویزِ زنداں سے
یہیں تو امتحانِ فطرتِ آزاد ہوتا ہے
نشاطِ زندگی دنیا میں ساماں اور ہیں لاکھوں
مگر میں کیا کروں جب دل تمہیں سے شاد ہوتا ہے
جہانِ حسن کے آداب و آئیں کی شکایت کیا
یہاں مظلوم ہی شائستۂ بیداد ہوتا ہے
نہ جا علمِ حقیقت پر، حقیقت اور ہی کچھ ہے
کبھی اک نقشِ باطل حاصلِ ایجاد ہوتا ہے
مراسم کی کڑی، قیدِ علائق، محبسِ ہستی
بڑی دشواریوں سے آدمی آزاد ہوتا ہے
جگہ ملتی نہیں جس کو شبِ غم محشرِ دل میں
وہ ہنگامہ لبِ خاموش میں آباد ہوتا ہے
بدل دی کثرتِ اندوہ نے فطرت مرے دل کی
یہ اب ناشاد ہونے سے، زیادہ شاد ہوتا ہے
ٹھہر جاتا ہے جب دل بے قرارانِ محبت کا

وہ اک لمحہ سکونِ عالمِ ایجاد ہوتا ہے
مٹا دو، خاک کر دو، پھونک دو، کر دو فنا، لیکن
ہمارا جذبۂ فطری کہیں برباد ہوتا ہے!

بہار آئی ہے استقبال کرنے بابِ زنداں تک
نہیں معلوم سیماب آج کون آزاد ہوتا ہے

ہستیٔ انساں، بڑی صنعت کی اک تعمیر تھی
اور اس تصویر کے پردے میں اک تصویر تھی

کچھ اثر تھا آہ میں، نالے میں کچھ تاثیر تھی
کچھ کرم تھا حسن کا، بانی مری تقدیر تھی

بزمِ فطرت میں عجب ترکیبِ دار و گیر تھی
مست تھا پروانہ، پائے شمع میں زنجیر تھی

شامِ غم تا صبح، وہ آئی نہ چین آیا نہ موت،
قسمتِ بیچارگی، تا خیر ہی تا خیر تھی

پا بگل اے مرنے والے کیوں پڑا ہے زیرِ خاک
اس خرابے میں تجھے تو حسرتِ تعمیر تھی!

حسنِ رنگا رنگ کی ندرت بدا مانی نہ پوچھ
ہر مصور کے تخیل میں نئی تصویر تھی

مجھ کو اس دنیا سے کوئی کھو ذدا لا تھا ضرور
یہ نہیں معلوم تم تھے یا مری تقدیر تھی

اس کو اکثر شورشِ عالم نے برہم کر دیا
جس تصور میں مرے معیار کی تصویر تھی

میں بگل بھی نہ محفل سے کسی کی اٹھ سکا
ایک نا معلوم قوت تھی کہ دامنگیر تھی

اڑ رہے ہیں گردِ بربادی میں کچھ اوراقِ دل
ان میں وہ صفحہ نہ ہو جس پر تری تصویر تھی!

لے لیا کیوں آپنے الزام میری موت کا
اس تباہی میں ابھی گنجایشِ تقدیر تھی

اپنے منشا پر گناہوں کو مرے محمول کر
یا مقرر ہو جا کہ مجھ میں قوتِ تقصیر تھی

تھا وطن میرا کبھی سیماب عنوانِ ادب
"سرزمینِ تاج" عہدِ میرزا و میر تھی

جلوہ ترا امکان سے باہر تو نہیں ہے
لیکن مری آنکھوں کو میسّر تو نہیں ہے

آنکھیں ہیں مری بندرہِ عشق میں یارب
آگے کوئی اس راہ میں ٹھوکر تو نہیں ہے ؟

تھک تھک کے پلٹتی ہیں شبِ عدہ نگاہیں
تا حدِّ نظر فاصلۂ در تو نہیں ہے

محویتِ خاموشِ تصوّر سے نہ گھبرا
دل میں ہے ترا نام زباں پر تو نہیں ہے !

دیکھو مری جانب، مرا دل چاک نہ ہوگا،
آخر ہے نظر، دشنۂ خنجر تو نہیں ہے

اب دل کی صداؤں میں وہ پہلا سا نہیں کیف
نغمہ کوئی اس ساز سے باہر تو نہیں ہے ؟

سیماب نہ میری تھی نہ اُن کی ہے جوانی
کیا کیجئے لیکن انہیں باور تو نہیں ہے

مری فطرت وفا ہے، دے رہا ہوں امتحاں پھر بھی
وہ فطرت آشنا ہے، اور مجھ سے بدگماں پھر بھی

چھپاتا ہوں مگر چھپتا نہیں دردِ نہاں پھر بھی
نگاہِ یاس ہو جاتی ہے دل کی ترجماں پھر بھی

غمِ واماندگی سے بے نیازِ ہوش بیٹھا ہوں
چلی آتی ہے آوازِ درائے کارواں پھر بھی

وہ میرے سر کو ٹھکراتے ہیں سجدوں سے خفا ہو کر
جبیں سے میری پیوستہ ہے اُنکا آستاں پھر بھی

کلیسا اور کعبہ نام کو دو جلوہ گاہیں ہیں،
مگر یک رنگ ہے ذوقِ جبین و آستاں پھر بھی

وفا کا اک لذّتِ پُرکیف ہے اک آیتِ تسکیں
وفا کا نام لینے سے لرزتی ہے زباں پھر بھی

حجاب اندر حجاب امواجِ طوفانِ تجلّی ہیں،
فروغِ شمع سے پروانہ ہے آتش بجاں پھر بھی

اشاروں سے نگاہوں سے بہت کچھ منع کرتا ہوں قفس ہی پر جھکی پڑتی ہے شاخِ آشیاں پھر بھی!

بہت دلچسپ ہے سیماب شامِ وادیٔ غربت
وطن کی صبح میں کچھ اور تھیں رنگینیاں پھر بھی

وہ تنہائی ہو یا محفل ہو، تسکیں دل کی مشکل ہے
بنا لیتا ہے خود اپنے لئے جلوے، یہ وہ دل ہے

ہے باطل محفلِ عالم تو پھر مشکل ہی مشکل ہے
مری نظریں بھی باطل ہیں، ترا جلوہ بھی باطل ہے

وہاں ہوں میں، جہاں تمییزِ حسن و عشق مشکل ہے
ہر اک جلوہ اب آغوشِ نظر میں جلوۂ دل ہے

کمالِ علم و تحقیقِ مکمّل کا یہ حاصل ہے
ترا ادراک مشکل تھا، ترا ادراک مشکل ہے

یہ ویرانی تصور کی، وہ رنگینی خیالوں کی،
کبھی محفل میں خلوت ہے، کبھی خلوت میں محفل ہے

غلط سمجھا جو تو محدود سمجھا راہِ ہستی کو،
جہاں ہوتی ہے منزل ختم، وہ آغازِ منزل ہے

جنوں کا ہاتھ دامن سے نہ پہونچا پردۂ دل تک
ابھی باقی وہی پابندیٔ آدابِ محفل ہے

بقدرِ ظرفِ ہمت، سہل و مشکل ہے رہِ اُلفت
یہاں ساحل بھی دریا ہے، یہاں دریا بھی ساحل ہے

اُڑا کر دھجیاں پیراہنِ ہستی کی خوش تھا میں
ندا آئی، یہ دیوانے جنوں کی پہلی منزل ہے!

ہوئی معلوم وجہِ اضطراب و شورشِ عالم
یہاں دل ہے ہر اک ذرّہ، ہر اک ذرّے میں اک دل ہے

میں غافل ہو کے دانستہ خرابِ بزمِ ہستی ہوں
سمجھتا ہوں کہ یہ محفل نہیں ہے، خوابِ محفل ہے

وہ آئینہ ہو، یا ہو پھول، تارہ ہو کہ پیمانہ،
کہیں جو کچھ بھی ٹوٹا، میں یہی سمجھا مرا دل ہے

نہ چھیڑ اے نغمہ گر تسکینِ بے ہنگام کے نغمے
فضاؤں میں ابھی گنجائشِ شورِ سلاسل ہے

اُجالا ہو تو ڈھونڈوں دل بھی پروانوں کی لاشوں میں
مری بربادیوں کو انتظارِ صبحِ محفل ہے

الٰہی غفلتِ عالم کو رنگِ ہوشیاری دے
کہ تو غافل نہیں دنیا سے، دنیا تجھ سے غافل ہے

وہ دل لے کر ہمیں بے دل نہ سمجھیں، اُن سے کہدینا،

جو ہیں مارے ہوئے نظروں کے اُن کی ہر نظر دل ہے
وہ اے سیماب کیوں سرگشتۂ نسیم و جنت ہو
میسّر جس کو سیرِ "تاج" اور "جمنا" کا ساحل ہے

جگا نہ روح کو نغمہ نواز رہنے دے
خراب لذتِ سوز و گداز رہنے دے

یہ سر وہ ہے جو کسی کے قدم پہ جھک نہ سکا
نیاز گی مرے کر قدر ناز رہنے دے

کبھی کھلے گی حقیقت مری محبت کی
یہ راز ہے اسی فی الحال راز رہنے دے

ہوس کو بھول کے بھی غور کر محبت پر
حقیقتوں کو شریکِ مجاز رہنے دے

بطورِ خاص وہ کیوں دعوتِ تماشا دیں
مجال نہ اے نگہ امتیاز رہنے دے

مرا مجاز بدل جائیگا حقیقت سے
نظر کو اپنی یونہی دل نواز رہنے دے

خودی کہاں، کہ ابھی بیخودی بھی ناقص ہے
سرود ریز محبت کا ساز رہنے دے

میں چاہتا ہوں وہ بادل، وہ برق، اور وہ بھا
جو سیرِ عالمِ رنگیں سے باز رہنے دے

یہی نیاز تو ہے ناز عشق اے سیماب
یونہی فتادہ جبینِ نیاز رہنے دے

پائے نفا میں لغزشِ مستانہ چاہیئے
ہر ذرہ خراب میں میخانہ چاہیئے

سب سے الگ پرستشِ جانانہ چاہیئے
اے برہمن خیال میں بتخانہ چاہیئے

ہنگامۂ بہار سے گھبرا گیا ہے دل
مجھ کو سکونِ خامشِ ویرانہ چاہیئے

ہر انجمن میں موقعِ وجدان و رقص ہے
آزادیٔ طبیعتِ پروانہ چاہیئے

اے جانے والے بجد کے۔ لازم ہے ترکِ ہوش — کچھ احترامِ تربتِ دیوانہ چاہیئے!
بت ہوں نہ ہوں، بتوں سے تعلق ضرور ہو — کعبے میں بھی نشاطِ صنم خانہ چاہیئے
رنگِ لباسِ دیر و حرم ہے بہت خراب — ان خشکیوں میں بارشِ پیمانہ چاہیئے
بے بادہ سادہ ہیں تری آنکھوں کی گردشیں — ان گردشوں کے ہاتھ میں پیمانہ چاہیئے
وہ شاخ نے ہو، یا ہو گلوئے مغنیہ — مجھ کو تو ایک نغمۂ مستانہ چاہیئے
نیرنگِ انقلاب ہیں راتیں بہار کی — صبحِ چمن کو روز اک افسانہ چاہیئے
اے شوقِ بزمِ دوست، اگر انبارِ غم نہ کر — دل میں ترا کتِ پرِ پروانہ چاہیئے
اے دل یہ پچھلی رات، یہ سکینِ کائنات — اس وقت ایک نعرۂ مستانہ چاہیئے

سیمابؔ راہِ عشق میں قسمت کے کھیل ہیں
کہنے کو صرف ہمتِ مردانہ چاہیئے

وہ جب رنگِ پریشانی کو خلوت گیر دیکھیں گے — تو اپنے ہر تصور میں مری تصویر دیکھیں گے
نظر جن کی اسیرِ حلقۂ تدبیر رہتی ہے — وہ کیا انجامِ کارِ وسعتِ تقدیر دیکھیں گے
سُنا ہو حسن کو وہ چند کر دیتا ہے یہ شیشہ — لگا کر اپنے دل میں آپکی تصویر دیکھیں گے
جنھیں ہے عذرِ اک لفظِ تمنا کی سماعت سے — وہ اک دن جا بجا اس لفظ کی تفسیر دیکھیں گے
مآلِ اہلِ غفلت ہو چکا بیدار دنیا میں، — جو خوابیدہ ہیں خود کیا خواب کی تعبیر دیکھیں گے
وفا کا تذکرہ کیا، اب تو یہ ارشاد ہے اُن کا، — کہ تم نالہ کرو ہم گرمیِ تاثیر دیکھیں گے
گدازِ غم سے ہیں تکمیل کی نو عیتیں لاکھوں — وہ ہر آنسو میں دل کی اک نئی تصویر دیکھیں گے

حسابِ جرم و نقدِ عمر اب کہنے کی باتیں ہیں
کہاں تک وہ کسی کا دفترِ تقصیر دیکھیں گے!
شکستہ ہر گھڑی ہے ہر گھڑی میں دل کی گھڑی ہیں
بڑی عبرت سے دیوانے مری زنجیر دیکھیں گے

خیالِ حشر و فکرِ نشر اے سیماب لاحاصل
کہ ہے تقدیر میں جو کچھ بہر تقدیر دیکھیں گے

نہ وہ شورِ طور و کلیم ہے، نہ وہ زورِ برق و شرار ہے
دلِ ناشکیب کو کیا کروں کہ ہلاکِ جلوۂ یار ہے

وہی یورشِ شبِ تار ہے، وہی بارشِ غمِ یار ہے
کوئی فرق ہو تو بتاؤں میں! نہ قرار تھا۔ نہ قرار ہے

مجھے اُس نگاہ پہ ناز ہے، جسے بزمِ ناز میں بار ہے
مجھے اُس حجاب پہ رشک ہے جو شریکِ جلوۂ یار ہے

وہی صبر پاش تعلّیاں، وہی ضبط سوزِ تجلّیاں
نہ عنایتیں نہ تسلّیاں، یہ مذاقِ جلوۂ یار ہے

شبِ عیش ختم ہے بلبلو، چلو چھپ کے پھولوں میں سو رہو
کہیں رازِ دوش نہ فاش ہو کہ قریبِ صبحِ بہار ہے

اُٹھے ابر جھوم کے چار سو، ہوا صاف مشرقی رنگ و بو
گر ایک مطلعِ آرزو، کہ اسیرِ گرد و غبار ہے!

کہیں جوشِ گل ہے سُبو سُبو، کہیں نکہتیں ہیں نمو نمو،

یہ ہے اک قیامتِ رنگ و بو کہ طلوعِ صبحِ بہار ہے
نہ کلی ہے وجہِ نظر کشی، نہ کنول کے پھول سے تازگی
فقط ایک دل کی شگفتگی سببِ نشاطِ بہار ہے
ہم اسیرِ باغ میں ہو گئے، نہ کہا کسی نے زباں سے یہ،
نہ کرو جدا اسے باغ سے، یہ ادا شناسِ بہار ہے
جو کلی کھلے گی نہ صبح تک وہ بنے گی شمعِ شبِ چمن،
سرِ شاخ پھول جو کھل گیا وہ چراغِ شامِ بہار ہے
انھیں ترتبوں کی تھیں قسم، یونہی تھوڑی دور قدم قدم
کہ صد آرزو زدہ کرم ابھی اور ایک مزار ہے
نہ غرض حرم کے وقار سے نہ صنم کدے کی بہار سے
ہمیں کام ہے درِ یار سے، درِ یار پھر درِ یار ہے!
یہ تمام شعبدے وارثی، ہیں فقط نشاطِ نظر مری
نہ خزاں پہ ہو مری دسترس نہ بہار میری بہار ہے

کسی حد تک تو تقلیدِ خرامِ یار ہو جائے — الٰہی خاک میری مائلِ رفتار ہو جائے
جوانساں بارِ باب پر دہ اسرار ہو جائے — تو اس باطل کدے میں زندگی دشوار ہو جائے
یہ دنیائے وفا دنیائے بے آزار ہو جائے — مجھی پر کیوں نہ تکمیلِ جفائے یار ہو جائے
وہ کیا جانے فریبِ عہد و پیماں کی تہ کاری — جو بیچارہ ہلاکِ شوخیِ اقرار ہو جائے

ہے اک احسان حیرت بھی، مگر احسانِ بے معنیٰ
یہ حیرت بھی شریکِ جلوہ گاہِ یار ہو جائے

جو ظلمت میں بھی تنویرِ حقیقت دیکھنا چاہے
وہ میری طرح پچھلی رات سے بیدار ہو جائے

غرورِ حسن بھی میرے لئے جزوِ ادا ٹھہرے
مرا احساس بھی تیرے لئے بیدار ہو جائے

میں ہو بے کیف، کوئی چھیڑ ایسی ہی رہی مطرب
کہ اک نغمے سے سازِ زندگی بیکار ہو جائے

کہاں ظاہر پرست آنکھیں، کہاں باطن نشیں جلوے
جو نامحرم ہو وہ کیوں محرمِ اسرار ہو جائے

تمہارے ان حسیں ہونٹوں میں مرکز ہے تجلی کا
جہاں ہنس دو، وہیں ہنگامۂ انوار ہو جائے

ارادہ ہے کہ پہونچیں چھاؤں میں تاروں کی منزل پر
سحر سے پہلے پہلے قافلہ تیار ہو جائے

لطافت کی کمی کیا ہے ترے اندازِ تمکیں میں
وہی غم کیوں نہ مجھ کو جو دلِ پرکار ہو جائے

نکمی ہو کے رہ جائے مری دانست میں دنیا
اگر آغازِ آگاہِ مآلِ کار ہو جائے

بگولہ ہی بنا دے اے ہوائے کوچۂ جاناں
اسی صورت طوافِ آستانِ یار ہو جائے

تو کیا اس ابر و باد و برق و باراں کے تلاطم سے
یہ مطلب ہے کہ تنظیمِ چمن دشوار ہو جائے؟

رہا جبتک قفس والے ہوں پابندِ نشیمن سے
چمن والوں سے کہدو آشیاں تیار ہو جائے!

امیرِ کارواں، کچھ آنسوؤں سے کام لے اپنے
وہ چھینٹا دے کہ روحِ کارواں بیدار ہو جائے!

غمِ پنہاں سے دم گھٹتا ہے اے سیماب کیا کہیئے!
خدا ایسا کرے یہ قابلِ اظہار ہو جائے

بیٹھا تو عجز نقشِ کفِ پا لئے ہوئے
اٹھا تو دردِ دل کا سہارا لئے ہوئے

خواب و خیالِ عشرتِ دنیا غلط ہوا
جانا پڑا مجھے غمِ دنیا لئے ہوئے

دینا مجھے فریبِ نویدِ حیاتِ تم
جب لوگ جا رہے ہوں جنازا لئے ہوئے

محشر میں ہے ضرورتِ وسعت بجلّدِ شوق
میں آ رہا ہوں اک نئی دنیا لئے ہوئے

تو اپنی بزمِ ناز کو دیکھ اور ازل کو دیکھ!
آیا کہاں سے تیری تمنّا لئے ہوئے

اس خاکدانِ عشق کی پہنائیاں نہ پوچھ
ذرّے پڑے ہیں وسعتِ صحرا لئے ہوئے

نکلا ہوں بھیک مانگنے امن و سکوں کی میں
شاید ہو کوئی قلبِ شکیبا لئے ہوئے

تھی کثرتِ جمال سے تاریک بزمِ دھر
آنا پڑا چراغِ تمنّا لئے ہوئے

اب طور کی حدود میں قدغن ہے حسن کا
آئے نہ کوئی چشمِ تماشا لئے ہوئے

سیمابؔ اُف! یہ تابشِ خونِ جنونِ عشق
ہر آبلہ ہے مشعلِ صحرا لئے ہوئے

معصوم ہے وہ جلوہ لیکن یہ واقعہ ہے
جب سامنا ہوا ہے برباد کر دیا ہے

بیگانگی بقدرِ اصرار و التجا ہے
شاید ترے ستم کو اندازۂ وفا ہے!

میری نیازمندی ہے یادگارِ عالم
ہر ذرّے پر نشانِ سجدہ بنا ہوا ہے

فطرت ہے بندگی کو گنجائشیں ملی ہیں،
ہر در پہ ایک بت ہے، ہر گھر میں اک خدا ہے

اتنی خبر نہیں ہے وارفتۂ طلب کو
سجدہ کہاں کیا ہے؟ سجدہ کسے کیا ہے؟

صانع کی صنعتوں پہ سو حسن کیوں نہ برسیں
اپنی کسی ادا کو انساں بنا دیا ہے!

سیمابؔ معرفت کی گہری نظر سے دیکھو
ذرّوں میں ہے تجلّی، مٹّی میں کیمیا ہے

خالی نہیں جہاں میں کوئی نظر اثر سے
دنیا محیط نکلی ہنگامۂ نظر سے

واقف وہ کیا ہو لطفِ آزادیٔ نظر سے
جو عمر بھر نہ نکلا زندانِ بام و در سے

گردش ہی کچھ زیادہ تدبیرِ چارہ گر سے
تھا در دوسری ہی بہتر درمانِ درد سر سے

ہر ہر قدم پہ حائل، ہی راہ و رسمِ منزل
میں اور کھو گیا ہوں تقلیدِ راہبر سے

اے شوقِ دید چل بھی منزل کہیں تو ہو گی!
اب گھر کا ٹوٹنا کیا دور آ گئے ہیں گھر سے!

گو راہِ دوست میں ہوں آوارۂ منازل
آگے ہوں پھر بھی کوسوں پابندِ رہگذر سے

وسعت نظر کو دے کر خود پردہ در بنایا
خود ہی شکایتیں ہیں گنجائشِ نظر سے

کھوئے گئے ہیں جتنے انکا پتہ ملے گا
تیرے ہی نقشِ پا سے، تیری ہی رہگذر سے

محویتِ تصور صورت بدل رہی ہے
تصویر بن گیا ہوں تخیل کے اثر سے

شاید ہوا مکمل میرا مذاقِ وحشت
ویرانیوں کی منظر پیدا ہیں آج گھر سے

درمانِ عاشقی کی ترکیب ہی نئی ہے
کرنا پڑا ہے مجھ کو پرہیز چارہ گر سے

کیا جانیں ہوش والے عرفاں کی رسمِ باطن
تیری خبر ملے گی تیرے ہی بے خبر سے

اندازۂ نظر میں تھی حدِ ہر دو عالم
تم پھر بھی دور نکلے اندازۂ نظر سے!

جب ملتفت ہوئی ہو انکی سکوں نگاہی
چن چن کے لگ گئی ہے کانٹے دل و جگر سے

خو کردۂ خلش ہوں، مجھ سے چرا نہ آنکھیں
اک درد مانگتا ہوں وہ بھی تری نظر سے!

طولانیٔ مرض سے اسکا تو فائدہ ہے
سیماب جی رہا ہوں تقدیرِ چارہ گر سے

اک جہاں میرا شریکِ آرزو محفل میں ہے
کاش وہ تیری تمنا ہو جو میرے دل میں ہے

آبرو سوز و گداز و دیرانیٔ محفل میں ہے
آپ ہیں اُجڑے ہوئے دل میں تو سب کچھ دل میں ہے

اپنے دل میں دے جگہ خانہ خرابِ عشق کو
آخر اے بیدرد تو بھی تو کسی کے دل میں ہے

سب تجھی کو پوچھتے آتے ہیں بزمِ ناز میں،
کوئی میرا پوچھنے والا بھی اس محفل میں ہے؟!

جوشِ غم، ہنگامۂ حسرت، ہجومِ آرزو،
آپ کیا دل میں ہیں اک دنیا کی دنیا دل میں ہے

تنگنائے دل میں گھٹتی ہے نکل سکتی نہیں
آرزو کے ساتھ تیری یاد بھی مشکل میں ہے

وحدت و کثرت کا ہی سیماب یہ بھی اک طلسم
اُس کو ہر دل ڈھونڈتا ہے اور وہ ہر دل میں ہے

نظر صرفِ حقیقت ہو رہی ہے، مجھے دنیا سے نفرت ہو رہی ہے
بدن سے روح رخصت ہو رہی ہے مکمل قیدِ غربت ہو رہی ہے
میں خود ترکِ تعلق پر ہوں مجبور کچھ ایسی ہی طبیعت ہو رہی ہے!

جفا اُن کی دلِ زود آشنا پر، بہ مقدارِ محبت ہو رہی ہے
سرِ محفل نہ کیوں کھل کر پیوں میں، اُن آنکھوں سے عنایت ہو رہی ہے
خدا سے مل گیا ہے حسنِ کافر خدائی پر حکومت ہو رہی ہے
سکون و نظم و وحدت پھر عطا کر کہ برہم بزمِ کثرت ہو رہی ہے
تجلّی کا مذاقِ جبر معلوم نظر مجبورِ حیرت ہو رہی ہے
یہ بے ربطی، یہ نقضِ وعظ و اعظ! جوانی میں نصیحت ہو رہی ہے!
نہیں تنہائیِ زندانِ مکمّل، مجھے سائے سے وحشت ہو رہی ہے
یہ تم ہنس ہنس کے باتیں کر رہے ہو کہ تقسیمِ جراحت ہو رہی ہے
ابھی تک محشرِ انسانیت میں، تلاشِ آدمیّت ہو رہی ہے
لبِ لعلیں پہ نظریں جم گئی ہیں بڑی رنگیں عبادت ہو رہی ہے
ملا جب دل تو انساں یہ نہ سمجھا کہ تفویضِ امانت ہو رہی ہے

اگر مشرب نہیں بدلا ہی سیمابؔ
تو کیوں تجدیدِ بیعت ہو رہی ہے؟

تصویرِ ذہن میں نہیں تیرے جمال کی آباد ہو کے لٹ گئی دنیا خیال کی
دامن کشِ حواس ہی وحشت خیال کی کتنی جنوں اثر ہے بہار اب کے سال کی!
میں مثلِ شمعِ صبح جلا اور بجھ گیا لایا تھا عمر مانگ کے شامِ وصال کی
یوں طور کو جلا دیا برقِ جمال نے پتھر میں رہ گئی تجلّی جمال کی

پہلے خیال، خواب سے تھا طالبِ سکوں
اب خواب ڈھونڈتا ہے پناہیں خیال کی

موسیٰ کو لاؤ، طور پر آجاؤ دیکھ لو
اب بھی ہیں کہسں پہ تجلّی جمال کی

جلوت میں ہوں تو شائکیِ ہنگامۂ ہجوم
خلوت میں ہوں تو ساتھ ہے دنیا خیال کی

طاری ہوئی جو تیرگیِ حسرتِ کلیم،
بجلی نے آکے شمع جلادی جمال کی

چھوڑ آئی لامکاں کو بھی پیچھے تری تلاش
اپنی حدوں سے بڑھ گئی وسعت خیال کی

سیماب، یہ شباب، یہ ابر، اور یہ بہار
انگڑائیاں ہیں صرف نشاطِ خیال کی

ہم اُن کا جلوۂ برقِ انتساب دیکھیں گے
نظر کو مشرقِ صد آفتاب دیکھیں گے

وہ جب مری نظرِ انتخاب دیکھیں گے
تو ہر نظر میں شکستِ حجاب دیکھیں گے

بجا کہ آئیں گے دینے تسلیاں مجھ کو
غلط، کہ حوصلۂ اضطراب دیکھیں گے

تو آئینے نہ دکھا اپنی بزمِ عشرت کے
کہ ہم تو جلوۂ آئینہ تاب دیکھیں گے

کیا خرابِ تماشا ہماری نظروں نے
تری نگاہ سے تیرا شباب دیکھیں گے

مذاقِ عشق سے ہیں غم نصیب دل جن کے
وہ کس کے دل سے نشاطِ شباب دیکھیں گے

ہم آپ سیر ہی کر آئیں بزمِ محشر کی!
ابھی تو دیکھنے والے حساب دیکھیں گے

فلک کا دورِ مسلسل جواب دے اس کا
ہم اپنے حال میں کب انقلاب دیکھیں گے؟

ہمیں مقاصدِ محشر سے کیا غرض ہم تو
مآلِ شدۂ حسن و شباب دیکھیں گے

طلسمِ جذبِ نظر ہیں معاقباتِ خیال
میں جب خیال کروں گا وہ خواب دیکھیں گے

خرابِ فردِ عمل ہو نہ جائے اے سیمابؔ
اسے جنابِ رسالت مآبؐ دیکھیں گے

اب وہاں دامن کشی کی فکر دامن گیر ہے
یہ مرے خوابِ محبت کی نئی تعبیر ہے

حشر میں از و نیاز رحمت و تقصیر ہے
میں ہوں دامن کش نگاہِ لطف دامنگیر ہے

شمع بھی پُرسوز ہے پروانہ بھی دلگیر ہے
تیری محفل کیا ہے، غم خانے کی اک تصویر ہے

زیست کی بے چارگی ممنونِ درماں ہو چکی
چارہ گر کے پاس مرنے کی بھی کچھ تدبیر ہے؟

آشنائی اک ادا ہے جو کسی میں بھی نہیں
بے وفائی اک ادا ہے، اور عالمگیر ہے

دل میں رہ کر بھی وہ اک حسرت وہم و خیال
دل سے نکلی کیوں، کہ اب شرمندۂ تاثیر ہے

کچھ تجھے معلوم ہے اے خوش نصیبِ حسن و عشق!
عہد میں تیرے کوئی آزردۂ تقدیر ہے

یہ فضا، یہ ابر، یہ ٹھنڈی ہوا، یہ سبزہ زار،
آج تو جنگل کا جنگل قابلِ تصویر ہے

دفن ہو زنجیر بھی مدفن میں ہمراہِ اسیر
یہ ستم کیا ہے کہ زندانی نہیں زنجیر ہے

عمر بھر مجھ سے خطا ہو گی کہ میں انسان ہوں
نظرِ عاصی مری پروردۂ تقصیر ہے

میں کوئی اپنے لئے تدبیر کر سکتا نہیں
کس قدر اندیشۂ رسوائی تقدیر ہے

یہ شرابِ عشق اے سیمابؔ ہے پینے کی چیز،
تند بھی ہے بدمزہ بھی ہے، مگر اکسیر ہے!

مختلف ہیولوں میں اک مری تمنا تھی،
چھپ گئی تو غیبی تھی، مل گئی تو دنیا تھی

کچھ عجب محبت میں نیتِ تماشا تھی،
اک نظر میں جلوہ تھا اک نظر میں دنیا تھی

دیدہ زیب تھی دنیا قابلِ تماشا تھی
دل اگر نہ مر جاتا، زندگی بُری کیا تھی!

شب ستانِ عالم میں شمع بن کے آیا تھا
مجھ کو صرف اتنی ہی فرصتِ تماشا تھی

سو طرح تخیّل کی کروٹیں بدلتی تھیں،
تھے فریبِ فطرت کے، دین تھا نہ دنیا تھی

اوّل اوّل اک موسیٰ مائلِ تماشا تھے
رفتہ رفتہ ہستی کی ہر اُٹھان موسیٰ تھی

ہر شفق کی موجوں میں تھے غروبِ عالم
ہر سحر کے پردے میں اک جدید دنیا تھی

فطرتِ طلب معلوم، ہاں مگر یہ دیکھا ہے
جس نے چھوڑ دی دُنیا، اُس کے ساتھ دنیا تھی

جادۂ توکل بھی اک عجیب جادہ تھا
میں جدھر بھی جاتا تھا ٹھوکروں میں دنیا تھی

تو ہوس میں دنیا کی زندگی مٹا بیٹھا
بھول ہو گئی غافل، زندگی ہی دُنیا تھی

میں جیا بھی دنیا میں اور جان بھی دیدی
یہ نہ کھل سکا لیکن آپ کی خوشی کیا تھی؟

بھیک چھپ چھپا کر دی کیوں نہ اپنے جلووں کی؟
مانگنے کو موسیٰ تھے، دیکھنے کو دنیا تھی!

میں فریبِ صورت میں بے نیازِ معنی تھا،
میری زندگی **سیماب** اک حسین دھوکا تھی

پرتو سے ہر نگاہ کو اک اضطراب ہے
بدلی کی دھوپ، جلوۂ زیرِ نقاب ہے

جس کو غرورِ ضبط ہے وہ بھی خراب ہے
کتنی تری ادائے ستم کامیاب ہے!

یہ پردہ داریاں یہ ہجومِ تجلّیات!
با اینہمہ نگاہ مری کامیاب ہے

اپنے کفن کے رنگ کا منّت گذار ہوں
شامِ لحد نہیں ہے، شبِ ماہتاب ہے

اِس حسن سے میں حشر میں فریاد کش ہوا
سمجھا ہر اک حسیں، کہ مجھی سے خطاب ہے!

کتاں کی برقِ حسن تڑپتی ہے مصر میں، کتنا وسیع سلسلۂ اضطراب ہے
کرتے ہیں لوگ یاد جسے نامِ عیش سے بھولا ہوا سا میری جوانی کا خواب ہے
دیکھے تو حسن و عشق کی خوش ربطیاں کوئی یوسفؑ کا ہر خیال زلیخا کا خواب ہے
کیا چیز ہے ہماری نگاہِ جواں پرست کلیاں سمجھ گئیں کہ ہمیں پر شباب ہے

سیماب لفظ لفظ اُترتا ہے عرش سے
میری بیاضِ شعر خدا کی کتاب ہے

بہار تیرے لئے وقفِ آرزو ہو جائے وہ پھول بن کہ گلستاں میں تو ہی تو ہو جائے
جسے ہو اصلِ حقیقت بہار کی معلوم وہ کیوں چمن میں پریشانِ رنگ و بو ہو جائے
مجھے تو ناز ہے اپنی گناہگاری پر تری نگاہِ کرم کیوں بہانہ جو ہو جائے
اسیرِ ضبط رہے کیا وہ مدعا میرا جو دل میں چھپ کے بھی سوئے آرزو ہو جائے
نہیں ہے جس کا پتہ ماورائے امکاں تک خدا کرے وہ ہم آغوشِ جستجو ہو جائے
نشاطِ حسن ہو، جوشِ وفا ہو، یا غمِ عشق ہمارے دل میں جو آئے وہ آرزو ہو جائے
یہ ہے کرشمۂ الفت، یہ ہی تصرفِ جذب کہ میں فغاں نہ کروں بے قرار تو ہو جائے
عبادت اُس کی، نماز اُس کی ہی، نیاز اُس کا، جو اپنے خون سے آمادۂ وضو ہو جائے
نویدِ وصل اُسے کیا جو اُن سے ملتے ہی ہلاکِ شوخیٔ اندازِ گفتگو ہو جائے
پھر اُس کے دفترِ جذبات کا خدا حافظ! جو لب ہلا کے گنہگارِ گفتگو ہو جائے
نظامِ حشر کی فہرست ہی بدل جائے مزہ تو آئے جو محشر فریب تو ہو جائے

ہے اک فسانۂ عبرت، آل اُس دل کا، جو پہلے پھول بنے اور پھر لہو ہو جائے

چھپائیں اُس نے جو اپنی حقیقتیں سیمابؔ
یہ مدعا تھا کہ محوِ مجاز تو ہو جائے

(لطفِ تقرب)

اللہ اللہ پردہ داری کا بھی کیا دستور ہے — بے نقابی بھی حجابِ جلوۂ مستور ہے
جلوہ گر ہو، میری ہستی میں مذاقِ طور ہے — آ، پھر اپنا خاک ہو جانا مجھے منظور ہے
زندگی کی آرزو کیا شوق سے معمور ہے — پاؤں کی آہٹ بھی مدفن میں صدائے صور ہے
سب میں ہے تیری تجلّی شمع کیا پروانہ کیا — تو نہ ہو تو انجمن کی انجمن بے نور ہے
دل ہے پہلو میں مگر آساں نہیں عرفانِ دل — دور ہے بیشک تجلّی گاہ تیری دور ہے!
اُن کے جلووں کے لئے نظروں میں وسعت چاہئے — آنکھ ہو تو صبح کا تارا چراغِ طور ہے
سُننے والے سیکڑوں ہیں، ہمنوا کوئی نہیں — نغمۂ زنجیر پیہم لبِ منصور ہے
تیرا جلوہ میرا جلوہ، جو ہے تو میں ہوں وہی — پردہ اتنا ہے کہ میں ظاہر ہوں تو مستور ہے

اور اے سیمابؔ اُس سے شکوۂ غم کیجئے
کہہ دیا اُس نے، محبت کا یہی دستور ہے

نہیں نبتی دلِ تنہا نشیں سے — کسی کو بھیج دے یارب کہیں سے
کوئی دیکھے مری وحشت سوالی — اُنہیں کو مانگتا ہوں میں اُنہیں سے
حسینوں میں وفا کیوں کی نہ پیدا — شکایت ہے مجھے حسنِ آفریں سے
کسی نے حال کچھ اس طرح پوچھا — دعا نکلی دلِ اندوہ گیں سے

یہ مایوسی کا تیرِ آخری ہے — بچے رہنا نگاہِ واپسیں سے
عنایت ہو جسے دے بخیہ گر تو — مرا دامن کسی کی آستیں سے

وفورِ اشک ہو اتنا تو سیماب
کہ بہہ نکلیں ٹپک کر آستیں سے

وسعتیں محدود ہیں ادراکِ انساں کے لئے — ورنہ ہر ذرّہ ہے دنیا چشمِ عرفاں کے لئے
اے خزاں تو شوق سے سارا چمن برباد کر — چند پھانیں چھوڑ جا میری رگِ جاں کے لئے
دور پہونچیں شہرتیں رفتارِ سحر آثار کی — کھل گئے رستے ترے حسنِ خراماں کے لئے
خوابِ ہستی میں نظر آئی نہ تنویرِ نشاط — روئے ساری رات اک صبحِ درخشاں کے لئے
پھول گلشن کے نہیں تو خاکِ صحرا ہی سہی — کچھ نہ کچھ تو چاہئے لیکن داماں کے لئے
دشمنِ کیفیتِ آغاز ہو کس طرح — ہر خوشی پیمانۂ عبرت ہے انساں کے لئے
اس لئے دیتا ہوں تم کو دل کہ لو اور بھول جاؤ — میں نے اک تصویر دی ہے طاقِ نسیاں کے لئے
چارہ فرما، ان کی شرمیلی نظر سے مانگ کر — زندگی لادے مرے حالِ پریشاں کے لئے
آنکھ کھلتے ہی نظر آیا جہاں ہنگامہ زار — نیند اچٹی تھی اسی خوابِ پریشاں کے لئے
ملتِ بے عشق تو اک جادۂ بے شمع ہے — عشق رکنِ خاص ہے تکمیلِ ایماں کے لئے
میرے اجزائے پریشاں میری آثارِ لطیف — کچھ گلستاں کے لئے ہیں کچھ بیاباں کے لئے
تو نے سب رشتے وفا کے کر دیئے تقسیمِ بزم — کیوں نگاہِ ناز اور میرے گریباں کے لئے
زندگی دریائے بے ساحل ہے اور کشتی خراب — میں تو گھبرا کر دعا کرتا ہوں طوفاں کے لئے!

دہجیاں اُڑنے کو ہے سیماب وسعت چاہئے
ہے کوئی میداں، آشوبِ گریباں کے لئے؟!

ستارۂ پہ فطرت کا، پھر آئینہ خانہ ہے
تقدیر کے گیسو ہیں، تدبیر کا شانہ ہے

یہ دورِ ترقی ہے، رفعت کا زمانہ ہے
ذروں کو اُٹھانا ہے، تاروں سے ملانا ہے

ایواں یہ بنانا ہے، وہ قصر سجانا ہے
جیسے ہیں دنیا میں پھر لوٹ کر آنا ہے

آغوشِ تصوّر ہے اور نقشِ جمیل اُن کا
دوری ہے نہ مجبوری، آہا ہی نہ جانا ہے

تقدیر کا ماتم بھی ہے سدِّ رہِ منزل
جیلے ہیں جہاں لاکھوں اک آنسو بھی بہانا ہے

آوازِ درا باطل، فریادِ جرس ناقص،
اب محفلِ خفتہ کو ٹھوکر سے جگانا ہے

فانوسِ خیالی ہے، صورت کدۂ ہستی
کیا کیا نظر آیا ہے، کیا کیا نظر آنا ہے

نیرنگِ محبت ہے، ہر راز مرے دل کا
چپ ہوں تو حقیقت ہے کہہ دوں تو فسانا ہے

پایانِ طلب کچھ ہو، لیکن مری ہمت نے
ہر قطرہ نچوڑا ہے ہر ذرّہ کو چھانا ہے

ارمانِ تجلّی کا، کوتاہ بھی کر قصّہ،
اے دوست تجھے آخر اک دن نظر آنا ہے

ٹوٹا ہوا دل میرا، دیکھے تو کوئی آ کر،
صد پارۂ وصد جلوہ، کیا آئینہ خانا ہے

ہستی کے اندھیروں میں کھو آئے جو کھونا تھا
پھر چاندنی راتیں ہیں کچھ ڈھونڈ کے لانا ہے

کیا شعبدہ ساماں ہے سیماب زمانہ بھی
ہر شخص سمجھتا ہے میرا ہی زمانہ ہے

کارگہِ ہم اپنے اجزائے فنا دیکھا کئے
منتشر شیرازۂ ہفت آسماں دیکھا کئے

ہم انہیں دیکھا کئے اور بے تکاں دیکھا کئے
وہ تماشائے نگاہِ ناتواں دیکھا کئے

کوئی کیفیاتِ پنہاں کا نہ تھا نظارگی
سب جنونِ عشق کی عریانیاں دیکھا کئے

میرے دامن دار زخموں کی تراوش دیکھتے
آپ اپنی آستینِ خونچکاں دیکھا کئے

دیکھنے کی چیز تھا سرمایۂ عمرِ فراق
ایک ناکامی مآلِ صد فغاں دیکھا کئے

طور کو جس کی تڑپ نے شعلہ پیکر کر دیا
ہم وہی بجلی قریبِ آشیاں دیکھا کئے

مٹنے والوں کا ہیولہ پھر نہ قائم ہو سکا
ایک اک ذرے کو صد کونِ آسماں دیکھا کئے

رنگ بن کر رازِ دل کھلتا رہا اڑتا رہا،
میری صورت انجمن میں رازداں دیکھا کئے

کب بصیرت نے ہمیں گلگشت کی تکلیف دی
چند کلیوں میں مکمل گلستاں دیکھا کئے

اپنی محفل کا نظامِ جبر اُن کے دل سے پوچھ،
جو تجھے باصد نگاہِ بدگماں دیکھا کئے

تھا کبھی ویراں کبھی دنیائے عشرت در کنار
ایک دل کو صد بہار و صد خزاں دیکھا کئے

عالمِ تصویر میں سو سو کے تو اُٹھتا رہا
ہم تصور میں تری انگڑائیاں دیکھا کئے

میری ساری عمر میں کچھ واقعات ایسے بھی تھے
جن کو دل والے بنا کر داستاں دیکھا کئے

کون جانے آسماں سے اُن کو کیا امید تھی،
مرتے مرتے بھی جو سوئے آسماں دیکھا کئے!

جنتِ کشمیر میں سیمابؔ آنکھیں کھل گئیں
دیر تک مستی میں بھیگی وادیاں دیکھا کئے

جو وقتِ نزع کو، وقتِ ورائے کارواں سمجھے
بتا اے نامرادی، اپنی منزل وہ کہاں سمجھے؟

نہ وہ فریاد کا مطلب، نہ منشائے فغاں سمجھے
ہم آج اپنی شبِ غم کی غلط سامانیاں سمجھے

بڑی مشکل سے اُن کا رازِ اُلفت ہو سکا پنہاں
بڑی مدت میں جا کر ہم مزاجِ رازداں سمجھے

گراں آغوش کیوں ہو موت ابنائے تمنا سے
یہیں پھر پھینک دے مجھ کو اگر بارِ گراں سمجھے

حکایت قصہ خواں نے کل کچھ اس انداز سے کہدی
میں اُن کی داستاں سمجھا، وہ میری داستاں سمجھے

وہ مجبورِ قفس، قانع نہ ہو کیوں حال پر اپنے
جو اپنی سی تباہی آشیاں در آشیاں سمجھے

اب آیا ہے تو بیٹھے چارہ گر خاموش بالیں پر،
مری بے چینیاں دیکھے مری بے تابیاں سمجھے

نہ پوچھ اُس پاکبازِ آرزو کا مطمحِ اُلفت
جو پیمانِ وفا میں بھی خدا کو درمیاں سمجھے

پیامِ شادمانی کیا سمجھ کر دے کوئی اُس کو
جو تیرے غم کو تکمیلِ نشاطِ دو جہاں سمجھے

نہیں ملتا اگر اب آشیاں اے خانہ ویرانی

تو ایسا ذہن لا دے جو قفس کو آشیاں سمجھے

سمجھے اُس وفا آموزِ حسن و عشق کا حاصل
کئے جائے جو نالے اور اُن کو رائیگاں سمجھے

کمالِ حُسن نے نظّارے کو بہکا دیا آخر
وہ ہی جلوے تھے اُن کے ہم جنھیں حیرانیاں سمجھے

تو کیا اے موت، رازِ آخری ہے زیست کا یہ بھی؟
کہ میں افتاد اپنی خود نہ سمجھوں، نوحہ خواں سمجھے

میں اس دنیا میں اے سیمابؔ اک رازِ حقیقت تھا
سمجھنے کی طرح اہلِ جہاں مجھ کو کہاں سمجھے

ہم اک دن جلتے جلتے خاکستر ہو جائینگے
دیکھیں وہ خاکستر میں کیونکر آگ لگائینگے؟

غم کے ناکام افسانے بس اتنے کام آئینگے
میں کہہ کر پھٹ پڑونگا وہ سُن کر شرمائینگے

جوشِ طلب ہی غیرت کیا ہمتو مانگے جائینگے
کچھ تو اُنھیں شرم آئیگی جب دامن پھیلائینگے

ہم کو یارانِ محفل، شمعِ سرِ محفل سمجھیں
شب بھر جل کر کاٹیں گے صبح ہوئی بجھ جائینگے

بادل تھے، گھنگھنانے تھے، جھولے تھے، پیمانے تھے،
پوچھ رہا ہوں ساقی سے ساون پھر کب آئینگے؟

آپ نے حکمِ عام دیا کوئی ہمارا نام نہ لے
اب ہم دیوانے دل کو کیا کہہ کر بہلائینگے؟

دید سے اُن کی مطلب ہی، گھر نہ سہی محشر ہی سہی
ہم وارستہ دیکھیں گے وہ مجبور آ جائینگے

خیر وہ ہم موسیٰ نہ سہی آپ بھی برقِ طور نہیں!
جس دن آنکھیں چار ہوئیں دیکھ خود اُٹھ جائینگے

تجھ سے ہم سب رشتہ ہے دونوں عالم جان گئے دنیا ہو یا عقبیٰ ہو تیرے ہی کہلائینگے

قدر گذاری کا سیماب وہ محفل میں اذن تو دیں
ہم بھی اپنی آنکھوں میں کچھ آنسو بھر لائینگے

اگر بیزارِ پردہ طلعتِ جانانہ ہو جائے خرابِ جلوہ ہو کر آدمی دیوانہ ہو جائے

بہت آسان ہے دنیا کو بیگانہ بنا لینا ہم اپنا دل جسے دیدیں وہی بیگانہ ہو جائے

ہجومِ یاس و غم، اور یہ اندھیری رات، یہ بادل! کوئی بجلی کا شعلہ ہی چراغِ خانہ ہو جائے

مری دیوانگی پر طعنۂ احباب معمل ہے ہو جس کو ہوش رسوائی وہ کیوں دیوانہ ہو جائے؟

ادب سے اے حریفِ طور و موسیٰ عرضِ حسرت کر کہیں ایسا نہ ہو انداز گستاخانہ ہو جائے

"نمودِ صبح" ہو یا "شامِ صحرا" مصلحت یہ ہے جو آئے میرے ویرانے میں وہ دیوانہ ہو جائے

ابھی سجدہ فروشانِ حرم کا رخ بدلتا ہے کسی پہلو سے کعبے کی طرف بتخانہ ہو جائے

زمیں کیونکر اٹھالے بارِ تنہا شمعِ سوزاں کا اگر محفل میں کم خاکسترِ پروانہ ہو جائے

وہ نظریں منفعل ہوں سنتے سنتے داستاں دل کی اسی حیلے سے شاید مختصر افسانہ ہو جائے

حسیں خود بیں سہی کیا عشق خود داری سے خالی ہے ذرا سی چھیڑ میں کیوں آدمی دیوانہ ہو جائے

میں پروانہ ہوں اس تخیل کی روشن سوادی کا کہ جو تاریک رہ کر بھی چراغِ خانہ ہو جائے

کہانی ہے تو اتنی ہے فریبِ خوابِ ہستی کی کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

چلو ہم دے کے اپنی جان تکمیلِ جفا کر لیں
مکمل آج تو سیماب یہ افسانہ ہو جائے

آہ جسے دیوانگی کہتے ہیں فرانس کی نسبت سے فرنچ صاحبوں نے کرکن دیوانہ ہوا۔

چمک جگنو کی، برقِ بے اماں معلوم ہوتی ہے
قفس میں رہ کے قدرِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

سحر تک سنی نالہ رائیگاں معلوم ہوتی ہے
یہ دنیا تو بقدرِ یک فغاں معلوم ہوتی ہے

کسی کے دل میں گنجائش نہیں وہ بارِ ہستی ہوں
لحد کو بھی مری مٹی گراں معلوم ہوتی ہے

خزاں کے وقت بھی خاموش رہتی ہے فضا ساری
چمن کی پتی پتی رازداں معلوم ہوتی ہے

وہ کثرت ہو طلاطم کی کہ اب جو کچھ ہے دریا ہے
مری کشتی بھی اک موجِ رواں معلوم ہوتی ہے

چمن کے سانحے کو مدتیں گذریں مگر اب بھی
چمکتی ہے جو بجلی آشیاں معلوم ہوتی ہے

یہ گردش ہے کہ جب منزل پہ پہونچا گم ہوئی منزل
مری قسمت شریکِ کارواں معلوم ہوتی ہے

شکستہ، سرخمیدہ، سوختہ، خاکستر آلودہ،
یہی تو میری شاخِ آشیاں معلوم ہوتی ہے؟

ہوائے شوق کی قوت نہاں لے آئی ہے مجھ کو
جہاں منزل بھی گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے

ترقی پر ہے روز افزوں خلشِ دردِ محبت کی
جہاں محسوس ہوتی تھی وہاں معلوم ہوتی ہے

قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترکیب رکھی ہے؟
کہ ہر بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

نہ کیوں سیمابؔ مجھ کو قدر ہو ویرانیٔ دل کی
یہ بنیادِ نشاطِ دو جہاں معلوم ہوتی ہے

ناحق شکایتِ غمِ دنیا کرے کوئی،
غم ہے بڑی خوشی جو گوارا کرے کوئی

مشکل، کہ شرحِ اشک تمنا کرے کوئی
ممکن، کہ ایک قطرہ کو دریا کرے کوئی

ہر لمحے کی فنا میں ہے اک زندگی نہاں
کیوں آج ہی سے ماتمِ فردا کرے کوئی؟

رگ رگ میں دل کی جذب ہے اک محشرِ امید — اندازۂ ہجوم، تمنا کرے کوئی
جب ہے خیالِ عشرتِ دنیا فقط فریب — پھر کیوں خیالِ عشرتِ دنیا کرے کوئی؟
ایمن کا ذرّہ ذرّہ حریفِ کلیم ہے — مقصد یہ ہے کہ قصدِ تماشا کرے کوئی
ہے اُن کے آستاں پہ ہجومِ غرور و ناز — گنجائشِ جبیں ہو تو سجدا کرے کوئی
یوسفؑ غیور، فطرتِ یوسفؑ غیور تر! — کیا اعتبارِ خوابِ زلیخا کرے کوئی
جلووں کی اشتیاق نے عادت بگاڑ دی — ورنہ خود انتظارِ تماشا کرے کوئی

ہر شخص ہے خراب تمنّا بقدرِ ذوق
سیمابؔ کس سے عرضِ تمنا کرے کوئی؟

وہ حصّہ ہے مرا جو تیری آنکھوں سے برستی ہے
میں خود اک میکدہ ہوں، میری مستی میری مستی ہے
خودی کی حس نہ ہو یہ عشرتِ بادہ پرستی ہے
ترا احساس تو سب سے بڑی توہینِ مستی ہے
جہانِ رنگ و بُو میں مستقل تخلیقِ مستی ہے
چمن میں رات بھر بنتی ہے۔ اور دن بھر برستی ہے
سکوتِ پُر بیاں ہے خامشی پھنائے فطرت کی
یہاں کا ذرّہ ذرّہ ترجمانِ رازِ ہستی ہے
نگاہِ عشق و چشمِ حُسن، دو ساون کے بادل ہیں،

یہ جب ملتے ہیں، دل پر ایک بجلی سی برستی ہے
یہ ہے کثرت پسندی اک جہاں کو دیکھتا ہوں میں
پرستار آپ کا ہوں، یہ مری وحدت پرستی ہے
اگر ہے زندگی منظور، بے سوچے فنا ہو جا
مذاقِ عاشقی میں نیستی کا نام ہستی ہے
تعیّن بر طرف قبروں پہ یکساں فاتحہ پڑھیے
جو اب بے نام زندہ ہیں یہ اُن لوگوں کی بستی ہے
نہ ہونا ہی مرا اک فلسفہ ہے تیرے ہونے کا
تری ہستی کہاں گر میری ہستی، میری ہستی ہے!
سُنا اک نغمہ ایسا گونج ہو جس کی قیامت تک
نہ جانے کل یہ کیا ہو جائے۔ ابتک سازِ ہستی ہے
حقیقت ہر نظر پر چوم لیتی ہے مری آنکھیں
تعالی اللہ، کیا نعمت مری صورت پرستی ہے!
یکایک پھر چراغ امید کے ہونے لگے روشن
یہ صبحِ روزِ محشر ہے کہ شامِ صبحِ ہستی ہے؟
فغاں کی بجلیاں چمکا نہ یوں تاریک راتوں میں
بصیرت ہو تو آنکھوں پر تجلّی خود برستی ہے

خودی کو ترک کر کے مست ہو، پھر با خدا ہو جا
حدیثِ بیخودی کا سب سے پہلا درس ہستی ہے

سبک رَویوں ہوں مٹ کر جادۂ حسن و محبت میں
کہ میں آگے ہوں، کوسوں مجھ سے پیچھے میری ہستی ہے

وصالِ دوست ہے، تکمیلِ نقصِ بے خودی کر لے
سنبھل اے بے خبر اب اس سے آگے حدِّ ہستی ہے!

خدا سے حکمِ تنسیخِ اجل مانگیں گے محشر میں،
مگر یہ نوٹ "اب" یہ نوٹ قصۂ مابعدِ ہستی ہے!

دنیا کہ ایک شعبدۂ اعتبار ہے
خوابِ تعیّنات، سرابِ بہار ہے

اب اس سے بڑھ کر اور ہو کیا عشرتِ سکوں
جس نے دیا ہے غم - وہ مرا غمگسار ہے

دل ہے کہ اور کچھ مرے پہلو میں، کیا خبر
اتنا سمجھ رہا ہوں کوئی بے قرار ہے

لائے اِدھر نسیم نویدِ بہار کیوں؟
کس کو یہاں دماغِ نشاطِ بہار ہے

چمکا سوادِ گور پہ تارا جو بعدِ شام
میں نے سمجھ لیا کہ چراغِ مزار ہے

آ زردۂ خزاں سے یہ کہدوں کہ شامِ غم
دیباچۂ فسانۂ صبحِ بہار ہے

منزل نظر نہ آئے تو منزل کا کیا قصور
ہر کارواں کے منہ پہ نقابِ غبار ہے

اُف رُعبِ بیکسی کہ قفس مُنہ سی بول اُٹھا
اِس کو نہ چھیڑ نالۂ اسیرِ بہار ہے

تڑپینگے اب نہ غم کی گوارائی کے لئے
اچھا یوں ہی سہی تمھیں ناگوار ہے

میں دیکھتا ہوں آپ کو حدِّ نگاہ تک، لیکن مری نگاہ کا کیا اعتبار ہے!

سیمابؔ صوتِ نغمہ ہو، یا ہو نوائے غم
مقصود ایک نالۂ بے اختیار ہے

سُننے والا ہو تو دنیا مطلقاً الہام ہے — جسقدر ذرّے ہیں سب کے لب پر اک پیغام ہے
شامِ فرقت انتہائے گردشِ ایام ہے — جتنی صبحیں ہو چکی ہیں، آج سب کی شام ہے!
آپ کا جانا، فقط اک آپ کا جانا نہیں، — ختمِ مستی، رخصتِ بادہ، وداعِ جام ہے
شرحِ مشرب کی کروں اپنے، مگر کس نام سے؟ — میرا کیفِ بیخودی اک لذّتِ بے نام ہے
کوئے جاناں دیکھ کر جنت سہی یوں یاس ہوں — پوچھتا پھرتا ہوں: کیا جنت اسی کا نام ہے
دیکھئے کیا ہو قفس میں صورتِ لیل و نہار — اب تو آزادی ہے، اپنی صبح، اپنی شام ہے
اس طرح دنیا ہے اک معمورۂ نازِ و نیاز — ذرّے ذرّے پر مرا سجدہ تمہارا نام ہے
اللہ اللہ یہ تغافل اور اس پر یہ غرور! — کیا مجھے ناکام کر دینا بھی کوئی کام ہے؟
وہ کوئی حیلہ نہ کر دیں نیّتِ وعدہ بخیر! — آج کچھ افسردہ افسردہ چراغِ شام ہے
ایک ہی سا ہے نظامِ عشق کا ماضی و حال — میری تجویزِ وفا ناکام تھی، ناکام ہے
دار کی توہین ہے خاموش ہونا بعدِ دار — وہ زباں کیوں بند ہو جس پر تمہارا نام ہے
سجدہ ناقص ہے، جو باقی ہوش سجدے کا رہے — ہو نہ محویّت تو سودائے پرستش خام ہے
سانس رُکتے ہی بھرے گھر میں قیامت آگئی — میں انہیں کس طرح سمجھاؤں مجھے آرام ہے
ہاں نہیں **سیمابؔ** مجھ کو اپنی ہستی پر غرور — جانتا ہوں میں، مری دنیا فنا انجام ہے

آپ نے بھی کہدیا سودائیِ محفل مجھے
اب کہاں ہے ہمتِ عرضِ متاعِ دل مجھے

جب ازل میں دل ملا کونین کا حاصل مجھے
شور برپا ہوگیا، اک دل مجھے اک دل مجھے!

پھر سجانی ہے دلِ برباد کی محفل مجھے
اک تصور چاہیے تصویر کے قابل مجھے

دے نہ دھوکے اب طلسمِ جلوۂ باطل مجھے
دُور پہونچا، دُور لے پہونچا مذاقِ دل مجھے

ہے پہونچنا جلوہ گاہِ ناز تک مشکل مجھے
ہر نظر ہے ایک جادہ ہر قدم منزل مجھے

تھی مشیّت ہی خلافِ عشق ورنہ خلقتاً
آسماں کو داغِ دل ملتا بہ کامل مجھے

نقشِ پروانہ جسے کہتے ہو میرا دل نہ ہو
دیکھ لینے دو ذرا خاکسترِ محفل مجھے

رقص فرما ہیں، ہزاروں طور لاکھوں تجلیاں
کون لے آیا قریبِ جلوہ گاہِ دل مجھے؟

تو خدا پر چھوڑ دے کشتی تو خود لے ناخدا
آئے لینے کے لئے طوفان تک ساحل مجھے

ہوش کی دنیا جہانِ خواب بن کر رہ گئی
اک نظر ہستی ہوئی سی کر گئی غافل مجھے

بے خودی کچھ دے گئی ہے اُن کی جلووں کا پتہ
آج خلوت میں اُلٹنا ہے نقابِ دل مجھے

پہلے وحشت دی مجھے، پھر اُسکی رحمت دیکھئے
عمر بھر کو دیدیا زندانِ آب و گل مجھے

پھر تری محفل میں دورِ جام مجھ تک آئے گا
ہے ابھی تو اعتبارِ گردشِ محفل مجھے

اضطرابِ دل سے اے سیمابؔ کیوں گھبراؤں میں؟
کچھ سمجھ کر ہی دیا ہے اضطرابِ دل مجھے

دل ہے، تو کیسکا اسے کاشانہ بنادے
کعبہ نہیں بنتا ہے تو بُتخانہ بنادے

ہستی کو مری مستیٔ پیمانہ بنادے
اے بے خبری حاصلِ میخانہ بنادے

طالب ہوں میں اُس ایک نگاہِ دوا ثر کا
جو ہوش میں لا کر مجھے دیوانہ بنا دے

اے برہمن اکدن بتِ پندار کو اپنے
توڑ، اور چراغِ درِ بت خانہ بنا دے

رسوا ہو دمِ صبح نہ رازِ شبِ محفل
اے کاش کوئی تربتِ پروانہ بنا دے

کہدو کہ بہار آئے تو بیکار نہ بیٹھے
دیوانہ بنے یا مجھے دیوانہ بنا دے

خاکسترِ پروانہ میں جو سوز نہاں ہے
جب چاہے پھر اس خاک سے پروانہ بنا دے

ٹکڑے جو بچیں بت کے اٹھیں پھینک نہ بتگر
دو چار چراغِ درِ بت خانہ بنا دے

"کن" محشرِ کونین ہے "دل" دفترِ دارین
وہ چاہے تو دو حرف سے افسانہ بنا دے

وہ مستیِ پندارِ شکن مانگ رہا ہوں
جو قابلِ یک سجدۂ میخانہ بنا دے

اے شمع یہ پروانے کو ہنس ہنس کے جلانا!
کیا ہو جو تجھے بھی کوئی پروانہ بنا دے؟

دل ظرفِ طلب، خونِ جگر مائلِ مستی،
میں بادہ بناتا ہوں تو پیمانہ بنا دے

دیوانگیٔ عشق بڑی چیز ہے سیماب
یہ اُس کا کرم ہے جسے دیوانہ بنا دے

مدتیں گذری ہیں ساقی دعوتِ سینا کئے
جنمیں بجلی بھر کے رکھدی تھی وہ شیشے کیا کئے؟

حسن نے تو ہیں مفہومِ وفا کیا کیا نہ کی
سیکڑوں معنیِ غلط، اک لفظ کے پیدا کئے

زندگی شاید اسی بیچارگی کا نام ہے!
سرنگوں بیٹھے ہیں اپنے دل کو بیگانا کئے

سر بصحرا عشق، صد نالہ بہ لب پھرتا رہا
حسن کافر مطمئن بیٹھا رہا پردا کئے

طور، اے خاکسترِ سوزِ دلِ موسیٰ بتا!
جو دیے تھے برقِ ایمن نے وہ جلوے کیا کئے؟

کر گئی سرخوش شرابِ یک نگاہِ مستِ حسن، تھا ذرا سا نشّہ، لیکن عمر بھر جھومے گئے

آستانِ حسن اے سیمابؔ آخر تھا نہ عرش!
عشق نے توہین کی فطرت کی، سجدے کیا کئے!

جرس ہے کاروانِ اہلِ عالم میں فغاں میری — جگا دیتی ہے دنیا کو صدائے "الاماں" میری
مکان و لامکاں میرا، بساطِ دو جہاں میری — ہیولہ ہے یہاں میرا، حقیقت ہے وہاں میری
توجہ پہلو سے چاہے مجھ سے سن لے داستاں میری — تری آواز کی محکوم ہے، آخر زباں میری
جہاں میں قابلِ تقلید تھی طرزِ فغاں میری — پیچھے نے بالآخر "یاد کر لی" کی کہاں میری
نہ فریاد، نہیں ہے آدمی میں تابِ نظّارہ — سنبھل جاؤ، اب اٹھتی ہے نگاہِ ناتواں میری
مری ترکیب میں اجزائے رزم و بزم شامل ہیں — کہیں کچھ ہوں، کہیں کچھ ہو یہ ہیں چنگاریاں میری
تصوّر میں وہ کچھ برہم سے ہیں کچھ مہرباں سے ہیں — اُنھیں شاید سُنائی جا رہی ہے داستاں میری
چلا ہوں، ہیئتِ موسیٰ بدل کر بہرِ نظّارہ — تماشا ہو، جو یہ کوشش بھی جائے رائیگاں میری!
گل و لالہ کی اجزا سے میرے تخلیق ہوتی ہے — میں ایسا ہوں، کہ مٹی بھی نہیں ہے رائیگاں میری
ہر اک پتھر یہاں اے برہمن، اک دل ہے عارف کا — بہت تیرے صنمخانے میں کوئی ہے اذاں میری
ہر اک ذرّہ ہے صحرا، اور ہر صحرا ہے اک دنیا — مگر اس وسعتِ عالم میں گنجائش کہاں میری!
مری حیرت پہ وہ تنقید کی تکلیف کرتے ہیں — جنہیں یہ بھی نہیں معلوم نظریں ہیں کہاں میری
مسلسل تھا، فریبِ خواب گاہِ عالمِ فانی — کہ میں سوتا رہا چلتی رہی عمرِ رواں میری
وہی لمحہ ورودِ ناگہاں کا اُن کے ہو شاید — جتا کر آئے جب بھی آئے مرگِ ناگہاں میری

پھر اسکے بعد، میرے مُنہ سے جانے کیا نکل جائے؟ جب اُن کا نام لوں میں قطع کر لینا زباں میری

مذاقِ ہمزبانی کو نہ ترسوں باغِ جنت میں،
کوئی سیماب حوروں کو سکھا دیتا زبان میری

شوق کے نغمے نہ تھے آوازِ سازِ دل نہ تھی جب تھے محفل میں ہم، محفل تری محفل نہ تھی
کوئی دنیا کی کشش، نیت فریبِ دل نہ تھی فطرتِ عالی مری پروردۂ باطل نہ تھی
تھی خدا پر اک نظر، اور ناخدا پر اک نظر وہ بھی تھا کیا وقت جب کشتی سرِ ساحل نہ تھی
طعنِ ناکامی نہ دے، ناکامِ سعیِ وصل کو یہ ہوس کی جنگ تھی، جنگِ حق و باطل نہ تھی
تا بہ منزل راستے میں منزلیں تھیں سیکڑوں ہر قدم پر ایک منزل تھی، مگر منزل نہ تھی
مرحبا حسنِ نگارستانِ عالم، مرحبا! کون سی صورت تھی جو تصویر کے قابل نہ تھی
تھی بنائے گلستاں میرے نشیمن کے لئے جل گئی وہ شاخ آخر جو مرے قابل نہ تھی
پہلوئے انساں میں دل رکھا کہ محشر رکھ دیا اور کوئی چیز کیا موزوں بجائے دل نہ تھی؟
خلقتاً وہ غیر تھے، اور نسبتاً جزوِ حیات ایک حد فاصل تھی لیکن ایک حد فاصل نہ تھی
پھر میں آیا ہوں تری پاس اے امیرِ کارواں چھوڑ آیا تھا جہاں تو وہ مری منزل نہ تھی
میں ہی چوکا، میں ہی بھولا، میں ہی سمجھا کا ہمنشیں سچ کہا تو نے کہ شرحِ آرزو مشکل نہ تھی

یا نہ تھی سیماب دنیا فطرتاً ہستی شناس
یا مری ہستی ہی دنیا میں کسی قابل نہ تھی

کوئی کیا منصوبۂ موسیٰ کا ہو امیدوار اب بھی سوادِ طور پر ہے جلوۂ برق و شرار اب بھی

فسردہ دل سہی، دل پر نہیں ہے اختیار اب بھی
بنا کرتا ہوں وحشی حسبِ منشائے بہار اب بھی

ازل میں تھا میں تیرا منتظر، ہے انتظار اب بھی
مذاقِ عشق ہے پابندِ جبر و اختیار اب بھی

غمِ ہستی سے پژمردہ ہوں، تو اس پر نہ جا گلچیں
مرا اک قطرہ خوں ہے حاصلِ صد لالہ زار اب بھی

نہیں دار و رسن ہی میں وہ اب پہلی سی گیرائی
انا الحق کہنے والے ہیں بہت منصور دار اب بھی

نہیں ہے سیرِ ویرانے میں کوئی زندگی باقی،
مگر ہوتا ہے رقصِ سایۂ ابرِ بہار اب بھی

مرے نالوں میں اک بے اختیاری ہو چکی پیدا
انھیں اپنے تبسم پر نہیں ہے اختیار اب بھی

زمانہ ہو گیا، مہمانِ شورش گاہِ ہستی ہوں
یہ ہنگامہ مری نازک طبیعت پر ہے بار اب بھی

مذاقِ سیرِ دل والوں کے ٹھنڈے سے نہیں مٹتا
ہماری روح کرتی ہے طوافِ لالہ زار اب بھی

نگاہِ اعتبارِ دوست نے جس کو نکالا تھا،
کھٹکتا ہے خیالوں میں وہ کانٹا بار بار اب بھی

نہ کر باور کہ فارغ ہوں غمِ الفت سے تربت میں
ہے کوسوں دور میری منزلِ صبر و قرار اب بھی

توجہ اے مرا رنگِ تکلم سوچنے والے
سناتی ہے مرے اشعارِ غم لوحِ مزار اب بھی

حیاتِ جاوداں **سیماب** حاصل ہے محبت میں
مگر ہوں شکوہ سنجِ ہستیٔ ناپائدار اب بھی

محو ہو کر بے نیازِ ما سوا ہو جائیے
اُن سے جب مل جائیے سب سے جدا ہو جائیے

خلوتِ غم کی خموشی میں فنا ہو جائیے
یوں حیات افروزِ ناموسِ وفا ہو جائیے

منتہائے منزلِ جاناں ہے جب وارفتگی
کیوں نہ آوارہ مثالِ نقشِ پا ہو جائیے

سازِ دل کا نغمۂ خاموش سننا ہے اگر
صورتِ پروانہ مطلق بے صدا ہو جائیے

شرطِ آزادیِ اسیری جب مسلّم ہو چکی
توڑیئے پھر کیوں قفس کو، کیوں رہا ہو جائیے

عالمِ اسباب میں پیدا کیا ہے خود مجھے
خود تقاضا ہے کہ بے برگ و نوا ہو جائیے

آپ کی آواز میں ہے دعوتِ منزل کا راز
کاروانِ شوق کی بانگِ درا ہو جائیے

ہے فریبِ رنگ و بو سے یہ تدبیر گریز،
سادگیہائے محبت میں فنا ہو جائیے

دیکھئے اُن کو کنارِ آرزو پر اختیار
جب وہ ہوں آغوش میں بے دست و پا ہو جائیے

کیا تعجب ہے یہی ہو اُنکا وقتِ التفات
کیوں وفورِ یاس سے نالہ سرا ہو جائیے

ہم تو اپنی بے خودیِ شوق میں سرشار تھے
آپ سے کس نے کہا تھا خود نما ہو جائیے

اپنی صورت میں اگر جلوہ گری سے ہے حجاب
میری ہی تصویر میں صورت نما ہو جائیے

پردۂ منزل میں چھپ چھپ کر تبسم کیجئے
باشکستہ کارواں کا آسرا ہو جائیے

خود بخود سیماب ہیں اُن کی نگاہیں ملتفت
ہے یہ وقتِ خاص، مصروفِ دعا ہو جائیے

لگی دل کی بھڑک اُٹھی ہے داغ کہنہ دل سے
کوئی پروانوں کو آواز دے لے اُنکی محفل سے

جہاں میں ہوں فرشتے بھی پہنچ سکتے ہیں مشکل سے
مری منزل بہت آگے ہے آزادی کی منزل سے

کہاں وہ اور کہاں سینا، کہاں موسیٰ کہاں جلوہ!
کوئی پردہ اُٹھا ہوگا تجلی خانۂ دل سے

حجابِ گل میں خونابے چھلکتے دیکھ لیتا ہوں
سمجھ لیتا ہوں میں انجامِ محفل رنگِ محفل سے

مری کشتی سے طوفاں کھیلتا ہے کھیل لینے دو
ملوں گا خاکِ ساحل میں، بنا ہوں خاکِ ساحل سے

مذاقِ حسن و ذوقِ دید، سب اسبابِ تسکیں ہیں
مگر دل نے وہ شورش کی کہ میں گھبرا گیا دل سے

اُٹھوں، بیٹھا رہوں، کچھ جاؤں، یا خاموش ہو جاؤں؟ نہیں معلوم محفل مجھ سے ہے یا میں ہوں محفل سے؟
اُنھیں دلیں یقیں کر کے تصور بے تکلف ہے یہ دیوانہ ابھی واقف نہیں آدابِ محفل سے
بغیر شمع، تربت پر کہاں امکانِ پروانہ کوئی ذرّہ اُڑا ہوگا مری خاکسترِ دل سے!
دلِ اک دولت سرا ہے بے نیازِ کاسہ و دامن جو چاہا سر جھکا کر لے لیا دروازۂ دل سے
یہ بعدِ سیرِ طوفاں خشکیٔ نظّارۂ ساحل! اگر موج آگئی تو پھر گذر جاؤں گا ساحل سے
بس اب اک دو قدم کی بات ہے وہ آگئی منزل! مسافر، اللہ اللہ، اسقدر مایوسِ منزل سے!
بتائے وسعتِ کون و مکاں اس کو کہاں رکھیں؟ ذرا سا در لیکر آئے ہیں ہم اُن کی محفل سے

مناسب ہے ہمیں ہمراہ لے لیں قافلے والے
کہ ہم واقف ہیں اے سیمابؔ راہ و رسمِ منزل سے

سر میں سودائے جنوں، طوفانِ چشمِ تر میں ہے اک تباہی دشت میں ہے اک تباہی گھر میں ہے
جوشِ ساقی کی نگاہِ میکدہ پرور میں ہے کون مہمانِ کرم بزمِ مے و ساغر میں ہے؟
شمع سے خالی ہے لیکن شمع کے پیکر میں ہے آہ، وہ محفل جو پروانوں کی خاکستر میں ہے
کعبہ و دیر و کلیسا بھی کنشت و عرش بھی، ساری دنیائے عقیدت تیری سنگِ در میں ہے
موجِ آب و رنگ میں پنہاں ہے نقشِ لازوال اک حقیقت آدمی تصویر کے پیکر میں ہے
ذرّہ ذرّہ ہے خرابِ نشّۂ عرفانِ دوست میں ہی کیا چکر میں ہو سارا جہاں چکر میں ہے
ہے یہاں تعمیر میں تخریب جس پہلو سے ہو، خود شکستِ آذری پروردۂ آذر میں ہے
خوں رگوں میں دوڑتا ہے کوئی قاتل ہو نہ ہو کچھ تو گیرائی حدیثِ گردن و خنجر میں ہے!

ہے بتدریج آفتِ عالمِ مذاقِ کافری
ہائے پھر وہ بت، جو پوشیدہ ابھی پتھر میں ہے

قید و آزادی، مری پرواز کے دو کھیل ہیں
اک قفس اس پر میں ہے ایک آشیاں اس پر میں ہے

خاک کر دل کو پھر اس میں ڈھونڈ نورِ زندگی
تیرا آئینہ ابھی اندیشۂ جوہر میں ہے

عشرتِ فردا کی ندرت کاریاں نکلیں فریب
میرے ساغر سے جو چھلکی تھی وہی کوثر میں ہے

عاشقی بے ابتدا، بے انتہا جوشِ نیاز
ایک سجدہ آستاں پر ایک سجدہ سر میں ہے

جیسے ہم ایمان و جان و دل کے حامل ہی نہ تھے!
کس قدر غارت گری اک جلوۂ کافر میں ہے

دل ہو یا ہو روح، اے سیمابؔ ہستی یا عدم
سب اُسی کے گھر ہیں یہ موجود وہ ہر گھر میں ہے

سرگشتۂ و خرابِ بہار و خزاں رہے
برسوں ہم آشیاں میں بھی، بے آشیاں رہے

سب چاہتے ہیں بزمِ جہاں میں نشاں رہے
یہ ہو تو بے نشانیٔ عالم کہاں رہے؟

یوں شاید اس کو فکرِ بہار و خزاں رہے
کچھ روز آشیاں میں مری باغباں رہے

منزل پہ کوئی ذرّہ تو اپنا پہونچ گیا
تھی مصلحت کہ خاکِ رہِ کارواں رہے

کچھ وقت کٹ گیا تھا تری یاد کے بغیر،
ہم پر تمام عمر وہ لمحے گراں رہے

وہ کیا ہو آپ کے کرمِ بے سبب سے شاد
جس کو توقعِ ستمِ ناگہاں رہے

واماندگی نے نقصِ طلب کو چھپا لیا،
اچھے رہے جو گردِ پسِ کارواں رہے

شبنم کے ہم مزاج تھے، سبزے کے ہم مذاق
ہم کیوں دماغِ دشت و چمن پر گراں رہے؟

صرف اتنی بحث مسئلہ گلستاں میں ہے
جس کا ہو باغ کیوں نہ وہی باغباں رہے

مجبورِ توبہ، جب دلِ بے کیف تھا مرا، اُس وقت یہ بہار کے بادل کہاں رہے؟
اندازۂ خموشیٔ صبحِ بہار کر، جب روحِ آشیاں نہ رہے آشیاں رہے
فطرت ہو نالہ دوست، تو پھر اس کا کیا علاج ہم کاروان میں بھی جرسِ کارواں رہے
اب کیا نشاطِ سیرِ چراغاں و جوئبار! اب میری چشمِ شوق میں آنسو کہاں رہے
یارب مری طرف رہے کچھ دن ہوا کا رُخ جب آشیاں جلے تو قفس تک ہواں رہے

سیماب ہے خرابۂ عالم جنوں اثر
رہنا ہو جس کو خاک بسر، وہ یہاں رہے

آنسوؤں میں حسن کی شمعیں فروزاں کیجئے آج ہر موج تصور میں چراغاں کیجئے
جمع، خاکِ دل کے ذرّاتِ پریشاں کیجئے پھر مرتب اک نیا سازِ غزل خواں کیجئے
دیجئے پھر عشقِ سادہ کو فریبِ التفات ق پھر نئے انداز سے تجدیدِ پیماں کیجئے
پھر تبسم سے مجھے وحشی بنانے آئیے پھر نظر سے بخیۂ چاکِ گریباں کیجئے
پھر تکلم سے مجھے بادہ عطا فرمائیے پھر مجھے مستی سے میخانہ بداماں کیجئے
خاطرِ افسردہ کو دیکر پھر اپنا اضطراب بے نیازِ شورشِ غمہائے دوراں کیجئے
آیئے میرے تصور میں ستاروں کی طرح پھر مری تاریک راتوں کو درخشاں کیجئے
پھر مرے ہمراہ چلئے میرے سائے کی طرح چھاؤں میں تاروں کی گلگشتِ گلستاں کیجئے
دیجئے نظروں کو گردش شوخیٔ رفتار سے ✣ پھر مرے خوابِ تمنا کو خراماں کیجئے
اک سکوں کیا اور بھی کچھ نعمتیں مل جائینگی تا بہ امکاں سیرِ جلوہ زارِ امکاں کیجئے

حادثوں کی ایک دنیا ہے جہانِ رنگ و بو
چھوڑیئے گلشن، تماشائے بیاباں کیجئے!

جوشِ یک حسن تھا ہنگامِ شرطِ ضبطِ غم
کس طرح اُس ہاتھ کو صرفِ گریباں کیجئے!

تا کبے سیماب یہ بیکاری و افسردگی
کام کے دن ہیں کوئی کارِ نمایاں کیجئے

ایک نازک سی نظر کو دل میں مہماں کیجئے
درد کا ساماں بہ مقدارِ رگِ جاں کیجئے

ہے حقیقت میں یہی پردہ حجابِ جزو و کل،
غور سے نظّارۂ ترکیبِ انساں کیجئے

آخری دیوانۂ دشتِ جنوں میں ہی تو ہوں
بند میرے بعد راہِ بابِ زنداں کیجئے

منزل اک شمعِ سرِ جادہ نظر آنے لگے
تا بہ منزل اس قدر شمعیں فروزاں کیجئے

مل گئے دو ہاتھ آزادی کے ماتم کو تو کیا!
پاؤں پیدا قابلِ زنجیرِ زنداں کیجئے

روح کو پہنچے حکایاتِ محبت کا ثواب
نوحہ خواں کو میری تربت پر غزلخواں کیجئے

عشق اک سوزِ مکمل، حسن برقِ ناتمام،
طور کو لا کر مرے سینے میں پنہاں کیجئے

غافل اس کی خود نمائی نے خدا سے کر دیا
سب سے پہلے ناخدا کو نذرِ طوفاں کیجئے!

ایک عالم اور بھی ہے صد بیاباں صد چمن
سرنگوں ہو کر کبھی سیرِ گریباں کیجئے!

فطرت اے سیماب، ہے روزِ ازل سے غم پسند
کیا علاجِ خاطرِ آزردہ ساماں کیجئے

آ، مرے غمکدے میں آ سازِ وفا لئے ہوئے
اپنے لبوں میں نغمۂ رنج رُبا لئے ہوئے

حسن کی سروریوں کا ہوں مزا لئے ہوئے
دل ہے مرا مگر ہنوز سوز و فا لئے ہوئے

جی میں ہے چشم و لب کو پھر دعوتِ اشک و آہ دوں
مہ میں ہو گئیں مجھے نام ترا لئے ہوئے

مجھ کو مٹا کے حسن کیوں عشق سے بے نیاز ہو
ہے مری خاک قوتِ نشو و نما لئے ہوئے

ہو نہ ملول چارہ گر اب تو قریب ہے سحر
دیکھ وہ آ گئی قضا میری دوا لئے ہوئے

ذوقِ تلاشِ دوست کا لطف نہ پوچھ ہم نشیں
ایک سکونِ خاص ہے گردشِ پا لئے ہوئے

قہر میں اُن کے جوش ہے رحم بہانہ کوش ہے
ہم بھی کھڑے ہیں سامنے عذرِ خطا لئے ہوئے

جورِ سرائے حسن سے آج پھر آ رہا ہوں، میں،
دل کو لہو کئے ہوئے لب پہ دعا لئے ہوئے

دستِ امید و بیم میں یوں دلِ غم شناس ہے
جیسے ہو کارواں کوئی قبلہ نما لئے ہوئے

بارگہِ جمال میں، بیٹھا ہوا ہوں مطمئن
عہدِ وفا کئے ہوئے عہدِ وفا لئے ہوئے

پھونک بھی دو جلا بھی دو، آؤ ہمیں مٹا بھی دو
ہم تو ازل سے آئے ہیں ذوقِ فنا لئے ہوئے

حسن کا حسن سے ہوا آج مگر مقابلہ!
ہے جو نگاہِ مستِ دوست کیف نما لئے ہوئے

دیکھنا وارثی کہیں دل مرا گر پڑا نہ ہو،
موجِ حبابِ ہے یہ کیا آئینہ سا لئے ہوئے!

عشق میں بھی حسن کا انداز ہونا چاہیے
رنگ استغنا بقدرِ ناز ہونا چاہیے

یوں طوافِ بارگاہِ ناز ہونا چاہیے
آنکھ میں بھی پاؤں کا انداز ہونا چاہیے

مدعی سرِّ محبت بھی نہ تجھ سے چھپ سکا
تیرے دل میں تو جہانِ راز ہونا چاہیے

جب نہیں میرا گذر، انجام کے ادراک تک
کیوں مجھے سرگشتۂ آغاز ہونا چاہیے؟

خونِ دل سے برق بننے کا تقاضا ہے مجھے
کچھ مداوائے رگِ پرواز ہونا چاہیے

آدمی جب رازِ ٹھہرا پردۂ تخلیق کا،
آدمی کو آشنائے راز ہونا چاہیئے

ہم نفس بندِ قفس کا توڑنا مشکل نہیں،
صرف احساسِ پرِ پرواز ہونا چاہیئے

دل وہ کیا، جس دل میں ویرانی کی گنجائش نہ ہو
ساز میں ظرفِ شکستِ ساز ہونا چاہیئے

برہمی ہر دو عالم ہے حقیقت حسن کی
ذرّے ذرّے کو امینِ راز ہونا چاہیئے

لطفِ غم یہ ہے کہ دنیا کو خوشی معلوم ہو
سوز سے پیدا طرازِ ساز ہونا چاہیئے

ہو گراں پائے نظر پرتا نہ راہِ بزمِ دوست
مثلِ پروانہ سبک پرواز ہونا چاہیئے

کیف و کم بھی، سوز و غم بھی، درد بھی تسکین بھی
ساز میں سب کچھ ہو لیکن ساز ہونا چاہیئے

ہے حدیثِ زندگی یماب اشکِ وقتِ نزع
آج بالیں پر کوئی ہمراز ہونا چاہیئے

محوِ کیتائیِ حسنِ جاوداں ہو جایئے
آج اپنے عشق سے بھی بدگماں ہو جایئے

پھر مرے جذبات کی کلیوں کے بوسے لیجئے
پھر لبِ رنگیں سے دل میں گلفشاں ہو جایئے

ہر طرف سے برقِ جلوہ ہے تماشا آزما
اِن اُجالوں میں کہاں آخر نہاں ہو جایئے؟

تا کجا ہم انتشارِ گردِ راہِ کارواں
دو قدم بڑھ کر امیرِ کارواں ہو جایئے

رفعتوں کی ہیں فضاؤں میں بہت گنجائشیں
اک نئی انگڑائی لے کر آسماں ہو جایئے

آستانِ دوست پر اک نقش بن کر بیٹھئے
کون کہتا ہے کہ خاکِ آستاں ہو جایئے

زندگی اور موت، دو آویزشیں ہیں عارضی
ہر تعیّن سے گذر کر، جاوداں ہو جایئے؟

کیجئے اقدامِ کوئے دوست، مٹ کر ہی سہی
رہگذارِ شوق میں کیوں رائیگاں ہو جایئے

دل اگر سیمابؔ واقف ہے مزاجِ حسن سے
کیوں ذرا سی بات کہہ کر سرگراں ہو جائیے

اور اک خود آشنا نہیں ہے
ورنہ انساں میں کیا نہیں ہے

کیا ڈھونڈنے جاؤں میں کسیکو
اپنا مجھے خود پتا نہیں ہے

دل اور خراب صد تباہی
یہ آپ کے کام کا نہیں ہے

اس طرح مجھے ستا رہے ہو
جیسے میرا خدا نہیں ہے

اللہ رے تسلسلِ مساوات
اب غم میں بھی کچھ مزا نہیں ہے

کیوں جامِ شراب ناب مانگوں
ساقی کی نظر میں کیا نہیں ہے

حسن اور نوازشِ محبت!
ایسا تو کبھی ہوا نہیں ہے

اس دل پہ نثار دونوں عالم،
جس میں کوئی مدعا نہیں ہے

سیمابؔ چمن میں جوشِ گل سے
گنجائشِ نقشِ پا نہیں ہے

آئیے بزمِ وفا کے سازوساماں دیکھئے
شمع کی لَو پر پتنگوں کو غزلخواں دیکھئے

ہے یہ انجامِ شکستِ عہدِ پیماں دیکھئے
اپنا دامن دیکھ کر، میرا گریباں دیکھئے

کس قدر معصوم تھا ہستی کا عنواں دیکھئے
سب سے پہلا صفحۂ تاریخِ انساں دیکھئے

یہ سمجھئے ہے کوئی دیوانہ دنیا میں اُداس
بے سبب جب بزمِ عالم کو پریشاں دیکھئے

خاک پر بیٹھا ہوا ہوں، عرش و کرسی در نگاہ
میری بے سامانیوں کے سازوساماں دیکھئے

ایک انگڑائی جو لی دشت و جبل تھرّا گئے
پردے پردے میں مذاقِ حسنِ پنہاں دیکھئے

غرق ہو کر ہر تعیّن سے میں باہر آ گیا،
ایک لمحے میں نہ ساحل ہی، نہ طوفاں دیکھئے

خونچکاں سرہیں بجائے لالہ و گل ہر طرف
دیکھئے فصلِ بہارِ بزمِ امکاں دیکھئے

سُست ہے تکبیر اور ناقوس سرمہ در گلو
کون ہو اب میری منزل کا حدی خواں دیکھئے

چاہتا ہوں جذب ہو جاؤں جمالِ دوست میں
کم نگاہی پر مرا ذوقِ فراواں دیکھئے

پھول جب میں نے چنے، کانٹوں پہ سر رکھنا پڑا
کیا ہوا انجامِ بہارِ گل بداماں دیکھئے

انقلاب آنے کو ہے کوئی، یقیں فرمائیے
جب مجھے آزردہ دل، افسردہ ساماں دیکھئے

اضطرابِ ساز ہی، نغموں کی الجھن کا سبب
کیجئے اک نالہ جب دل کو پریشاں دیکھئے

دیجئے جوشِ جنوں کو دعوتِ دامانِ حسن
موسمِ گل آ کے بے جیبِ گریباں دیکھئے

پھر تصوّر میں مرے زلفیں بکھیرے آئیے
پھر مجھے اپنے تصوّر میں پریشاں دیکھئے

کیا پتہ اپنا دیا ہے اس معمّے کے نثار!
جان دیکھی ہو تو نزدیکِ رگِ جاں دیکھئے

یاد ہو تو ایک ترکیبِ تماشا یہ بھی ہے
جلوہ خود بن جائیے جب دل کو ویراں دیکھئے

شامِ ہستی ہو چکی سیمابؔ، اب کیسا فروغ،
صبح ہونے تک یونہی خوابِ پریشاں دیکھئے

منزل خود آئے دعوتِ منزل لئے ہوئے
اُٹھّے تو کوئی جذبۂ کامل لئے ہوئے

میں خود ہوں بارِ دوریٔ منزل لئے ہوئے
نازک سا ایک پردۂ حائل لئے ہوئے

ڈھونڈا کیا ہوں جلوہ گہِ دوست عمر بھر
پہلو میں اپنے جلوہ گہِ دل لئے ہوئے

میں مشرقِ جمال تک آخر پہونچ گیا
دشت و چمن سے سلسلۂ دل لئے ہوئے

ہے عالمِ مجاز، فریبِ نظر ہنوز
ہر آئینے میں جلوۂ باطل لئے ہوئے

پھر آرہا ہے کوئی تصور میں بار بار
خلوت کدے میں عشرتِ محفل لئے ہوئے

پنہاں ہر اک نگاہ میں، اک موجۂ بہار
ہر سانس میں نوائے عنا دل لئے ہوئے

ڈالے ہوئے ہر اک خمِ گیسو میں اک گرہ
ہر ہر گرہ میں عقدۂ مشکل لئے ہوئے

مینا فروز آنکھوں میں لب ہائے سادہ میں
تارے بھرے ہوئے مہِ کامل لئے ہوئے

اک قشقۂ جمیل، جبینِ کشادہ میں،
کعبے کا اور دیر کا حاصل لئے ہوئے

گردن میں ہار، دستۂ گل دستِ ناز میں
یعنی پیامِ طوق و سلاسل لئے ہوئے

اک باانکپن فسردہ جگر کے محاذ میں
اک تیر بالمقابلۂ دل لئے ہوئے

وہ اور اس کے ساتھ یہ بیداریٔ جمال،
میں اور ایک دیدۂ غافل لئے ہوئے

بیٹھا ہوں انتظار میں، پیغامِ صبح کے
منزل کے پاس حسرتِ منزل لئے ہوئے

آتا ہے دلنواز سرِ رہگذار کون؟
ہر ذرّہ خراب ہوا اک دل لئے ہوئے

پیدا ہوا ہوں عالمِ رسوائے دہر میں
اک ظرف، رازِ حسن کے قابل لئے ہوئے

برسوں جہانِ حسن کی رنگیں بساط پر
جھوما کیا ہوں میکدۂ دل لئے ہوئے

اٹھا ہوں صبحِ حشر ترے انتظار میں
اُچٹی سی ایک نیند بمشکل لئے ہوئے

چھیڑ اے نگاہِ ناز کہ مدت گذر گئی!
چمکی کوئی قریبِ رگِ دل لئے ہوئے

یہ امتیازِ ساحل و دریا مٹائیے
طوفاں میں ڈوب جائیے ساحل لئے ہوئے

پروانے خاک ہو چکے، دل سرد ہو چکے بیٹھے رہو لٹی ہوئی محفل لئے ہوئے
سیمابؔ میرے بعد کہاں سوز و سازِ عشق
میں جا رہا ہوں گرمیٔ محفل لئے ہوئے

ختم اس طرح نزاعِ حق و باطل ہو جائے اک طرف دونوں جہاں ایک طرف دل ہو جائے
حسن حیرت نہ بنے آئینۂ دل ہو جائے حاصلِ جلوہ نہیں، جلوۂ حاصل ہو جائے
اُس کے نیرنگِ تجلّی کو کوئی کیا سمجھے جو کہیں چشمِ تماشا، کہیں محفل ہو جائے
دل میں وہ شورشِ جذبات وہ گرمی نہ رہی اب یہ شاید نگہِ دوست کے قابل ہو جائے
میری ہستی نہیں، پردہ ہے تری عصمت کا پردہ اُٹھ جائے تو چھپنا ترا مشکل ہو جائے
میں نے دیکھا ہے تری حسن کو جویائے ہوس اب نگاہوں میں حقیقت بھی نہ باطل ہو جائے
کسے دنیا میں ہوا احساسِ نشاطِ فانی غمِ ہستی سے اگر سیر مرا دل ہو جائے
شدّتِ سوزِ نہاں کو جو منہ سمجھا ہے وہ مری ایک نظر کا متحمل ہو جائے
ابھی طوفاں ہے کہ پُر شور ہے سیلابِ امید اپنی حد پر یہ پہونچ جائے تو ساحل ہو جائے
دل کا مفہوم ہے، ہلکی سی تڑپ سینے میں تو جدھر دیکھ لے پیدا اُدھر اک دل ہو جائے
جانتا ہوں کہ وفا جی سے گذرنا ہے، مگر یوں نہ دے طعن کہ جینا مجھے مشکل ہو جائے
دو جہاں ترکِ محبت میں کئے تیرے لئے اور بیزار جو تجھ سے بھی مرا دل ہو جائے!
عشق میں قسمتِ پروانہ اُسے ملتی ہے شمع سے پہلے جو خاکسترِ محفل ہو جائے
کوئی اُس وقت مسافر کی نگاہیں دیکھے! چاند جب صبح کو آسودۂ منزل ہو جائے

قدرِ انساں ہے ابھی بزمِ عدم میں سیماب
کیوں وہ دنیا میں رہے جو کسی قابل ہو جائے

دل اور نفس کی یکجائی سازگار نہیں ہے
بقیدِ نفس، محبت کا اعتبار نہیں ہے

خفا نہ ہو جو مجھے عشق میں قرار نہیں ہے
قرار و صبر پہ انساں کو اختیار نہیں ہے

ستم، اور اُس پہ یہ تاکید لب تک آہ نہ آئے
یہ اور کیا ہے اگر جبر و اختیار نہیں ہے؟

اُنھیں کمالِ تصور نے جذب کر لیا شاید
مری نگاہ میں اب رنگِ انتظار نہیں ہے

کبھی وہ دن تھے کہ انکار جانتی ہی نہ تھی تم
اب ایک عرضِ تمنا پہ بار بار نہیں ہے

کسی سے کیا ابدی ربط کی کروں میں تمنا
مجھے خود اپنی ہی جنبش پہ اعتبار نہیں ہے

دل اُن کو دیکھ کے میں دل سی نجات پا تو چکا ہوں
یہ اور سینے میں کیا ہے جسے قرار نہیں ہے؟

یہاں بہار و شباب ایک ہی ہوا کے ہیں دو رُخ
شباب بھی نہ رہے گا اگر بہار نہیں ہے

ہر ایک ذرّہ ہے اک نقشِ پائمالِ خرابی،
وہاں بھی قبر بنا دو جہاں مزار نہیں ہے

دعائیں مانگ رہا ہوں، مگر سکوں نہیں دل کو
خدا کے پاس بھی شاید مرا قرار نہیں ہے

سرائے دہر میں سیماب جاگنا ہے مناسب
مسافروں کو یہاں خواب سازگار نہیں ہے

تجھ پر سب کی نظر نہیں ہے
تو جلوۂ رہگذر نہیں ہے

انسان کی آن میں اُسے دیکھ
وہ شان میں جلوہ گر نہیں ہے

دیتا ہے مجھے فریب کافر!
کیا تجھ کو خدا کا ڈر نہیں ہے

دنیا کو مری خبر ہو شاید — دنیا کی مجھے خبر نہیں ہے
ہر کام میں شرط ہے سلیقہ — اک سانس بھی بے اثر نہیں ہے
اللہ ری ہجومِ جلوۂ حسن — گنجائشِ یک نظر نہیں ہے
ہے ہر نفس اعتراف تیرا — نغمہ بے نغمہ گر نہیں ہے
جلوہ ہے ترا محیطِ عالم — موقوف نگاہ پر نہیں ہے
آزاد ہے وسعتِ تصور — زندانیٔ بام و در نہیں ہے
گلگشت نہ عشرتِ صبوحی! — اب میری سحر سحر نہیں ہے

آسودگی کا وجود سیماب

کہتے ہیں کہ ہے، مگر نہیں ہے

حسن کو، اے خدائے حسن، فطرتِ بیقرار دے — یا مری چشمِ شوق کو ہمتِ انتظار دے
رنگِ نوائے عشق ہوں، دل کو مرے قرار دے — خاطرِ غم شکار دے، فکرِ شگفتہ کار دے
پیچ ہی بیانِ چارہ گر، ہاں میں سکوں پذیر ہوں — سمجھے وہ میرا درد کیا، جس کو خدا قرار دے
میں جو ہوں چمن نشیں رازِ شگفت کھل نہ جائے — دعوتِ وحشت و جنوں کیوں نہ مجھے بہار دے
بد نظرِ جوشِ عشق کو ہو نہ وفا کا امتحاں — کیوں مرے دل پہ وہ تجھے قوتِ اختیار دے
فطرتِ ظرف آشنا، جبر تجھے روا نہیں، — یا مرے دل کو غم نہ دے، یا غمِ سازگار دے
پھر ہی فضائے زندگی تشنۂ کیف و سرخوشی — اپنے کرم سے پھر مجھے باغ بنا، بہار دے
ذرّہ نواز ہو اگر رفعتِ آستانِ دوست — کیوں مری خاک کو صبا زحمتِ گلعذار دے

بارشِ کلِ دیاس سے سرد ہو رُوحِ ساقیہ ! بادۂ شعلہ بار دے، ساغرِ پُر شرار دے
وہ بھی مری طرح رہے سوزِ یہاں خدا کرے اُسکو قرار کیوں ملے، جو نہ مجھے قرار دے

شکوہ فضولِ وارثی، جب شنوا نہیں کوئی،
ہے گذراں یہ زندگی، جیسے بھی گذار دے

ساقی ہوا بیگانہ، بیگانے سے کیا کہئے، بے کیفیٔ میخانہ، میخانے سے کیا کہئے
کیا اُس کو نہیں معلوم آشفتگیاں میری نیرنگیٔ ویرانہ، ویرانے سے کیا کہئے
تکبیر و فا سُن کر خاموش ہیں بُت لیکن پُر شور ہے بتخانہ، بتخانے سے کیا کہئے
ہم تشنہ قسمت سے، ہیں تشنہ لبِ بادہ گردش میں ہے پیمانہ، پیمانے سے کیا کہئے
یوں شمع پہ جھک پڑنا ہے شمع کی رُسوائی سُنتا نہیں پروانہ، پروانے سے کیا کہئے
دنیا سے اک افسانہ، کہنے کو تھے، پھر سوچا دنیا ہے خود افسانہ، افسانے سے کیا کہئے

سیماب کی سرمستی، اور نغمۂ ہستی!
دیوانہ ہے دیوانہ، دیوانے سے کیا کہئے

افسوس گذر گئی جوانی وہ لمحۂ کیف و شادمانی !
پھر آئی نہ لوٹ کر جوانی اے وائے نشاطِ عمرِ فانی !
خوش ہوں کہ نہ تھی یہ جاودانی مر مر کے کٹی ہے زندگانی
کیا آگئی نیند اہلِ محفل؟ کہنی تھی ہمیں بھی اک کہانی !
میں حسن و وفا کی زندگی تھا تم نے مری قدر ہی نہ جانی

تاروں کو بہارِ مستقل دی اور مجھ کو دیا شبابِ فانی!
اب تک ایمن کی وادیوں سے آتی ہے صدائے لن ترانی
ہمنے وہ خواب پھر نہ دیکھا اک رات کو آئی تھی جوانی!

سیماب کرواب اللہ اللہ
تا چند یہ ماتم جوانی!

ہو اسیر، تو کیوں انتشار میرے لئے ہے بہار کے لئے میں ہوں، بہار میرے لئے ہے
یہ پھول اور یہ تارے مری بہارِ نظر ہیں یہ آسمان و زمیں کا نکھار میرے لئے ہے
ہے کون میرے سوا قابلِ نظارۂ فطرت یہ لالہ زار یہ ابر بہار میرے لئے ہے
ہیں صبح و شام تنوّع مرے مذاقِ نظر کے تمام گردشِ لیل و نہار میرے لئے ہے
غلط کہ آپ کریں زحمتِ مسرّتِ خاطر بجا، کہ تلخیٔ غم خوشگوار میرے لئے ہے
تمہاری بزم کو حاصل ہے اک ثباتِ مسلسل یہاں تو زندگی مستعار میرے لئے ہے
مرا تمام سرو زنشاط دی اُسے یارب اُداس اگر نہ مہ بادہ بار میرے لئے ہے
سزائے موت دی کیوں جو نام لوں میں تمہارا حیات کس کے لئے ہے جو دار میرے لئے ہے
نگاہ و ذہن ہے احساسِ کائنات سے خالی، عجیب چیز ترا انتظار میرے لئے ہے
یہ وہم ہو کہ حقیقت، سکوں اسی سے ہے دل کو سمجھ رہا ہوں کہ تو بیقرار میرے لئے ہے

دماغِ عشق ہے سیماب، کامیابِ تصوّر
وہ کہہ رہے ہیں "کوئی بیقرار میرے لئے ہے"

سجدوں پہ میرے طعنہ طرازی ہے یہ بے نیازی! یہ بے نیازی!
جلوے حقیقی، نظریں مجازی اللہ رے تیری حسرت نوازی!
دل میرا کعبہ، میں محوِ کعبہ ہوں خود ہی مسجد، خود ہی نمازی
کب تک خرابِ عجزِ محبت یارب مجھے بھی دے سرفرازی
کلیوں کی لَو پر جگنو اُڑانا خاکِ چمن کی افسانہ سازی!
دیوانہ بن کر، ابرو ہوا کو! میں نے سکھا دی دیوانہ سازی
وہ میرے دل کے ٹکڑوں سے کھیلے آئی ہو جس کو آئینہ سازی

سیماب پر یہ الہامِ رنگیں،

بندہ نوازا، بندہ نوازی!

اے خاک کے پُتلے تجھے ادراک نہیں ہے کچھ اور بھی ہو تجھ میں فقط خاک نہیں ہے
شایانِ مرتبۂ ہستیٔ غمناک نہیں ہے اظہارِ حقیقت میں مجھے باک نہیں ہے
انجام ہر اک شے کا بجز خاک نہیں ہے کیا ہو جو یہ عالم خس و خاشاک نہیں ہے
باقی دلِ مجروح میں ہیں کچھ نفسِ سرد یہ صید ابھی قابلِ فتراک نہیں ہے
کہدو وہ ستارے تجھے بے فکر نہ بیٹھیں میری ہی لئے گردشِ افلاک نہیں ہے
آنکھوں سے ہر اک پردۂ موہوم ہٹا دے اتنی نگہِ شوق ابھی چالاک نہیں ہے
بے پردہ ہو کس طرح وہ جلوہ ترے آگے دل پاک سہی تیری نظر پاک نہیں ہے
آدابِ تجلی میں ہے گنجائشِ ترمیم نظارہ تری حسن سے بے باک نہیں ہے

کر چاکِ گریباں سے نہ اندازۂ وحشت — دیوانے ابھی دامنِ دل چاک نہیں ہے
کیا تو نے دمِ غسل وضو غور کیا ہے — ہر آبِ رواں پاک ہے تو پاک نہیں ہے

سیمابؔ دعا کیجئے کیا صبر و سکوں کی
شائستۂ تسکیں دلِ غمناک نہیں ہے

خود اُٹھ کے میرے ہاتھ گریباں میں آ گئے — شاید قدم جنوں کے گلستاں میں آ گئے
ناحق حیات و مرگ کے طوفاں میں آ گئے — ہم کیوں فریبِ عالمِ امکاں میں آ گئے
بیداریٔ جمال کی آسودگی بخیر! — کیوں آپ میرے خوابِ پریشاں میں آ گئے؟
اس کے سوا بتائیں اسیری کا کیا سبب — گھبرا کے انجمن سے تو زنداں میں آ گئے
کانٹے دلِ وجگر میں تھے حسرت کی جس قدر — آخر وہ سب سمٹ کے رگِ جاں میں آ گئے
طوفانِ غم کے جب نہ کہیں پا سکے قرار — لینے پناہ قسمتِ انساں میں آ گئے
ہیں کچھ سنی ہوئی سی صدائیں فضا میں آج — کیا میرے ہمصفیر بھی زنداں میں آ گئے؟
کیا ہو گا چار پھولوں سے اے موسمِ بہار — یہ تو ہمارے گوشۂ داماں میں آ گئے!
جوشِ بہار اور یہ بے اختیاریاں! — سوئے چمن چلے تھے بیاباں میں آ گئے
بھاری قدم، نظر متحیر، نفس دراز — کیا ہم حدودِ کوچۂ جاناں میں آ گئے؟

سیمابؔ کبر و ناز کا انجام کچھ نہ پوچھ
سب رفتہ رفتہ گورِ غریباں میں آ گئے

دل تیرے تغافل سے خبردار نہ ہو جائے — یہ فتنہ کہیں خواب سے بیدار نہ ہو جائے

انسان کہیں سرگشتۂ پندار نہ ہو جائے
بیزارِ گنہ ہو کے، گنہگار نہ ہو جائے

دشواریٔ جادہ سے ہے آسانیٔ منزل
ہو جائے یہ دشوار جو دشوار نہ ہو جائے

مدت سے یہی پردہ یہی پردہ دری ہے
ہو کوئی، تو پردے سی نمودار نہ ہو جائے!

بکتا پھرے یوسف کی طرح حسن ہمیشہ
کوتاہ اگر ظرفِ خریدار نہ ہو جائے

سجدے ہی سے تقدیسِ پرستارِ وفا ہے
سر اپنا اٹھا لی تو گنہگار نہ ہو جائے!

مجھ سے مرا افسانۂ ماضی نہ سنو تم،
افسانہ نیا پھر کوئی تیار نہ ہو جائے

اے مستیٔ الفت سبق کفر دیے جا
جب تک مجھے ہر چیز سے انکار نہ ہو جائے

ہونا ہے جو ہستی کو مری خاک ہی سیمابؔ
پہلے ہی سے کیوں خاکِ دریار نہ ہو جائے

مجھے عمرِ رفتہ کی پھر آرزو تھی
تصوّر میں اُن سے یہ کیا گفتگو تھی؟

تجھے میرے جذبات کی جستجو تھی
مری آرزو بھی کبھی آرزو تھی

تری خاکِ درغازۂ آبرو تھی
نمازِ طلب بے نیازِ وضو تھی،

شکایت ہے بے سود بے رنگیوں کی
طبیعت ہی کیوں مائلِ رنگ و بُو تھی

ہیں اب صرفِ انجامِ گلشن نگاہیں
وہ موسم گیا جب نظر چار سو تھی

ہمیں بادہ نوشی کی عادت تھی جب تک
شرابِ محبت سُبو در سُبو تھی

تھیں سب تیری نیرنگیاں اے تمنا
جوانی کی تاروں بھری رات تو تھی

بیاں کون اسرارِ میخانہ کرتا
میں بیخود، صراحی گرہ در گلو تھی

تمھیں میری گ رگ میں مہکے ہوئے تھے — مرے ہر نفس میں تمھاری ہی بُو تھی
کہاں تک ترے سوزِ غم سے نہ جلتا — کہ دل کی بساط ایک قطرہ لہو تھی

ابھی اور سیماب رونا تھا دل کو
ابھی گرمِ خاکسترِ آرزو تھی

حجابِ حُسن سے ہونا ہے آشکار مجھے — ترا ظہور ہے اپنا ہی انتظار مجھے
خوشی حرام ہے ساقی پس بہار مجھے — نہیں نہیں، نہ پلا خونِ لالہ زار مجھے
بہت دنوں میں جو اُس جلوہ گاہ تک پہنچا — تجلیوں نے کیا خوب مار مجھے
اب اپنے ذوقِ تماشا کو کیا دعائیں دوں — بنا دیا ہے حریفِ جمالِ یار مجھے
خبر نہیں ہے مرے مطمحِ نظر کی اُنھیں — سمجھ رہے ہیں وہ اپنا ہی بیقرار مجھے
جو کھول دوں ابھی یہ راز کیا قیامت ہو؟ — کہ پردہ در نظر آیا وہ پردہ دار مجھے
جدا نہ کر مجھے نظروں سے میں نہ کہتا تھا، — اب انتظار تجھے ہے کہ انتظار مجھے؟
یہ جوشِ رنگ، یہ سیلِ نمو، یہ شوخیِ بُو، — کہیں اُچھال نہ دے دامنِ بہار مجھے
تھی ذرّے ذرّے پہ تکرار جب میں زندہ تھا — زمین والوں نے کیوں کر یا مزار مجھے
بنا کے بے خبرِ ہوش کر دیا آزاد — جنوں نے بخش دیا دل پر اختیار مجھے
صدائے صور سے میں قبر میں جاگوں گا — کسی سُنی ہوئی آواز سے پکار مجھے

سلام ہستیِ سفلہ نواز کو سیماب
ہوا نہ عیشِ زمانے کا سازگار مجھے

حیرانِ جمال ہے خدائی — اب ختم بھی کر یہ خود نمائی
میں اور جہانِ بے وفائی! — تھی کوئی کشش جو کھینچ لائی
آتے بھی ہو تو ابھی نہ آنا — ہوں محوِ تصوّر آزمائی
اے حسن تری دیار میں بھی — موجود ہے لعنتِ گدائی
بہتر ہے سرود و چنگ و نے سے — اک نغمۂ مستِ بے نوائی
جو وقت گیا وہ پھر نہ لوٹا — جو سانس گئی وہ پھر نہ آئی
پچھلی راتوں کو میکدے میں — ڈھلتا ہے دماغِ پارسائی
میں اور یہ میری خود فروشی — تُو اور یہ تیری خود نمائی
آخر میں سمجھ گیا تُو کیا ہے — دے اور فریبِ آشنائی!
میری ہی نیازمندیوں سے — قائم ہے وقارِ کبریائی

منزل پہ پہونچ گیا میں سیماب
بے معذرتِ شکستہ پائی

نشاطِ بزمِ عالمِ زندگی کے کیف و کم تک ہے — یہ ساز اور اس کا ہر نغمہ نفس کے زیر و بم تک ہے
حیاتِ عاشقی میری دلِ مانوسِ غم تک ہے — مذاقِ آرزومندی فقط میرے ہی دم تک ہے
مرا کفر محبت ہے فروغِ جادۂ ایماں — وہ شمعِ دیر ہوں میں دشتی جس کی حرم تک ہے
کریں اربابِ جادہ کیا تعیّن اپنی منزل کا — مسلسل اک سفر ایوانِ ہستی سے عدم تک ہے
یہ خوں آمیز آنسو، اور یہ طوفان خیز آہیں — مرے دل میں ترا غم ہی نہیں پایانِ غم تک ہے

تری محفل میں اپنی نارسائی کی شکایت کیا
غنیمت ہے کہ در پردہ رسائی تیری ہم تک ہے

ہمیں اپنے ستم کی لذتوں میں محو رہنے دے
ہوس تیرے کرم کی صرف احساسِ ستم تک ہے

یہ راہِ عشق کی دشوار سامانی، معاذ اللہ!
قدم کیسا کہ لرزش میں یہاں نقشِ قدم تک ہے

تصوّر کے حجابوں میں، تخیّل کے نقابوں میں
نظر کا سلسلہ تیری حریمِ محترم تک ہے

دیے جا کیفِ غم اپنا مجھے جبتک دیا جائے
دلِ غم آشنا کی شادمانی تیرے غم تک ہے

بساطِ دھر کی سیماب گرمی ہیں مری نغمے
مرا چرچا عرب تک ہے، مری شہرت عجم تک ہے

ہے وقفِ جہاں فکرِ میخانہ کشا میری
ساقی ترے کانوں تک پہونچی یہ صدا میری

تھی راہبرِ منزل، تقلیدِ بجا میری
آخر مرے پس رو کے کام آئی وفا میری

میرا وہ ہی عالم ہے، جو عشق میں پہلے تھا
دنیا کے بدلنے سے بدلی نہ فضا میری

یہ ناشنوائی کا تیری نہ کرے شکوہ
یارب دلِ انساں کو فریاد سکھا میری

تم سے بھی سکوں میں نے مانگا تھا خدا جانے
اب تک ہے فضاؤں میں محفوظ دعا میری

جذب اس نے بھی کرلی ہے کیا قوتِ پامردی
اُٹھتی نہیں آندھی سے خاکِ کفِ پا میری

اقصائے ازل سے وہ ہمراہ چلا میرے
سیماب سُنی جس نے آوازِ درا میری

اپنی نگاہِ ناز کو جرأتِ بے رُخی نہ دے
مجھ امید رکھ مجھے، فرصتِ خودکشی نہ دے

کیفِ خودی سے مست ہو، دعوتِ بیخودی نہ دے
ذہنِ فریبِ خوردہ کو زحمتِ آگہی نہ دے

حسن کو کریاز مند میرے حریمِ شوق کا — قسمتِ غزنوی تو دے شوکتِ غزنوی تو دے!
مرحلہ ناشناس ہوں، پائے طلب بہک نہ جائے — جادۂ عشق میں مجھے ہمتِ خود روی تو دے
صرف ہے مطمحِ نظر قربتِ محفلِ جمال — خادمِ آستاں سمجھ، عزتِ دوستی تو دے
تابِ نظر نہیں مگر ٹٹنے کی آرزو تو ہے — ہمتِ طور دے مجھے فطرتِ موسوی تو دے
میرے لبوں کی جنبشیں ہیں مری روح کا کشاد — پرسشِ غم کیے ہی جا، مہلتِ خامشی تو دے
میں ہوں ترا غم آشنا، عیشِ جہاں سے کام کیا — دیکے متاعِ سرمدی، دولتِ عارضی تو دے
کسلِ حیات و کسلِ غم، ایک دل اور دو ستم — لذتِ غم تو کر عطا، لذتِ زندگی تو دے!
ہاں مری بیقراریاں موجِ مئے مجاز ہیں — میں تو ہوس پرست ہوں تہمتِ عاشقی تو دے

دفن اسی جگہ تو ہیں عشق و وفا کے میکدے
دعوتِ کیف و وجد کیوں تربتِ وارثی نہ دے

آنسوؤں سے نہ دل کی آگ دبی — ہائے اے عشق تیری بے سببی!
لبِ رنگین و بادۂ عنبی! — زندہ باش اے مذاقِ تشنہ لبی!
میں ہوں عشق و وفا کا پیغمبر — مجھ سے دامن کشی ہے بولہبی
چاہتا ہے اگر سکوں دل کا — چھوڑ دے شیوۂ سکوں طلبی
صبر کی عشق میں نہ کر تلقین — عشق اور صبر، وائے بوالعجبی!
عشق میں امتیازِ ملت کیا — عجمی دل ہے بندۂ عربی
آہ، اس بزمِ حسن کے آداب! — انتہائے ادب ہے، بے ادبی

مجھے کیفِ جمالِ خوشۂ تاک تجھے خوئے فشردۂ عنبی،

پھر تغافل ہے حسن میں سیماب
آج پھر ایک آہِ نیم شبی!

گیا موسم، ابھی تک نقشِ دیوانہ نہیں اُٹھی ہوائے دشت شاید بن کے افسانہ نہیں اُٹھی
اُڑا پروانہ بنکر سوزِ دل سے کب کوئی شعلہ کہ مقدم کو ہماری شمع کاشانہ نہیں اُٹھی
ابھی لاانتہا ذرّوں کو ہے پرواز کی حسرت کوئی آندھی بقدرِ ظرفِ ویرانہ نہیں اُٹھی
تصوّر جلوۂ مستور کو صد رنگ کر دے گا نیا فتنہ اُٹھا، دیوارِ بُت خانہ نہیں اُٹھی
وفورِ بسملِ غم سے بیٹھتا جاتا ہے دل میرا نگاہِ حسن اب تک لے کے پیمانہ نہیں اُٹھی
یہ دنیا ہے ابھی بیگانۂ رندی و سرمستی ابھی تبلیغ کو کیا قومِ میخانہ نہیں اُٹھی؟
کبھی کے کام آجاتے یہ ٹکڑے جام و مینا کے مرے ہاتھوں کوئی بنیادِ میخانہ نہیں اُٹھی
شگفتِ غنچہ و گل سے صبوحی پی رہا ہوں میں ابھی سو کر عروسِ صبح کاشانہ نہیں اُٹھی
بھڑک اُٹھی ہے کیوں دنیا مری اُنکی محبت پر یہ شورش کیوں خلافِ شمع و پروانہ نہیں اُٹھی
اُٹھاؤ عشق کا سر، توڑ دو وحشت کی زنجیریں ہنوز اس بزم سے رسمِ غلامانہ نہیں اُٹھی؟

بساطِ بزم اُٹھی، شمع اُٹھی، جامِ مے اُٹھا
مگر سیماب اب تک نقشِ پروانہ نہیں اُٹھی

تیری دنیا ہے دنیا الٰہی مگر، مطمئن ذہن دنیا نہیں ہے
کاوشِ زندگی، کاہشِ مرگ کا، کچھ نتیجہ بھی ہے یا نہیں ہے؟

پھول کا، خار کا، باغ و کہسار کا، علم انساں کو کس کا نہیں ہے؟
پھر بھی اس جلوہ گاہِ پُر اسرار کا، کوئی راز آشکارا نہیں ہے
جتنے پروانے پہلے فنا ہو چکے، کیا انہیں زندہ اور پوچھ اُن سے
دیر میں جس کے پرتو سے ہے روشنی، کیا یہ شمعِ کلیسا نہیں ہے؟
یادِ صبحِ ازل کو ہے وہ ماجرا، جب فرشتوں کا مسجود یہ تھا
ہے یہ تاوانِ اُس جرمِ تقدیس کا، سجدہ انسان کا سجدا نہیں ہے
یہ تو رسماً ہے اک عادتِ بندگی، ورنہ میں کیا مری التجا کیا!
آپ چاہیں تو کونین دیدیں مجھے، آپ کے ہاتھ میں کیا نہیں ہے؟
میں بہاریں سپردِ چمن کر چکا، تو بہاروں سے ہے گل بداماں،
میری منزل میں اور راستے میں ترے، فاصلہ کچھ زیادہ نہیں ہے
اک نشیمن، وہ خاشاکِ خس کا مکاں! اور اُس پر یہ غرّہ طیّہ فاں!
کس قدر ننگ ہیں ہی مرا باغباں، جیسے دنیا میں صحرا نہیں ہے!
مستقر اپنا دنیا کو کر لے یقیں، دے گر فکر کو اتنی زحمت
تھی جو گہوارۂ آدمِ اوّلیں، کیا یہ دنیا وہ دنیا نہیں ہے؟
سب یہ جلوے ہی جلوے تو ہیں ہر طرف، ہیں حجاباتِ اوہامِ باطل
جتنے پردے ہیں ان میں سے پردہ کوئی، حائلِ چشمِ بینا نہیں ہے
تُو اور ارمانِ حرص و ہوا و ہوس، اس کی تکمیل فطرت کرے کیوں؟

یہ تو اک آب و گندم کی انگڑائی ہے، یہ تمنّا، تمنّا نہیں ہے
حدِّ عالم سے ہوتا اگر آشنا، اس میں محصورِ انساں نہ رہتا،
آج تک تو نے تحقیق جتنا کیا، یہ جہاں صرف اتنا نہیں ہے
زندگی کا ہے ادراک مقصود اگر، قیدِ ہستی سے آگے گذر جا،
زندگی کے ظواہر پہ نقد و نظر، فلسفہ زندگی کا نہیں ہے
اختیاراتِ فطرت، ترا شکریہ! چھُٹ گئے ہم بڑی کشمکش سے،
پہلے کچھ عزم تھا دل میں اچھے بُرے، لیکن اب کچھ ارادا نہیں ہے
تیرے ہونے کا اقرار ہے ہر عدم، لیکن اقرار و انکار کیسا!
ہستی و نیستی کا توازن ہی کیا، لا بمقدارِ اِلّا نہیں ہے!
فکر کے وقت سیماب خونِ جگر، عرش کا طوف کرتا ہے اکثر
شعر کہنا ہے در اصل پیغمبری، شاعری ہے تماشا نہیں ہے!

اب کہاں وہ گرمیٔ محفلِ مجاز ہے — میں بھی پاکباز ہوں، وہ بھی پاکباز ہے
کیفِ دل سے مست ہوں، مے سے احتراز ہے — بے مزہ سہی ہے شراب، وہ بھی خانہ ساز ہے
میں ادب شناس ہوں، مائلِ خودی نہ کر — بیخودی کے ہوش تک، حدِّ امتیاز ہے
تیرا نام لے لیا اور سر جھکا دیا — یہ مرا سجود ہے، یہ مری نماز ہے
میرا ظاہر نہاں ایک ہے، مگر کہاں! — لب پہ ایک داستاں، دل میں ایک راز ہے
فطرتِ ہوس میں ہے عادتِ فنا دگی — ہے ہوس نیاز مند، عشق بے نیاز ہے

شاہبازیوں کا درس دے نہ میری ذہن کو — میری ہمّتِ بلند جبرئیل ساز ہے
ایک ہی نظر کے ساز، ہیں حقیقت و مجاز — تھا جو پہلے دلنواز اب بھی دلنواز ہے
سوزِ عشق سے ترا، دل پگھل گیا تو کیا! — شمع سر سے تا پا، مطلقاً گداز ہے
ہے رہِ طلب بری، قیدِ قرب و بُعد سے — یہ سرِ نیاز ہے، یہ حریمِ ناز ہے

میرا شعر وارثی، ہے حدیثِ دامنی
عمر میری کم سہی، زندگی دراز ہے

بھولی ہوئی یاد آئی کہانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!
واپس پھر آجائے عہدِ فانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!
ہر وقت نشّہ، ہر وقت مستی، تصویرِ جنت ایوانِ ہستی
بے جام و بادہ اک سرگرانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!
پھولوں کے گجرے، کلیوں کے گہنے، سینے پہ خُنباں، زیرِ پریشاں
شامیں معطّر، راتیں سہانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!
سینے میں گرمی، مُنہ پر پسینہ، آنکھوں میں شعلے، دلمیں طراری
نظروں میں دنیا لیلائے ثانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!
وہ اُن کا جانا دامن جھٹک کر، وہ بیٹھ جانا دل کا دھڑک کر
وہ اُن کا آنا وہ شادمانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!
وہ شامِ فرقت آفت کی گھڑیاں، اشکوں کی لڑیاں، ساون کی جھڑیاں

آنکھوں سے دل تک پانی ہی پانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!
وہ چاندنی میں نظریں بچا کر اُن کے مکاں کا طوافِ مسلسل
سب سے چھپانا رازِ نہانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!
یاوسیوں سے مجبور ہو کر، قسمت سے منت، فطرت کو سجدے،
پچھلے کو اُٹھ کر تسبیح خوانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!
خط اُن کو لکھنے راتوں کو اُٹھ کر، صفحے کے صفحے دفتر کے دفتر
پیغام پھر بھی دینا زبانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!
ساون کی بھیگی بھیگی فضا میں دل کا فسانہ جاگ کے سُننا
اپنی کہانی، دل کو سُنانی، ہائے محبت، ہائے جوانی!
گذری جوانی سیمابؔ لیکن، سوزِ محبت اب تک ہے باقی
یہ آگ شاید ہے جاودانی، ہائے محبت ہائے جوانی!

تضمین

کیف و سکونِ بزمِ ازل سے جدا ہوا — دنیا میں آکے موردِ رنج و بلا ہوا
احساسِ حسن و عشق سے دردآشنا ہوا — افسردہ سرابِ فاؤ جفا ہوا
ہنگامۂ حیات سے محوِ بکا ہوا — آزردہ کشاکشِ بیم و رجا ہوا
ان آفتوں کے بعد، خرابِ فنا ہوا — غم، قیدِ زندگی میں بھی صبر آزما ہوا
پُتلہ عذاب کا ہوا انسان کیا ہوا!

تھا یوں بھی اسمیں آگ کا طوفان بپا ہوا — پہلو میں اک خموش جہنم چھپا ہوا
یہ رنگ عشق کا تھا بظاہر دیا ہوا — ضبط اس لئے تھا پردۂ تسکین بنا ہوا
اب حسن، برق بن کے اگر شعلہ زا ہوا — مجھ کو نصیبِ طور ملا، کیا بُرا ہوا
اکسیر بن گیا، اثرِ کیمیا ہوا — تقدیر میں اضافۂ سوز و وفا ہوا
تم نے جو دل میں آگ لگا دی تو کیا ہوا!

دیوانہ پر شکیب ہے، ویرانہ رقص میں، — صحرا ہے آج صورتِ دیوانہ رقص میں
آسودہ برگ و بار ہیں، گلخانہ رقص میں، — روحِ مکیں سکوں میں ہے، کاشانہ رقص میں
بزمِ سرور و کیف ہے مستانہ رقص میں — جام و سبو کے ساتھ ہے میخانہ رقص میں
ساقی ہے مثلِ ساغر و پیمانہ رقص میں — ہے شمع آج صورتِ پروانہ رقص میں

شاید مزاجِ حسن شریکِ وفا ہوا

اب ہے وہ آسماں، وہ فضا ہے نہ وہ زمیں — پُر کیفِ میکدے، نہ وہ گلخنِ حسیں
دیر و حرم بھی حدِ نظر تک کہیں نہیں — اب فکرِ آستاں ہے نہ وہ شورشِ جبیں
ہے فکرِ پیرہن، نہ غمِ جیب و آستیں، — میں ہوں کہیں نگاہ کہیں ہے، قدم کہیں!
بے نام ایک عالمِ ہُو ہے نظر نشیں — ہستی و نیستی کی حدیں دور رہ گئیں
یہ آگیا کہاں میں تجھے ڈھونڈتا ہوا؟

اب تک تو مستقل یہ رہی خوئے عاشقی — اُس نے کیا ستم تو دعا میں نے دل سے دی
خوش تھا کہ ایک بات جو ہے رازِ زندگی — کہہ دو نگاہ وقتِ قتل بہ اندازِ سرخوشی
قاتل کے علم میں تو دعائیں رہیں مری — ہوں ترجمانِ عمر کچھ الفاظ آخری
لیکن یہ بیخودی میں بڑی بھول ہو گئی — مُنہ سے دعا نکل ہی گئی وقتِ قتل بھی
کہنا یہ تھا کہ حقِ محبت ادا ہوا!

ہے سال بھر سے مجھ کو بہاروں کا انتظار — لب تشنۂ بہار ہوں، سرگشتۂ خمار
بیٹھا ہوا ہوں خاک پہ، پامالِ رہگذار — پیمانہ در بغل، قدحِ خشک در کنار
بے کیفیوں سے دل ہے پریشان و بیقرار — آثار آج کچھ نظر آتے ہیں خوشگوار
وہ ہو اگر تو کیوں نہ اُسے لیں یہیں اُتار! — کیوں ہمنشیں، یہی تو نہیں ساقیٔ بہار؟
جاتا ہے میکدہ سا ہوا پر اُڑا ہوا

نور و ظہور ہے نہ کلیم و کلام ہے — بزمِ سحر اُداس ہے، سُنسان شام ہے

جلووں کے انتظار میں ہر خاص و عام ہے
عالم تمام تشنۂ حسنِ تمام ہے

ایمن کی وادیوں میں سکوتِ دوام ہے
گر زندگی یہی ہے تو جینا حرام ہے

یہ اہتمام ہے تو غلط اہتمام ہے!
اے خادمانِ حسن یہ کیا انتظام ہے؟

اب تک چراغ طور پڑا ہے بجھا ہوا

تھے کبر و عجز صرفِ عملِ بزمِ حسن میں،
کچھ ہو رہا تھا ردّ و بدل بزمِ حسن میں

فطرت کے جل رہے تھے کنول بزمِ حسن میں
تھا انتظامِ بزمِ ازل بزمِ حسن میں

نور آفریں جبیں پہ تھی بل بزمِ حسن میں
تھی شوق کی زباں پہ غزل بزمِ حسن میں

تھا ایک گو گو کا محل بزمِ حسن میں
بحثِ نیاز و ناز تھی کل بزمِ حسن میں

سیماب کچھ خبر نہیں کیا فیصلا ہوا؟

مثلث

گوہرِ اشک کو خوں نابۂ حرماں دیکھا　　دلِ خوں گشتہ کو سیلاب بداماں دیکھا
ایک قطرہ تھا جسے خالقِ طوفاں دیکھا

ذہنِ فطرت کی تمنا ہی پریشانی تھی　　غالباً فطرتِ دنیا ہی پریشانی تھی
جسے دیکھا اُسے دنیا میں پریشاں دیکھا

رشتۂ اُنس سے مربوط تھی انسانیت　　اُنس کے واسطے مشروط تھی انسانیت
دے دیا منصبِ الفت جسے انساں دیکھا

اِنہیں دو چیزوں کو برہم زنِ محفل پایا　　نغمۂ عشق کو ہنگامہ گرِ دل پایا
حسن کی چھیڑ کو مضرابِ رگِ جاں دیکھا

رنگِ امید سے تھا جب دلِ مضطر خالی　　شبِ غم جب نظر آتا تھا بھرا گھر خالی
میں نے چند آنسوؤں کو دولتِ داماں دیکھا

ماہِ تاباں ہو کہ تاروں کے جلو خانے ہوں　　شمع ہو، رونقِ محفل ہو، کہ پروانے ہوں
جسے دیکھا اُسے اک رات کا مہماں دیکھا

نہ ستا شوق کی نظروں کو زمانے کی طرح　　طور پر پھر نظر آ جا نظر آنے کی طرح
یوں دکھا جلوہ کہ موسیٰ بھی کہیں ہاں دیکھا!

آئینہ تھیں نظرِ گلکدۂ رس کی راتیں　　کتنی رنگین و مبارک تھیں قفس کی راتیں

آنکھ جب بند ہوئی خوابِ گلستاں دیکھا
شرط تھی پنجہ کشی دہر کی وسعت پہ مجھے ہوش آیا تو ہنسی آگئی وحشت پہ مجھے
اپنے ہاتھوں میں جب اپنا ہی گریباں دیکھا
کوئی نازاں مجھے جانا کوئی مجبورِ حجاب کوئی گریاں مجھے سمجھا کوئی آسودۂ خواب
سب نے آنکھوں پہ مرا گوشۂ داماں دیکھا
اور کیا کرتے نہ خاموش اگر رہتے ہم کس سے سیماب پریشانیٔ دل کہتے ہم
ہم نے اپنی ہی طرح سب کو پریشاں دیکھا

مثلّث

کیا چارۂ مصیبتِ شام و سحر کریں، حد ہو کوئی تو صبر ترے ہجر پر کریں
آخر ہم ایک حال میں کبتک بسر کریں؟
بے پردہ تجھ کو دیکھ لیں کوشش اگر کریں اہلِ نظر وسیع گر اپنی نظر کریں
ذرّے نقاب الٹ کے تجھی جلوہ گر کریں
تائید میں ہے حسنِ جواں کی خدائے حسن فطرت ہر اعتبار سے ہے ہمنوائے حسن
آمین تم کہو تو دعائیں اثر کریں
کمزور ہے خیال، تصور ہے منتشر ہو منتشر نہ سلسلۂ حسن و عشق اگر
نالے براہِ راست تجھی پر اثر کریں

پھر چھیڑ دے نیا کوئی نغمہ رباب حسن، پھر وہ فضائے طور میں بھر دیں شرابِ حسن
پھر انتظامِ دعوتِ کیف نظر کریں

اب یہ تعیّنات ہیں، تیری قسم فضول جب تُو نہیں تو خلوتِ دیر و حرم فضول
اب کیا یہاں پرستشِ دیوار و در کریں

جائز ہے آہ و نالہ، نہ یارائے صبر ہے اے اقتضائے ضبط یہ ضد ہے کہ جبر ہے
کیا آنکھ ہم بجدۂ مژہ بھی نہ تر کریں

ہنگامہ در کنار ہے دنیائے خیر و شر ہے محشر نگاہ تماشائے خیر و شر
فرصت کہاں کہ فیصلۂ خیر و شر کریں

معمورِ سوز و درد ہے سازِ شبِ فراق خود ہو گا چاک پردۂ رازِ شبِ فراق
احباب انتظارِ نمودِ سحر کریں

ممکن نہیں کہ اُن کے تغافل پہ ہو اثر انجامِ اطلاع سے واقف ہیں چارہ گر
پھر کیوں ہمارے حال کی اُنکو خبر کریں

زندہ رہیں تو جینے میں آتا نہیں مزا مر جائیں تیرے غم میں، تو چرچے ہوں جا بجا
ہو داستاں طویل اگر مختصر کریں

پھر خلوتِ جمال میں جلوے سنور چکے فرسودہ طور ہو چکا، موسیٰ گذر چکے
شاید وہ اب مجھی کو خرابِ نظر کریں

پردے تمام اُٹھ گئے تا حدِّ جلوہ گاہ اُس مرکزِ جمال پر اب ہے مری نگاہ

جلوے بھی دیکھ لیں تو طوافِ نظر کریں

تم نے تو دل حجاب سے محفوظ کر لیا تم نے تو اپنے حسن کو محفوظ کر لیا
ہم کس کے ساتھ عمرِ محبت بسر کریں؟

نقص و کمال پیشِ نظر خود ہیں بے حساب سیماب ہم میں عیب و ہنر خود ہیں بے حساب
ہم کیا کسی کے عیب و ہنر پر نظر کریں!

مثلث

عیاں عالم کی حالت ہو رہی ہے نظر صرفِ حقیقت ہو رہی ہے
مجھے دنیا سے نفرت ہو رہی ہے

رہائی کی اجازت ہو رہی ہے بدن سے روح رخصت ہو رہی ہے
مکمل قیدِ غربت ہو رہی ہے

انھیں تو اب بھی دلجوئی ہے منظور میں خود ترکِ تعلق پر ہوں مجبور
کچھ ایسی ہی طبیعت ہو رہی ہے

نہ کیوں لذت کشِ مستی بنوں میں سرِ محفل نہ کیوں کھل کر پیوں میں
اُن آنکھوں سے عنایت ہو رہی ہے

بتوں کی سازشیں اللہ اکبر خدا سے مل گیا ہے حسن کافر
خدائی پر حکومت ہو رہی ہے

الٰہی ہم کو وحدت آشنا کر سکونِ نظمِ وحدت پھر عطا کر
کہ برہم بزمِ کثرت ہو رہی ہے

بصارت قوتِ جلوہ سے معدوم تجلّی کا مذاقِ جبر معلوم،
نظر مجبورِ حیرت ہو رہی ہے

ہیں کتنے بے محل تیرے مواعظ یہ بے ربطی یہ نقصِ وعظ و واعظ!
جوانی میں نصیحت ہو رہی ہے

کہیں ملتا کوئی تاریک جنگل، نہیں تنہائیِ زنداں مکمّل
مجھے سائے سے وحشت ہو رہی ہے

مری نظروں میں نشتر بھر رہے ہو یہ تم ہنس ہنس کے باتیں کر رہے ہو
کہ تقسیمِ جراحت ہو رہی ہے؟

کہاں وہ جوہرِ ذاتی صفت میں ابھی تک محشرِ انسانیت میں
تلاشِ آدمیت ہو رہی ہے

قریبِ کعبہ ابرو خم کی ہیں، لبِ لعلیں پہ نظریں جم گئی ہیں
بڑی رنگیں عبادت ہو رہی ہے

جہاں میں دے دیا دل جس کو چاہا ملا جب دل تو انساں یہ نہ سمجھا
کہ تفویضِ امانت ہو رہی ہے؟

اگر مذہب وہی پہلا ہے سیماب اگر مشرب نہیں بدلا ہے سیماب
تو کیوں تجدیدِ بیعت ہو رہی ہے؟

بادۂ دوشیں

۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۸ء

دوشش دیدم که ملائک در میخانه زدند
(خواجه حافظ)

گِل آدم بسرشتند و به پیمانه زدند

(بیدل)

شعر نایاب از وصال گل و بلبل نه صدا ساز بقا است
از دل ما بیدل دیوار نه در نه

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بادۂ دوشیں

اس انجمن میں جو عزمِ ظہور تو نے کیا
حجابِ خاک کو شایانِ نور تو نے کیا

عجب معاملہ بالائے طور تو نے کیا
شرارہ و سنگ میں چھپ کر ظہور تو نے کیا

جہاں نوازیہ انساں نوازیاں تیری
کہ اس کو قابلِ حور و قصور تو نے کیا

مسلط اس پہ رہیں قوتیں عناصر کی
یہ انتظامِ دلِ نا صبور تو نے کیا

شریکِ حالِ گنہگار رحمتِ تری
ندامتوں پہ کرم بھی ضرور تو نے کیا

بشر سے کیوں ہو گلہ تیری کبریائی کو
بشر کو مائلِ کبر و غرور تو نے کیا

دکھا کے حسن کے پردوں میں اپنے نقشِ نگار
ہلاکِ جلوۂ نور و ظہور تو نے کیا

یہی رہا نگہِ جلوہ دوست کو ارماں
کہ پھر نہ قصدِ تجلّائے طور تو نے کیا

قصور ہی پہ کرم کی اساس ہے سیماب
قصور اگر نہ کیا تو قصور تو نے کیا

اب تو یہ حال ہے نظر سوگوار کا
کیف جمال ہے نہ مزہ انتظار کا

گرتی رہی ہیں چشم تماشا پہ بجلیاں
ہوتا رہا ہے حسن پہ دھوکا شرار کا

کہتے ہیں جسکو زع کا عالم فضا شناس
پچھلا پہر ہے میری شب انتظار کا

اہل خطا پہ چشم کرم ٹوٹ کر گری
جھکنا ستم ہوا نگہ شرمسار کا

اک چشم التفات کہ ہوں تشنۂ وفا
اک پیار کی نگاہ کہ بھوکا ہوں پیار کا

پانی میں ایک جوش ہے مٹی میں اک گداز
بنتا نہیں مزار ترے بیقرار کا

منہ زرد، خون یاس سے پلکیں بھری ہوئی
عالم تو دیکھئے سحر انتظار کا

سیماب کیا سناؤں میں اپنا کسی کو حال
زندہ ہوں اور شکر ہے پروردگار کا

مذاق درد پسندی مرا شعار ہوا
میں بیقرار نہ ہونے سے بے قرار ہوا

گراں سری سے نہ زانو پر اُنکے بار ہوا
سرور مجھ کو بہ اندازۂ خمار ہوا

مری ستم زدگی کی کہیں مثال نہیں
میں ایک ہی تو غم اندوز روزگار رہوا

ہے تیرگی شب غم میں کیسی ویرانی
الٰہی گھر نہ ہوا گوشۂ مزار ہوا

بلا سے اپنی جو ہیں غم گساریاں ارزاں
کوئی جہاں میں ہمارا بھی غمگسار رہوا

بجھا تو داغ جگر بن گیا گل تربت
بھڑک اُٹھا تو چراغ سر مزار رہوا

حسد سے مجھ کو بچایا خدا نے اے **سیماب**
خوشا نصیب کہ محسود روزگار رہوا

معجزہ حسنِ تخیل کا نمایاں ہوگیا
جب تصور بڑھ گیا تصویرِ جاناں ہوگیا

دل تو وحشی تھا اسیرِ زلفِ جاناں ہوگیا
اے دماغِ آرزو تو کیوں پریشاں ہوگیا

جلوۂ پنہاں نے رازِ عشق افشا کردیا
تیرا چھپنا میری رسوائی کا ساماں ہوگیا

شرم رکھ لی شامِ فرقت میری ضبطِ شوق کی
ہائے وہ آنسو جو سوزِ دل کا درماں ہوگیا!

شامِ غم آیا بہت بن بن کے خوابِ آرزو
اور آنکھوں میں سماتے ہی پریشاں ہوگیا؟

میں تو اپنی حسرتِ ناکام کا ممنون ہوں
زندگی مشکل سہی مرنا تو آساں ہوگیا

آبروئے عشق اُس آنسو کی وسعت پر نثار
جو مری آنکھوں سے نکلا اور طوفاں ہوگیا

ہم خطِ تقدیر میں لکھوا کے اُن سے لائے تھے
ایک لفظِ آرزو وہ بھی پریشاں ہوگیا

ایک لفظِ "حسن" میں **سیمابؔ** اتنی وسعتیں!
سینکڑوں افسانہ ہائے دل کا عنواں ہوگیا

جنت جو ملے لاکر میخانے میں رکھ دینا
کوثر مرے چھوٹے سے پیمانے میں رکھ دینا

میّت نہ مری جاکر ویرانے میں رکھ دینا
پیمانوں میں دفنا کر میخانے میں رکھ دینا

وہ جس سے سمجھ جائے روداد مرے غم کی
ایسا بھی کوئی ٹکڑا افسانے میں رکھ دینا

سجدوں پہ نہ دیں مجھ کو اربابِ حرم طعنے
کہیے کا کوئی پتھر بتخانے میں رکھ دینا

سیمابؔ یہ فطرت کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے
خاموش سی اک بجلی پروانے میں رکھ دینا

غم میں اُلجھا کر طریقِ عشق مشکل کردیا
مختصر سی راہ کو قسمت نے منزل کردیا

باعثِ ہنگامہ و گرمیِ محفل کر دیا
کس قیامت کو خدائے عشق نے دل کر دیا

جس جگہ تھے رُک گئے دیوانگانِ راہِ عشق
قیس کا اعلان کیوں منزل بمنزل کر دیا

عشق ہے اک انقلاب دہر مجبورِ زوال
اک حقیقت تھی اُسے بھی تو نے باطل کر دیا

حسبِ مرضی بیٹھنے اُٹھنے کی آزادی رہی
بیخودی نے بے نیازِ نظمِ محفل کر دیا

واہ رے صورت گرِ فطرت یہ تیرا انتظام
ہر ڈالا جب مجھے جینے کے قابل کر دیا

سو گئے سیمابؔ اہلِ بزم شمعیں بجھ گئیں
ہم نے آخر مختصر افسانۂ دل کر دیا

خاک سے پا کے نمو، خاک میں پنہاں ہونا
سچ تو یہ ہے کہ عجب کھیل ہے انساں ہونا

پہلے خود جلوہ فروزِ دلِ انساں ہونا
پھر اُسی کی نگہِ شوق سے پنہاں ہونا

اس مصیبت کا نہ ہی کوئی مداوا نہ علاج
کیا بُرا روگ ہے دل دیکے پریشاں ہونا

اک قیامت تھا مرے عالمِ غربت کے لئے
رنگِ حسرت کا شفق بن کے نمایاں ہونا

گردِ صحرائے مصیبت کا خدا حافظ ہے
چاہتی ہے یہ لباسِ تنِ عریاں ہونا

ورقِ گل ہو کہ ہو آئینہ زارِ شبنم،
اُنھیں ہر رنگ سے آتا ہی نمایاں ہونا

کھولیں عبرتِ انجام نے آنکھیں سیمابؔ
میں سمجھتا تھا بڑی چیز ہے انساں ہونا

بیٹھ کر بزم میں مسرور مرا دل نہ ہوا
جس سے محفل تھی وہی رونقِ محفل نہ ہوا

سببِ تلخیٔ احباب مرا دل نہ ہوا
سرگراں ہو کے بھی بارِ سرِ محفل نہ ہوا

ہاں غلط قصۂ اُلفت۔ مگر افسوس یہ ہے — تیرے پہلو میں مرا دردِ بھرا دل نہ ہوا
بحرِ امید میں وہ تختۂ سوزاں تھا میں — جل بجھا اور چراغِ سرِ ساحل نہ ہوا
اور تنہائی میں ہم اس کے سوا کیا کرتے — روئے دل تھام کے جب صبر مشکل نہ ہوا
چٹکیاں بزم میں کلیوں نے بہت لیں کھل کر — تبسّم مگر افسردۂ محفل نہ ہوا

آگ سی سینے میں ہر وقت لگی ہے سیمابؔ
کوئی شعلہ ہوا پہلو میں مرے، دل نہ ہوا!

مرا دل ہے ترے جلووں کی خلوت میں نہ سمجھا تھا
حقیقت یہ ہے، خود اپنی حقیقت میں نہ سمجھا تھا
تجھے سجدہ کیا تھا میں نے اک دن جوشِ اُلفت میں
یہ ہی ہو جائے گا جزوِ عبادت میں نہ سمجھا تھا
نظر وا ماندۂ کنہِ حقیقت ہو گئی آخر
نہ آئے گا سمجھ میں رازِ فطرت میں نہ سمجھا تھا
گھٹائیں ہیں تو میری ہیں، ہوائیں ہیں تو میری ہیں
تجھے دلچسپ اتنا شامِ غربت میں نہ سمجھا تھا
دلِ آگاہ اے سیمابؔ طورِ معرفت نکلا،
سمجھنے کی طرح اس کی حقیقت میں نہ سمجھا تھا

شوقِ جمالِ دوست جو حد سے سوا دیا — آئینہ کیوں نہ مجھ کو خدا نے بنا دیا

تفصیل یہ ہے میری حیات اور موت کی — مٹی کا ایک نقش بنایا مٹا دیا
آیا مری سمجھ میں آلِ کلیم و طور — جب سر چڑھا لیا تو نظر سے گرا دیا
دل ہی نہیں تو حسرتِ عیش جہاں فضول — دل کو مٹا دیا تو جہاں کو مٹا دیا
اب تک گلہ ہے طور کو برقِ جمال سے — اے دشمنِ کلیم مجھے کیوں جلا دیا!
اک نعمتِ عجیب ہے یہ منصبِ وفا — انسان کو ملا تو فرشتہ بنا دیا

سیمابؔ میری خاک بنی جامِ زرنگار
مٹی کو عشق نے اثرِ کیمیا دیا

لازم آیا انھیں پابندِ حیا ہو جانا — ہائے رسوا مری بیتابیوں کا ہو جانا
ازلی دردِ محبت کا پتہ دیتا ہے — خود بخود دل کا مرے نالہ سرا ہو جانا
اس نے پائی سندِ عشق ہوا جسکو نصیب — تمہیں دل دے کے گنہگارِ وفا ہو جانا
موت سے کم نہیں اک خوگرِ الفت کیلئے — دل سے اسبابِ تمنا کا فنا ہو جانا
جان دینے پہ جسے فخر ہے اُس سے کہدو — کچھ نہ ہونا ہے محبت میں فنا ہو جانا
صبر کر اے دلِ بیکس جو ہوا تو برباد — ابھی قسمت میں ہے کیا جانئے کیا ہو جانا!

اُس کی قسمت پہ نہ کیوں ہو نئے محبت سیمابؔ
جس کی قسمت میں ہو محرومِ وفا ہو جانا

شرارہ میری آہِ آتشیں کا — ستارہ بن گیا چرخِ بریں کا
گیا جھگڑا وہ جیب و آستیں کا — بھلا ہو وحشتِ خاطر نشیں کا

اُنھیں غم کی نوازش سے ہے انکار — خدا حافظ دلِ اندوہ گیں کا
لحد کو چاندنی سے کیا تعلق! — کرشمہ ہی مرے داغِ جبیں کا

جنونِ جستجو ہے مجھ کو سیمابؔ
اُلٹ دوں گا ہر اک ذرّہ زمیں کا

تھے مجھ میں ترے جلوے۔ ایسا بھی ہوا ہوتا — تُو جلوہ نگر ہوتا۔ میں جلوہ نما ہوتا
یہ جبر انوکھا ہے قانونِ محبت کا — جینا جو نہ تھا جائز، مرنا تو روا ہوتا
جان اپنی اگر دے کر اس کو نہ بچاتا میں — ظاہر ہے جو انجامِ ناموسِ وفا ہوتا
تسکینِ محبت کے یہ دو ہی طریقے تھے — یا تم نہ بنے ہوتے یا دل نہ بنا ہوتا
ملتی نہ زباں مجھ کو، ملتا نہ بیاں مجھ کو — پھر بھی مرے ہونٹوں پر پیغامِ وفا ہوتا
یہ عشق کی بربادی اور میرا ترا استغنا! — اے حسن کبھی تجھ پر یہ وقت پڑا ہوتا

ضائع نہ کبھی ہوتا سیمابؔ جو مٹتا میں
خاکِ رہِ الفت تھا، اکسیرِ وفا ہوتا

کاروانِ غم کا مقصودِ نظر اچھا رہا — مختصر سا، دل سے آنکھوں تک سفر اچھا رہا
جسکو ہوش آیا یہاں، اُس کی خرابی آگئی — اس خرابے میں رہا جو بے خبر اچھا رہا
عمر کاٹی چین سے کنجِ قفس میں بیٹھ کر — میں تو اے بے چارگی بے بال و پر اچھا رہا
صورتِ تصویرِ اک پُتلی میں سو جلوے رہے — آئینے سے، دیدۂ حیرت نگر اچھا رہا
دستِ گلچیں سے بچا سنگِ حوادث سے بچا — میں بھرے گلشن میں بے برگ و ثمر اچھا رہا

رات بھر بیٹھا رہا محفل میں ہم پہلوئے دوست
گو رہا سب کی نگاہوں میں، مگر اچھا رہا

تھی نگاہِ حسن اے سیماب گرمِ امتحاں
یہ تماشا بھی فرازِ طور پر اچھا رہا!

تجھے ہم نے جو اپنا دوست اے بیداد گر جانا
تو کیا جانِ وفا شیوہ کا دشمن جان کر جانا؟

وہ تیرا انتظار اور وہ دلِ بے صبر کی وحشت!
ہزاروں بار اُٹھنا اور اُٹھ کر تا بہ در جانا

یہ دنیا صرف اک منزل تھی وہ بھی چھوٹنے والی
جسے ہم نے کسی دھوکے سے اپنا مستقر جانا

میں جامِ مرگ پی کر بن گیا میخانۂ باقی
مبارک ہو مرے پیمانۂ ہستی کا بھر جانا

مری دانست میں یہ جاننا عینِ حقیقت تھا
کہ میں نے پھول کی ہر پنکھڑی کو نیشتر جانا

ہوا انوس کیوں آئینہ اُن کی بزم کا مجھ سے
مجھے بھی اس نے کیا اپنی طرح حیرت نگر جانا؟

میں ہو کر خاک اے سیماب جزوِ کل ہوا آخر
مرے شیرازۂ ہستی کو راس آیا بکھر جانا

جی بہل جاتا ہے دل کا داغِ حرماں دیکھ کر
اور کیا ہوتا تماشائے گلستاں دیکھ کر

وقتِ مرگ احباب گریے پر آتی ہے ہنسی
یعنی روتے ہیں مری مشکل کو آساں دیکھ کر

ہم تجھے دیکھیں نہ دیکھیں تیرے قائل ہیں ضرور
اور ہیں وہ لوگ جو لاتے ہیں ایماں دیکھ کر

دیں نہ دیں وایاں کی لگاوٹ قیدِ ذہنِ عشق نے
اُس کو کافر جان کر مجھ کو مسلماں دیکھ کر

طور جل کر ہو گیا سرمہ، ہوئے بے خود کلیم
میری آنکھیں کھل گئیں دیدارِ جاناں دیکھ کر

دل بھر آیا ہم نفس کیا مجھ پہ گزری کچھ نہ پوچھ
آشیاں اپنا بھرے گلشن میں ویراں دیکھ کر

دل کے پر اسرار ہونے کا معمہ کھل گیا
بوئے گل کو پھول کے تو نہیں پنہاں دیکھ کر

حسن دہر صبر آزما ہی دل ادھر شوق آشنا
دیکھئے کیا حال ہو دیدار جاناں دیکھ کر

خاطر غمگیں کو ہے سیماب کچھ تسکین سی
کس کو رحم آیا مرا حال پریشاں دیکھ کر!

فصل گل ہے جمع ہیں گلشن میں سامان بہار
تو بھی کر تکلیف اے روح چمن، جان بہار!

اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں اٹھکر گل فروش
چار دن کے بعد لٹجاتی ہو دکان بہار

فرش گل پر بیٹھ کر گلبازیاں کرلے کوئی
آج اتنے پھول برسیں ابر بار ان بہار

سبز سطروں میں لکھی جاتی ہے نظم گلستاں
سب سے پہلا پھول بنجاتا ہے عنوان بہار

ہے بہار دائمی فیض گلستان خلیل
میں انھیں معنوں میں ہوں سیماب مہمان بہار

نہ رکھنا پاؤں بھولے سے کہیں گور غریباں میں
نکل آئے نہ کوئی ہاتھ پابوسی کے ارماں میں

یہ کس کافر نے لیں انگڑائیاں صحن گلستاں میں
قیامت چھپتی پھرتی ہو گلوں کی چاک داماں میں

جفاؤں کی ندامت بھی وفاؤں سے خجالت بھی
سبھی کچھ ہو تری نظروں کے انداز پشیماں میں

نہ تم آئے، نہ خط بھیجا، اٹھے جھولے گیا ساون
کوئی جھولا کرے کبتک تمہاری عہد و پیماں میں

نئی تحقیق ہے وہ جلوہ فرمائے کلیسا ہے
اضافی ہونیوالے ہیں مذاق چشم حیراں میں

ہوئی محسوس صبح حشر یہ تعبیر دنیا کی
کہ ہم اک رات جاگے تھے کسی کی چشم پیشاں میں

یہ اچٹی اچٹی نظریں اور بھی بے چین کرتی ہیں
وہ نشتر چاہئے جو جذب ہو جائے رگ جاں میں

تمہارے پاؤں پڑنیکے لئے بیچین ہیں روحیں تمہارا پاؤں پڑتا ہی نہیں گورِ غریباں میں!

کوئی سیماب سا دیوانہ شاعر تم نے دیکھا ہے
مذاقِ درد سے خالی نہیں اک شعر دیواں میں

کلیم وادیٔ جاں ہوں خلیلِ کعبۂ دل ہوں — غرض مجھ کو جہاں دیکھو وہیں ہیں رنگِ محفل ہوں
بہ شکلِ ماہ آوارہ جو یوں منزل بہ منزل ہوں — میں اس ظلمت سرائے دہر میں سرگشتۂ دل ہوں
مجھے عرفان کیونکر ہو کسی کا بزمِ ہستی میں — میں خود بیگانہ ہوں نا آشنائے رنگِ محفل ہوں
تری پہچان آساں ہے اگر پہچان ہو اپنی — مصیبت تو یہ ہے اپنے لئے میں آپ مشکل ہوں
کہیں رکھتا ہوں اور پڑتا کہیں ہی پاؤں وحشت میں — مرا نقشِ قدم شاہد ہے میں گم کردہ منزل ہوں
نکال اے جوشِ وحشت قبر سے نخلِ بہار آئی — کہیں میں ایک گوشے میں پڑی رہنے کی قابل ہوں؟

مرے نغمیں فسانے کارنامے ہیں محبت کے
وفائے دل کی اے سیماب اک تاریخ کا ل ہوں

جتنے ستم کئے تھے کسی نے عتاب میں — وہ بھی ملائے کرم بے حساب میں
لاؤں کہاں سے جامِ شراب و کنارِ نہر — کیوں چھیڑتی ہیں سرد ہوائیں شباب میں
ہمسے نہ پرعنا رہو اے خاکِ کوئے دوست — پلکوں سے صاف کی ہیں رہیں شباب میں
تقدیر ہی کسی کی بناتا خدا مجھے — آتا میں جا لگنے کو تری بزم خواب میں
امید تیری خاک پہ بارش ہو نور کی — تھی تجھ سے چاندنی مری شامِ شباب میں
آ۔ اے گلِ فسردہ کہیں داد خواہ ہوں — تو بھی تو میری طرح لٹا ہے شباب میں

اٹھا ہے ابر میکدہ دستِ دعا کے ساتھ — اتنی برس پڑے کہ نہا لوں شراب میں
ہر چیز پر بہار، ہر اک شے پہ حُسن تھا — دُنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں

سیمابؔ خاک بھی نہ ملا لطفِ زندگی
مٹی ہوئی خراب جہانِ خراب میں

حشر میں آہ و اثر کے درمیاں کوئی نہیں — آج تو حدِ نظر تک آسماں کوئی نہیں
جو کہے اِس سے کہے جو کچھ سنے اِس سے سُنے — آدمی کا دل سے بہتر رازداں کوئی نہیں
میری میٹھی نیند کے دشمن تھے کل تک سینکڑوں — اب لحد میں مانعِ خوابِ گراں کوئی نہیں
کہنے سُننے سے نکل جاتا ہے کچھ دل کا بخار — ہائے وہ کم بخت جس کا رازداں کوئی نہیں!
جب نہیں کوئی تو پھر کس نے یہ دی دل سے صدا؟ — تم کہے واز دیتے ہو یہاں کوئی نہیں؟
کامیابی کی کوئی تدبیر جب کرتا ہوں میں — یہ سمجھ لیتا ہوں سر پر آسماں کوئی نہیں

عالمِ ہُو سے بھی ہے سیمابؔ یہ عالم نیا
اب تصوّر میں جہاں ہم ہیں وہاں کوئی نہیں

بڑی مشکل سے کچھ تسکین کے پہلو نکلتے ہیں — جگر پھٹتا ہے جب آنکھوں سے دو آنسو نکلتے ہیں
ہماری بے کسی یارانِ گلشن دیکھتے رہنا — کہ ہم کنجِ قفس سے بے پر و بازو نکلتے ہیں
کبھی وہ دن بھی تھے گریہ ہمارا خندۂ گل تھا — مگر اب تو ہنسی کے نام سے آنسو نکلتے ہیں
تری محفل میں اپنی آمد و شد کا یہ عالم ہے — بشکلِ رنگ آتے ہیں، بہ رنگِ بُو نکلتے ہیں

چھپائے سے کہیں سیمابؔ رازِ عشق چھپتا ہے؟

نہیں ہے دردِ پہلو میں تو کیوں آنسو نکلتے ہیں!

کوئی چمن نہیں ایسا جہاں بہار نہیں
مگر بہار مرے دل کو سازگار نہیں

ہوا ہوں فرطِ محبت سے بدگماں ایسا
مجھے اب اپنی نظر پر بھی اعتبار نہیں

~~تمہارے کوچے میں ہر ذرّہ ایک مدفن ہے~~
~~وہاں بھی پھول چڑھا دو جہاں مزار نہیں~~

وہ پوچھتے ہیں قیامت میں سب سے گھبرا کر
یہاں تو کوئی ہمارا امیدوار نہیں؟

ہو ناگوار جسے زندگی وہ مر جائے
وہ کیا کرے جسے مرنا بھی خوشگوار نہیں

شبِ فراق کرے کون میری غمخواری
میں بیقرار ہوں دنیا تو بے قرار نہیں!

میں حشر میں تری رحمت کو فیصلے پہ نثار
گناہگار ہوں پھر بھی گناہگار نہیں

زمیں مزار کے قابل کہاں تلاش کروں
میں خود ہی بعدِ فنا قابلِ مزار نہیں

ہر ایک چیز کو ہے کچھ نہ کچھ سکوں سیمابؔ
قرار مند مری جانِ بے قرار نہیں

مجھے رسوائیاں کیوں قبر سے لے آئیں محشر میں
سکوں سب سے بڑی راحت تھی اُس ناز آفریں در میں

شبِ غم شام سے دھوکے ہی دھوکے ہیں مقدر میں
طلوعِ صبح سے پہلے اُجالا ہے مرے گھر میں

فسون و فتنہ، دو چیزیں ہیں چشمِ شعبدہ گر میں
جو تم چاہو تو دنیا کچھ سے کچھ ہو جائے دم بھر میں

تبسم میں کشش، آنکھوں میں بجلی، تیر تیور میں
معاذ اللہ، کیا کیا تو نہیں ہے حسن کافر میں

ہوئی ہیں ختم لاکھوں ہجر کی راتیں قیامت پر
مشیّت ہے ابھی تک انتظامِ صبحِ محشر میں

مری فطرت وفا، اور واسطہ حسنِ جفا خو سے
غلط بھی لکھ دیا کچھ لکھنے والے نے مقدر میں

وہی میں بھی ہوں جو تم ہو، مگر اک فرق ہے پھر بھی
میں وہ قطرہ ہوں جو مل کر نمایاں ہو سمندر میں

وصالِ دوست اور میں، اتفاقاتِ محبت ہیں
یہ ہے وہ چیز جو شاید نہ تھی میرے مقدر میں

عبودیت بقدرِ ذوق، شایانِ نوازش ہے
خلوصِ دل سے اک سجدہ بہت ہے زندگی بھر میں

تو کیا سمجھے گا اے بت سازیہ پردے کی باتیں ہیں
ترا شاہد جس کو تھی پہلے سے وہ تصویر پتھر میں

بڑی گہری نظر سے سیر کی ہے بزمِ فطرت کی
بہت کھویا رہا ہوں چاندنی راتوں کے منظر میں

بنا لو آستانِ ناز اپنا ذرّے ذرّے کو
ابھی لا انتہا محفوظ ہیں سجدے مرے سر میں

تصور کی کرشمہ سازیاں **سیماب** لاحاصل
پڑے گی جان کیا تصویر کے خاموش پیکر میں

دل کہاں جب دل میں حسرت ہی نہیں
اب تو کچھ دل کی حقیقت ہی نہیں

تیری آنکھیں دیکھنے کی چیز ہیں
مست بھی ہیں خوبصورت ہی نہیں

زندگی کی مشکلیں معلوم ہیں
مجھ کو مرنے کی تو فرصت ہی نہیں

صبر و تسکیں کا مجھے طعنہ نہ دے
درد والوں کی یہ فطرت ہی نہیں

انتہائے یاس کا ممنون ہوں
اب مجھے کوئی شکایت ہی نہیں

شوق کو گنجائشیں درکار ہیں
تنگنائے دل میں وسعت ہی نہیں

دل میں اے **سیماب** سوہانِ حیات
اور بھی کچھ ہے محبت ہی نہیں

کیا سعیٔ عشق، عشق کے قابل تو کوئی ہو
دلبر بہت ہیں، نازکشِ دل تو کوئی ہو

آئیں نظر ہزار طرح کی تجلّیاں، مصروفِ سیر جلوہ گہہ دل تو کوئی ہو
گونجیں صدائے درد سے دنیا کی محفلیں شامِ فراق زخمہ زنِ دل تو کوئی ہو
رسوا کن تخیّلِ مجنوں ہزار ہیں پردہ کشائے لیلیٰ محمل تو کوئی ہو
میرا کوئی انیس نہیں تو نہیں سہی یارب شریکِ بیکسیٔ دل تو کوئی ہو
آتی نہیں پھر آج مرے کارواں کو نیند ہاں قصّہ خواں فسانۂ منزل تو کوئی ہو

ضبطِ دل و نظر کا ابھی سے سوال کیا
سیمابؔ پہلے رونقِ محفل تو کوئی ہو

اہلِ دل سے نام کا پردہ ہی یا پردے میں ہو کیوں نہیں دیتے جواب صاف کیا پردے میں ہو؟
یہ تصوّر کا کرم ہے، یہ تجلّی کا ستم ہم نہ ہوں لیکن نگاہِ آشنا پردے میں ہو
فائدہ شرمِ حضوری سے اُٹھاتے ہیں گناہ پھر وہ بندہ کیا کرے جسکا خدا پردے میں ہو؟
ہاں فریبِ پردہ سے ہشیار اے اہلِ نظر پردہ پردہ ہی تو ہے، کیا جانے کیا پردے میں ہو
رسمِ پردہ بھی محبت میں انوکھا جبر ہے ہائے وہ مجبور، جس کا مدعا پردے میں ہو
لطف تو جب ہے کہ ہو تجھ کو تمنا دید کی اور تیری طرح کوئی دوسرا پردے میں ہو
آرزو کا وہ اثر بھی دیکھنے کی چیز ہے جس اثر سے کوئی گھبرایا ہوا پردے میں ہو
تجھ کو در پردہ سمجھ کر ہو رہا ہوں بے قرار کیا تماشا ہو جو کوئی دوسرا پردے میں ہو

ہم کو پردہ تھام کر فریاد کرنے سے غرض
کوئی پردے میں نہ ہو سیمابؔ یا پردے میں ہو

وہ کن لفظوں میں صرفِ التجا ہو
جو خود نا آشنائے مدعا ہو

اسیرِ عقدۂ ہستی وہ کیا ہو
کہ جس کا ہر نفس تفسیرِ "لا" ہو

اب اُس سے کوئی کیا عہدہ برآ ہو
جو دل میں بیٹھ کر دل مانگتا ہو

پڑھیں تاریخ کعبہ دیر والے
یہی بتخانہ کل کیا جانے کیا ہو

سبکدوشِ نظامِ آشیاں ہیں
الٰہی برق و باراں کا بھلا ہو

وہ کیوں آئے فریبِ ابتدا میں
جسے معلوم اپنی انتہا ہو

لبِ رنگین و چشمِ کیف انگیز
اسی عنوان سے تم میکدا ہو

وہیں بزمِ عزائے دل ہو قائم
جہاں خاکسترِ اہلِ وفا ہو

یہ شور ہُو، یہ جوشِ نالہ **سیماب**،
ابھی رگ کوئی کھل جائے تو کیا ہو؟

دل کو اُس کی یاد سے آباد رکھ
بھولنا اچھا نہیں ہے یاد رکھ

جبتک اُس در تک نہ پہونچوں اے فلک
میری مٹی کو یونہی برباد رکھ

ابرِ نو، ایجاد کر اے چشمِ نم
آبروئے گلشنِ ایجاد رکھ

ایک دن یہ عرش بھی ہو جائیگا
پہلے دل میں عشق کی بنیاد رکھ

حشر میں کہنا پڑے گا اے شباب
اپنی ناکامی کا قصہ یاد رکھ

دل ہے اک ویرانۂ ظلمت نصیب
اپنے جلووں سے اسے آباد رکھ

ہے یہی **سیماب** آزادی بڑی

اپنے ذہن و فکر کو آزاد رکھ

ڈھونڈ اے فطرت کسی کو دلربائی کے لئے
دل ترستا ہے مذاقِ آشنائی کے لئے

حسن اب تک ڈھونڈتا ہی مصر کے بازار میں
دامنِ یوسفؑ لباسِ پارسائی کے لئے

کیا دلِ موسیٰ تجلی کے لئے کافی نہ تھا
طور پر کیوں آئے تم جلوہ نمائی کے لئے ؟

بھیک کے ٹکڑوں نہیں شاید دل کے ٹکڑے ہوں نصیب
روز اُن کے در پہ جاتا ہوں گدائی کے لئے

مشکلوں سے میری قسمت کو ملی تھی تیرگی
وہ بھی حصہ ہو گئی شامِ جدائی کے لئے !

گوشۂ تربت میں کچھ ٹکڑے دلِ مجروح کے
رکھ لئے ہیں تیری جورِ انتہائی کے لئے

حسن بیجا اور اے سیمابؔ اک محدود دل
ظرفِ دریا کاش ملتا آشنائی کے لئے

پیارہ الفت میں تدبیر نظر آئی
تدبیر سے کچھ آگے تقدیر نظر آئی

وحشت کی بہاروں میں تاثیر نظر آئی
پھولوں کی جو رگ ابھری زنجیر نظر آئی

ہنس ہنس کے کئے سجدے رو رو کے لئے بوسے
دیوانوں کو جب اپنی زنجیر نظر آئی

پروانوں کا طوفانِ جلوہ طلبی توبہ!
ہر شمع پریشانِ تنویر نظر آئی

ہر سلسلۂ وحشت اک ربطِ مسلسل تھا
زنجیر سے پیوستہ زنجیر نظر آئی

جب اپنے تصور کو معدوم کیا میں نے
ہر آئینے میں تیری تصویر نظر آئی

سیمابؔ زہے مستی! میخوارِ حقیقت کو
خاکِ درِ میخانہ اکسیر نظر آئی

یہ تصور کوششیں ہیں خاطرِ دلگیر کی
منھ سے بول اٹھی ہے خاموشی تری تصویر کی

میری آوارہ نصیبی حسنِ وحشت ہو گئی
آبروئے عشق تھیں رسوائیاں تقدیر کی

گو جگر پر داغ ہے گو دل میں لاکھوں زخم ہیں
پھر بھی ہے سینے میں گنجائش تمہارے تیر کی

ترجمانِ صد سکوں تھا تیرا اندازِ سکوں
جانے کیا کچھ کہہ گئیں خاموشیاں تصویر کی

دل کے ٹکڑے لئے بیٹھی ہے حسرت گو دیں
آج بزمِ درد میں دعوت ہے کس کے تیر کی؟

کیا قیامت تھی ترے حسنِ تبسم کی ادا
مسکرا کر رہ گئی افسردگی تقدیر کی

سب یہ تیرے عکس ہیں دنیا میں ہیں جتنے حسیں
جتنی تصویریں ہیں نقلیں ہیں تری تصویر کی

ضبط کے پردے پڑے ہیں اور خلش ہے پاسباں
دل کا ہر ٹکڑا ہے خلوت گاہ تیرے تیر کی

اے جنونِ وحشت نصیبی سے میں اپنی تنگ ہوں
دھجیاں اب کے اڑا دے دامنِ تقدیر کی

اڑ گئی کاغذ سے میرے دلبری چسپاں ہو گئی
دیکھنے کی چیز ہیں دلچسپیاں تصویر کی

اکبر آبادی ہوں اے سیمابؔ میرے شعر میں
رنگ غالبؔ کا ہے شوخی ہے زبانِ میرؔ کی

رہی بالانشیں افتادِ میری
فلک پرواز ہے فریادِ میری

وفا انجام ہے مرگِ محبت
اُنہیں کرنی پڑے گی یادِ میری

فریبِ عشرتِ فردوس معلوم
نہ بہلی خاطرِ ناشادِ میری

کچھ اتنا مختصر تھا حشر کا دن
کہ باقی رہ گئی روداد میری

نویدِ امن و فرصت آندھیوں کو
کہ مٹی ہو چکی برباد میری

قفس میں ہوں مگر کرتی ہے کیا شہ طوافِ آشیاں فریاد میری
یہ دو تھیں حشر میں سننے کی باتیں فسانہ آپ کا روداد میری
جنوں کے جوش میں نکلی جو سیماب
تماشا بن گئی فریاد میری

وفا کی میں نے بنیاد آج زیرِ آسماں رکھ دی
جہاں تھا سنگِ در تیرا جبیں اپنی وہاں رکھ دی
یہ کس نے شاخِ گل لا کر قریبِ آشیاں رکھ دی
کہ میں نے شوقِ گل بوسی میں کانٹوں پر زباں رکھ دی
خدائی کی خوشی اپنی خوشی پر چھوڑ دی اس نے
مراد کر آگیا تو میری قسمت درمیاں رکھ دی
سنا تھا قصہ خواں کوئی نیا قصہ سنائے گا
ہمارے منہ پہ ظالم نے ہماری داستاں رکھ دی
خدا کے سامنے بھی چل گئے ہم چال محشر میں
بجائے نامۂ اعمال دل کی داستاں رکھ دی
خلوصِ دل سے سجدہ ہو تو اس سجدے کا کیا کہنا
وہیں کعبہ سرک آیا جبیں ہم نے جہاں رکھ دی
اٹھایا میں نے شامِ ہجر لطفِ گفتگو کیا کیا

تصور نے تری تصویر کے منہ میں زباں رکھ دی
بگولے لے گئے تھے وحشی مرحوم غربت کو
انھیں سے پوچھ لو میت کہاں پھینکی کہاں رکھ دی
شکستہ پائی کا سیمابؔ درماں اور کیا کرتے
پڑے چھالے تو اُن پر گردِ راہِ کارواں رکھ دی

اب کیا بتائیں عمرِ وفا کیوں خراب کی — نوحہ ہے زندگی کا کہانی شباب کی
تم نے خبر نہ لی مرے حالِ خراب کی — کالی ہوئیں فراق میں راتیں شباب کی
تھی الوداعِ ہوش تجلی مختصر — میرا تو کام کر گئی جنبش نقاب کی
وہ میرے ساتھ ساتھ مجسم ترا خیال! — وہ جنگلوں میں سیرِ شبِ ماہتاب کی!
ممنون ہوں تری نگہِ بے نیاز کا — رسوائیاں تو ہیں مرے حالِ خراب کی
میں اپنی جلوہ گاہِ تصور سجاؤں گا — تصویر کھینچ دے کوئی اُن کے شباب کی
دیدہ و غبارِ دل میں ذرا سی جگہ ہمیں — تربت بنائیں گے دل خانہ خراب کی
گھبرا کے جس سے چیخ اُٹھا عالمِ وجود — وہ چیز دل نے میرے لئے انتخاب کی
چمکیں تو خوفناک، گریں تو حیات سوز — ساون کی بجلیاں ہیں نگاہیں عتاب کی
سیمابؔ زندگی کی ہے تاریخ ہر غزل
ہر شعر میں ہے ایک کہانی شباب کی

نوائے دردِ شامِ غم نہ کیوں اندوہ گیں ہوتی — یہ ہے وہ نغمہ خاموش جس میں لَے نہیں ہوتی

تغافل سے وہاں دل کی پذیرائی نہیں ہوتی
یہاں یہ آرزو تربت بھی ہوتی تو نہیں ہوتی

وفا سے تکو مطلب کیا، یہ دیوانوں کا حصہ ہے
خدا حسنِ وفا دیتا تو صورت کیوں حسیں ہوتی

گواہی خون کے دھبّوں سے محشر میں نہ دلوائی
خدا کے سامنے کیا ہاتھ بھر کی آستیں ہوتی

اگر اے حسن فطرت میں تری ہوتی وفا کیشی
تو دشتِ نجد میں مجنوں کی لیلیٰ جانشیں ہوتی

نہ ہو جاتی جو دامن گیر وحشت موسمِ گل میں
تو کیا اس طرح دو ہاتھوں میں آدھی آستیں ہوتی!

ہم اے سیمابؔ مٹ کر بھی رہے عنوانِ میخانہ
یہ وہ مٹی نہ تھی جو گھل کے پیمانہ نشیں ہوتی

کششِ دل انھیں چلمن میں تو لے آئی ہے
آگے اب حوصلۂ چشمِ تماشائی ہے

عرصۂ حشر میں اندیشۂ رسوائی ہے
جستجو تیری بڑی بھیڑ میں لے آئی ہے

نگہِ ناز سے ناسور ہوا ہے پیدا
آنکھ کی چوٹ کلیجے پہ ابھر آئی ہے

میری اُمید تجھے گلشنِ جنت ہو نصیب!
تو جوانی میں بہت کچھ مرے کام آئی ہے

دیکھئے خلد میں سیمابؔ کی راحت طلبی
زانوئے حور پہ کیا چین سے نیند آئی ہے

وہ دن آئے کہ حیرانِ رخِ رعنا کرے کوئی
وہ آئینہ بنوں میں بھی کہ منہ دیکھا کرے کوئی!

نیازِ عشق میں نازش اگر پیدا کرے کوئی
وہیں سو عرش پیدا ہوں جہاں سجدا کرے کوئی

ہوا کرتی ہے ہر منظر میں ناظر کی رعنائی
جسے دیکھا کرے کوئی اُسے دیکھا کرے کوئی

پیامِ خواب اجل مجھ کو نہ دی آغوشِ مدفن میں
پھر اُٹھنا ہے، ذرا سی دیر سو کر کیا کرے کوئی

مذاقِ آرزومندی بھی اک نعمت ہے دنیا میں
اگر دل ہو تو دل میں آرزو پیدا کرے کوئی

تصور میں بھی جن کی ضوفشانی ہو نہیں سکتی
وہ جلوے کیا بہ امکانِ نظر پیدا کرے کوئی

نہ موسیٰ ہیں، نہ کوہِ طور کی وہ شعلہ سامانی
یہ عالم ہے تو پھر عزمِ تجلّی کیا کرے کوئی

وبالِ زیست آخر اور بھی دنیا کو جھگڑے ہیں
سبکسر ہو کے اے بارِ محبت کیا کرے کوئی

چھپالے قطرہ ہائے خونِ منصور اے زمیں جلدی
کہیں ایسا نہ ہو راز اَنا افشا کرے کوئی

ضعیفی میں مرا یادِ جوانی سے یہ مقصد ہے
کہ اس بھولے ہوئے قصّے میں یاد آیا کرے کوئی

دلِ بیتاب گھبرا کر جو پہلو سے نکل آیا
خیالِ یار چلّایا مرا پردا کرے کوئی

ہمیں تو مار ڈالا کثرتِ حسنِ تصوّر نے
اِدھر بھی تُو اُدھر بھی تُو کدھر سجدا کرے کوئی

جس آئینے میں ہے سیماب اتنی جستجو اُس کی،
اُس آئینے میں اپنی شکل بھی دیکھا کرے کوئی

کب تک دلِ مایوس کو برباد کرینگے
اب ہم تری امید سے فریاد کرینگے

کیسے یہ ہی موقوف نہیں ضد ہی بتوں کو
جس گھر میں رہیں گے اُسے برباد کرینگے

یکسوئی سے بیٹھیں گے تو اے خلوتِ جاناں
تدبیرِ سکونِ دلِ ناشاد کرینگے

فریاد کی محشر میں نہ رکھ ہم سے تو امید
جلوے ترے لوٹیں گے کہ فریاد کرینگے

سیماب مری قدر کریں یا نہ کریں آج
مرنے پہ ضرور اہلِ وطن یاد کرینگے

محبت میں خودی، حدِ جہانِ بے خودی ہوگی
وہ عالم دوسرا ہوگا، وہ دنیا دوسری ہوگی

بڑی دلچسپیوں سے صبحِ شامِ زندگی ہوگی
میں دیکھوں گا انھیں اور ساری دنیا دیکھتی ہوگی

فضائے دل میں نشتر ہے تڑپ درد تمنا کی
بس اتنی کوندتی ہوگی جو بجلی کوندتی ہوگی

ادا یوں تیرے کوچے میں نمازِ بیخودی ہوگی
کہ اک دنیا کی دنیا تجھ کو سجدے کر رہی ہوگی

نہ مرتا زندگی پر میں اگر پہلے سمجھ لیتا
کہ صبحِ حشر کا عنوان شامِ زندگی ہوگی

کچھ ایسے درد سے فرقت میں مینے ہاتھ اٹھائے ہیں
دعا بھی کامیابی کی دعائیں مانگتی ہوگی

سرِ محشر حجاب و شوق کا اک معرکہ ہوگا
انھیں اپنی پڑی ہوگی مجھے اپنی پڑی ہوگی

مزا آجائے گا کچھ حشر میں سننے سنانے کا
زباں ہوگی ہماری اور کہانی آپ کی ہوگی

شرابِ آرزو پی کر نہ اٹھیں گے قیامت تک
ہمیں جب بیخودی ہوگی تو ایسی بیخودی ہوگی

نہ کرتے حشر کو رسوا کبھی دن کے اجالے میں
خبر کیا تھی تری فرقت کی رات اتنی بڑی ہوگی!

تعجب کیا لگی گر آگ اے سیماب سینے میں
ہزاروں دل میں انگارے بھرے تھے لگ گئی ہوگی

جدھر دیکھو ادھر جنت میں حسنِ جاودانی ہے
آہ کیا یہاں میری بھی گم گشتہ جوانی ہے؟

لحد میں کیا اٹھاؤں سر، خمارِ زندگانی ہے
خمارِ زندگانی ہے کہ اب تک سرگرانی ہے

کہانی کہنے والے، کیوں کر جوانی ہے
جوانی کی کہانی کیا، جوانی خود کہانی ہے

عجب دلچسپ اک نیرنگیِ زندگانی ہے
کسی عالم میں باقی ہے کسی عالم میں فانی ہے

کھچا جائے جہانِ ہمسی کھچ کر بیٹھ جاؤ تم
ہمیں آج اپنے جذبِ دل کی قوت آزمانی ہے

فنا در اصل ہے جذبات کا افسردہ ہو جانا
نہ میرا عشق فانی ہے نہ تیرا حسن فانی ہے

مرا رونا ہی طوفانی، مجھے تم کیوں رُلاتے ہو
سمجھ لینا کہ دل سے آنکھ تک پانی ہی پانی ہے

عجب اک نشّہ ہی کیفِ جوانی جسکو کہتے ہیں
جدھر اب آنکھ اٹھتی ہے جوانی ہی جوانی ہے

حیاتِ نو ہے میرا ہر نفس عہدِ محبت میں
غمِ یک لحظہ بھی مجھ کو نشاطِ جاودانی ہے

تغافل پیشگی آخر مجھے مایوس کیوں کر دے
ابھی تیری حقیقت میں مذاقِ دستانی ہے

پھر آخر تکدی سے آگیا سیماب مسجد میں
وہ ہی پھر سجدہ بازی ہے وہ ہی تسبیح خوانی ہے

واقف نہ ہو کوئی مرے حالِ تباہ سے
چھپنا پڑا ہے خود مجھے اپنی نگاہ سے

برہم کچھ اور بھی وہ ہوئے عذر خواہ سے
عذرِ گناہ ہو گیا بدتر گناہ سے

ساقی نہ کر ملول مجھے، مانگتا ہوں میں
اک جام!۔ وہ بھی تیری نشیلی نگاہ سے

میری فغانِ نیم شبی کیا قبول ہو
رہتی ہے دُور دُور تری خواب گاہ سے

ہوتی ذلیل منزلِ غربت میں میری لاش
لیکن ہوئی نہ پردہ دری گر دراہ سے

محشر میں سب کے سامنے رسوا نہ ہو کوئی،
اے آرزو ابھی نہ ٹپکنا نگاہ سے

کیا ڈھونڈتے ہو مدفنِ برباد گانِ عشق
مٹی کے چند ڈھیر ہیں وہ بھی تباہ سے!

میری نظر سے تم مجھے دیکھو تو لطف ہے
کچھ دیر کو نگاہ بدل لو نگاہ سے

واعظ تعلقاتِ کرم پر مجھے ہے ناز
تو نیکیاں بھی دے تو نہ بدلوں گناہ سے

حد سے گذر گئی ہے تمنا بھری نظر
کوسوں نکل گئی ہے تری جلوہ گاہ سے

کیا جانے دل کا خون ہوا، یا جگر جلا
آنسو کچھ آج سرخ سے ہیں کچھ سیاہ سے

بزمِ جہاں میں شمع کو جلنے سے کام ہے — کیسی لگی ہے آگ پتنگوں کی آہ سے
یہ کوہ و دشت اور یہ مایوسیٔ کلیمؑ! — یارب گرے نہ کوئی کسی کی نگاہ سے!
ملتی ہے اہلِ حسن سے یوں عشق کی نگاہ — جیسے کوئی فقیر ملے بادشاہ سے!

سیمابؔ کم ہوئی تیرگیٔ شامِ زندگی
کوئی گھٹا اُٹھے مرے بختِ سیاہ سے

حیرتِ جلوہ گری مُہرِ لبِ خاموش ہے — آنکھ محوِ دید تھی اتنا مجھے بھی ہوش ہے
جوشِ عصیاں سے زیادہ رحمتوں میں جوش ہے — میں ندامت کوش ہوں موجِ لاندامت پوش ہے
بے سوالی پر مری آخر انھیں رحم آگیا — حسرتِ دیدار ممنونِ لبِ خاموش ہے
جوش پر ہے جلوۂ مستانۂ عہدِ شباب — اونشیلی آنکھ والے کچھ تجھے بھی ہوش ہے!
قصرِ کسریٰ، چترِ دارا، تختِ نادر، بزمِ جم — ہائے وہ عالم کہ جو زیرِ زمیں و پوش ہے
پوچھتا کیا ہے مآلِ باریابیٔ نگاہ، — کھو گئے خود ہی ترے جلووں کا کس کو ہوش ہے!
تیری زلفیں بھی نہ نکلی تھیں سوادِ حسن سے — حسرتِ آوارہ جب سے خانماں بر دوش ہے
دیکھنا محویتِ لطفِ شکر خوابِ خیال — جیسے کوئی فی الحقیقت گرمیٔ آغوش ہے

ہم ملے تھے ایک دن سیمابؔ سے یادش بخیر!
آدمی خوش فکر ہے۔ خوش وضع ہے۔ خوش پوش ہے

کیوں ہنسی تو اے اجل، فانی اگر سمجھا مجھے — ایک دن سب کو فنا ہے کیا تجھے اور کیا مجھے!
راہِ تاریک طلب میں دیکھ کر تنہا مجھے — دُور سے موسیٰ دکھاتے ہیں یدِ بیضا مجھے

غم مجھے، حسرت مجھے، وحشت مجھے سودا مجھے
ایک دل دیکر خدا نے دیدیا کیا کیا مجھے

ہے حصولِ آرزو کا راز ترکِ آرزو
میں نے دنیا چھوڑ دی تو مل گئی دنیا مجھے

گرمیٔ محفل رہا میں سوز و سازِ عشق سے
کوئی شمعِ بزم سمجھا کوئی پروانا مجھے

یہ نمازِ عشق ہے کیسا ادب، کیسا ادب!
اپنے پائے ناز پر کرنے بھی دی سجدا مجھے

دین ہے اُس کی سمجھ کر تیرے کوچے کا فقیر
خاک کے ذرّوں میں دیدی دولتِ دنیا مجھے

کہہ کے سویا ہوں یہ اپنے اضطرابِ شوق سے
جب وہ آئیں قبر پر فوراً جگا دینا مجھے

کیا خرامِ طور کا دیگا پیغامِ ثبوت
حضرتِ موسیٰ دکھائیں پاؤں میں چھالا مجھے

صبح تک کیا کیا تری امید نے طعنے دیئے
آگیا تھا شامِ غم اک نیند کا جھونکا مجھے

دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے میں اُٹھ جاؤں گا
دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دنیا مجھے

جلوہ گر ہے اس میں اے سیمابؔ اک دنیائے حسن
جامِ جم سے ہے زیادہ دل کا آئینا مجھے

موجزن کیا آفتابِ صبح پیمانے میں ہے
آج کچھ بھیگی ہوئی سی دھوپ میخانے میں ہے

حق بجانب شمع کی مانند جل جانے میں ہے
کچھ محبت ہو تو کچھ غیرت بھی پروانے میں ہے

کوئی پروانوں کی خاکستر سے دیتا ہے پیام
زندگی کا لطف مٹکر خاک ہو جانے میں ہے

مجھ سے پوچھ اے قیس اب نیرنگیٔ جوشِ جنوں
تیرے ویرانے میں تھا اور میرے ویرانے میں ہے

ہے مری افسردگی دیباچۂ صبحِ چمن
بن کھلی کلیوں کا عالم دل کی مرجھانے میں ہے

سب کے حصّے میں نہیں لذت شرابِ عشق کی
جس کے پیمانے میں ہو یہ اُسکے پیمانے میں ہے

اک نہ اک دن بیٹھ جائیگا گلا ناقوس کا
ہر طرف سیندور ہی سیندور بتخانے میں ہے

سیر ہو نیت تو دیتا ہی خدا بھی برکتیں
جتنی پی لی ہی ابھی اتنی ہی پیمانے میں ہے

اہلِ محفل محو ہیں سیماب دل تھامے ہوئے
کسقدر رومان میرے غم کے افسانے میں ہی

اس درجہ شغلِ روح تری بندگی رہی
مرنے کے بعد بھی مری نیت بندھی رہی

اللہ رے مذاقِ محبت ترے فریب
انسانیت کے بھیس میں دیوانگی رہی

موجبِ اعتقاد رہا گو ترا وجود
پھر بھی مری نگاہ تجھے دیکھتی رہی

ارمان میں نے دفن کئے گردِ یاس میں
پچھلے پہر غبار سی جب چاندنی رہی

میں باوجود علم رہا صیدِ التفات
کیا کیا مجھے فریب سے دلبستگی رہی

نیرنگ دیکھئے شفقِ گل کے شامِ ہجر
اک آگ سی فضائے نظر میں لگی رہی

آئے ہزار گردشِ دوراں سے انقلاب
لیکن میں کیا کروں مری دنیا وہی رہی

اب تو وداع ہوتے ہیں یارانِ بزم سے
سیماب پھر ملیں گے، اگر زندگی رہی

موجوں میں نفس کی جو تری یاد بھری ہے
ہر آہِ دمِ صبح، نسیمِ سحری ہے

اک بار جسے دیکھ لیا، کیا اُسے دیکھوں
جلوہ جو گذرتا ہی نظر سے نظری ہے

میں سوزِ محبت میں جلا، جل کے ہوا راکھ
اور اب بھی مرے دل میں وہی آگ بھری ہے

اے حسن مرے ذوقِ تماشا کو نہ دے طعن
اب تجھ میں کہاں حوصلۂ جلوہ گری ہے؟

لایا ہے اُنھیں کوئی پھر آغوشِ نظر تک — معلوم نہیں ہوش ہی یا بے خبری ہے!
ہر شام جنوں ساز ہے ہر صبح جنوں خیز — کیا چیز مرا موسمِ شوریدہ سری ہے!

سیمابؔ وہ معمور ہے پہنائے نظر میں
میں اُس کو نہ دیکھوں یہ مری کم نظری ہے

حشر میں بھی ستم حسن کی پرسش نہ ہوئی — ہم بھی کچھ کہتے، مگر تابِ گذارش نہ ہوئی
مجھے دیتی رہی یک گونہ محبت کا ثبوت — وہ نظر تیری جو مرہونِ گذارش نہ ہوئی
غمِ پیہم سے مری روح گھلی جاتی ہے — اک مصیبت ہوئی دنیا کی، کاہش نہ ہوئی
سب تڑپتے ہیں محبت کی پذیرائی کو — یہی اک چیز وہ تھی جس کی فوارش نہ ہوئی
بے خودی میں بھی نہ بھولا میں رہِ منزلِ دوست — سرخوشی میں بھی مری پاؤں کو لغزش نہ ہوئی
اِس طرح ہم تو ہمیشہ رہے محرومِ شراب — کبھی آئی نہ میسّر، کبھی خواہش نہ ہوئی

کہہ گئے اُن سے ہم افسانۂ غم اے سیمابؔ
اور بالکل لبِ خاموش کو جنبش نہ ہوئی

حسن کے دل میں جگہ پاتے ہی دیوانہ بنے — ہم ابھی راز بنے ہی تھے کہ افسانہ بنے
ذرّے ذرّے میں ہے اک شعلۂ پروانہ مگر — ہو کشش گرمیٔ محفل کی تو پروانہ بنے
نہ پھریں مست نگاہیں تو پیئے کون شراب؟ — نہ تری آنکھ میں گردش ہو نہ پیمانہ بنے
کہہ دیا ہے کہ ملو ہم سے تو یک سُو ہو کر — اب نبھے یا نہ نبھے اُن سے بنے یا نہ بنے
حسن ہشیار ہی ہوتا نہیں دیوانۂ ہوش — جسے دیوانہ بنانا ہو وہ دیوانہ بنے

جانبِ میکدہ کیوں آنکھ اُٹھا کر دیکھوں
جب لبوں میں ترے میرے لئے میخانہ بنے

آج وہ بزم میں خود شمع بنے بیٹھے ہیں،
ہے کوئی مدعیٔ سوز جو پروانہ بنے؟

دلِ آزردہ ہے لبریزِ حدیثِ غمِ عشق
میں اگر چاہوں تو ہر سانس اک افسانہ بنے

حرمِ دل میں پرستش تری موقوف ہوئی
خود پرستی کے لئے کعبۂ دیجانہ بنے

دور بیٹھے ہوئے جلتے ہیں تو جلنے دو ہمیں
کس کی قسمت کہ چراغِ درِ جانانہ بنے

کتنے دیوانے محبت میں مٹے ہیں سیمابؔ
جمع کی جائے جو خاک ان کی تو ویرانہ بنے

موجِ ناتمام

کبھی جو اپنی جفاؤں سے منفعل نہ ہوا
مری وفاؤں سے وہ شرمسار کیا ہوگا

ابھی سے یاس کلیجہ بٹھائے دیتی ہے
الٰہی تا سحر انتظار کیا ہوگا؟

جو روز روز محبت میں موت آئیگی،
تو بار بار کوئی سوگوار کیا ہوگا

یہی فلک ہے تو مٹجائیگا نشاں میرا
یہی زمیں ہے تو اس پر مزار کیا ہوگا؟

ناقابلِ یک آہ ہے دل ٹوٹ پھوٹ کر
خمیازۂ شکستگیٔ ساز دیکھنا

ہے فرشِ خاک آپ کفن ہے، کفن میں ہم
لو گو ہماری خواب گہِ ناز دیکھنا

شاخِ نہالِ طور سہی شاخِ نخلِ گل
پر کھول لوں تو پھر مری پرواز دیکھنا

جس طرح شیشۂ شفاف سے جھلکے مئے ناب
پس پردہ بھی ترا رنگ جھلکتا ہی رہا

اشکِ حسرت نہ سہی حسرتِ دیدار سہی،
کچھ نہ کچھ چشمِ تمنا سے ٹپکتا ہی رہا

مرا سجدہ مسلسل ہے عبادتِ محبت
کبھی سر اُٹھا ہی لیتا جو سرِ نماز ہوتا

غمِ زندگی سے مجھ کو نہ کبھی نجات ملتی
جو نصیب میں نہ میرے غمِ جانگداز ہوتا

چراغِ داغِ عصیاں کی جگہ تجویز کرنی ہے
کہاں تک پھیلنا ہے رحمتِ بالیدہ داماں کو

بغیر قصدِ نغمے روح کے تا صبح سنتا ہوں
حجابِ شب میں کوئی چھیڑ دیتا ہے رگِ جاں کو

شورشِ کدۂ حشر کہاں، اور کہاں میں!
یہ دیکھنے آیا ہوں، یہاں تُو تو نہیں ہے

صہبائے کہن

۱۸۹۸ء تا ۱۹۰۸ء

میخانۂ سخن کا گدائے قدیم ہوں
ہر رنگ کی شراب پیالے میں ہے مرے

یمابؔ



سیماب اکبرآبادی

بعمر ۲۲ سال

۷۸۶

صہبائے کہن

گہرائیوں میں روح کی عالم ہے نور کا
شاید یہ وقت خاص ہے تیرے ظہور کا

موسیٰ بھی تابِ جلوۂ جاناں نہ لا سکے
جل بجھ کے رہ گیا تو یہ تھا ظرف طور کا

ساقی نے مجھ کو خوگرِ بادہ بنا دیا
دن رات ذکر کرکے شرابِ طہور کا

موسیٰ تھے جن کو طور پہ تم نے بلا لیا
ہم پاس بھی نہ جائیں کہ ہو حکم "دور" کا

اُس روئے آتشیں پہ رہے کس طرح نقاب
رکھتی ہے تابِ حُسن اثر برقِ طور کا

کعبے سے کیا غرض تجھے دلبر نہ دیکھ لیں
کیوں پھیر کھا کے جائیں وہ رستہ ہی دور کا

سیماب مثلِ بادہ چھلکتے ہیں اشکِ خوں
آنکھیں مری جواب ہیں جامِ بلور کا

نامہ کوئی گیا نہ کوئی نامہ بر گیا
تیری خبر نہ آئی زمانہ گزر گیا

جنت بھی خوب بھر گئی دوزخ بھی بھر گیا
جوشِ جنوں بتائے مجھے میں کدھر گیا؟

ہنستا ہوں یوں کہ ہجر کی راتیں گزر گئیں
روتا ہوں یوں کہ لطفِ دعائے سحر گیا

شیرازہ بندیٔ دلِ صد چاک ہو چکی
میں تو وہ ہار ہوں جو گندھا اور بکھر گیا

جی سے غمِ جہاں ہی سنا لے زندگی پرست
جی سے گذر گیا تو جہاں سے گزر گیا

اب مجھ کو ہے قرار تو سب کو قرار ہے
دل کیا ٹھہر گیا کہ زمانہ ٹھہر گیا

تجھ سے شباب فتنہ ہیں اب کیا گلہ کروں
کم بخت خود لٹا مجھے برباد کر گیا

میں ننگِ کائنات کہ مجھ سے ملا نہ تو
تو نازشِ حیات کہ میں تجھ پہ مر گیا

سیمابؔ اب تو عمر کے دن کر رہا ہوں تیز
تھی جس میں زندگی وہ زمانہ گزر گیا

ہلکا سا اک کفن ہو شہیدِ بہار کا
سایہ ہی ڈال دو کسی سیماب وار کا

جو پھول گر پڑا ہے کہیں اُنکے ہار کا
غازہ بنا ہے چہرۂ صبحِ بہار کا

جب میری بیکسی پہ بہت روئی وقتِ صبح
شبنم نے منہ دھلا دیا شمعِ مزار کا

آنکھوں کو اپنی چوم لوں امکان ہو اگر
ان میں مزہ بھرا ہے ترے انتظار کا

کس کی شمیمِ زلف اُڑا لائی ہے کہ آج
ملتا نہیں مزاج نسیمِ بہار کا

بن جائے میری قبر پہ تعویذ کی جگہ
چھوٹا سا اک مزار دلِ بے قرار کا

دل میں بسا ہوا ہے تری دید کا خیال
آنکھوں میں گھر بنا ہے ترے انتظار کا

سیمابؔ کیا شگوفہ نیا دیکھئے کھلے
اب کے کچھ اور رنگ ہی فصلِ بہار کا

پرتو سے تیرے رخ کے یہ رنگ ہے چمن کا
ہر پھول بن گیا ہے آئینہ انجمن کا

حال اپنا کیا سناؤں، کیا دوں پتہ وطن کا — اک پھول ہوں فسردہ اُجڑے ہوئے چمن کا
وقتِ وداع آیا کس نازشِ چمن کا — پھولوں کی پتیوں میں سامان ہے کفن کا
سوزِ دروں کا عالم دونوں پر ایک سا ہے — مجھ کو لگی کا رونا اور شمع کو لگن کا
ہے گلشنِ جہاں میں صد رنگ میری خلوت — ہے میرے آشیاں میں تنکا چمن چمن کا
پھر زندگی کے ہاتھوں مرنا پڑے نہ مجھ کو — اُٹھا ہوں حشر کے دن منھ دیکھ کر کفن کا

سیمابؔ ہے یہ فیضِ بیداریٔ شبِ غم
مہمانِ مستقل ہوں تاروں کی انجمن کا

تری ٹھوکروں میں ظالم جو مرا مزار ہوتا — مری خاکساریوں کو نہ کبھی غبار ہوتا
نہ کیا خدا سے شکوہ کہ وہ شرمسار ہوتا — جو وہ شرمسار ہوتا مجھے ناگوار ہوتا
وہ نہ تھے جو میرے بس میں تو اسی پہ زور چلتا — مرے دل پہ کاش یارب مجھے اختیار ہوتا
کبھی خاک ہی میں مل کر مری آرزو نکلتی — جسے آپ نے مٹایا وہ مرا مزار ہوتا
جو نگاہِ مستِ ساقی کبھی یکدمے پہ پڑتی — تو کہیں صراحی ہوتی کہیں بادہ خوار ہوتا
یہ گھٹائیں کالی کالی جو ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی — مجھے خوشگوار ہوتیں۔ جو وہ نوبہار ہوتا

نہ اُٹھانے دیتے سیمابؔ اسی ناز ہم کسی کے
اگر اپنے دل پہ کچھ بھی ہمیں اختیار ہوتا

دل تڑپ جائے نہ کیوں دیکھ کر انسانوں کا — عبرت و یاس ہے عنواں مرے افسانوں کا
یہ خزانہ تھا کبھی عیش کے سامانوں کا — اب تو مدفن دلِ برباد ہے ارمانوں کا

مشربِ قیس کی ترویج نہ کی دنیا نے
کبھی میلہ نہ لگا نجد میں دیوانوں کا

یوں تو ہونے کو ہیں صحرا و چمن سب دلکش
جی بہلتا ہی نہیں تیرے پریشانوں کا

گرمیٔ محفلِ عشرت کا نتیجہ، توبہ!
تھا جہاں رقص وہاں ڈھیر ہے پروانوں کا

فطرتاً ہو گئے تبدیل وہ آدابِ جنوں
چاک ہونا نہیں اب فرض گریبانوں کا

تجربے ایسے ہی کچھ تلخ ہوئے ہیں سیمابؔ
ہیں اپنوں کا بھروسہ ہے نہ بیگانوں کا

دل کی نوائے راز میں ہوں ترجمانِ غیب
روح القدس سے سیکھی ہے میں نے زبانِ غیب

شاعر ہے اک مغنیٔ رنگیں بیانِ غیب
ہے اپنے دل کے ساز پہ یہ نغمہ خوانِ غیب

رونق فروزِ منزلِ دل ہیں امید و بیم
نازل ہوا ہے غیب سے یہ کاروانِ غیب

فکر و خیال و ذہن کی پرواز ہے بلند
اڑتے ہیں بامِ عرش پہ یہ طائرانِ غیب

الہام کیوں نہ ہو دمِ فکرِ سخن مجھے
سیمابؔ ہے زبان مری ترجمانِ غیب

دل سے ساقی نے مٹایا قلقِ جامِ شراب
رکھ دیا سامنے لا کر طبقِ جامِ شراب

ہاں پلا اتنی لطیف آج، اور اتنی گہری
عینِ مستی میں اُتاروں ورقِ جامِ شراب

مے گلرنگ نہیں لائقِ ہر ظرفِ گلی
سچ تو یوں ہے کہ یہ ہے مستحقِ جامِ شراب

وجہِ رنگینیٔ عالم یہی دو چیزیں ہیں
افقِ ساغرِ گلگوں، شفقِ جامِ شراب

بادہ خوارانِ ہم آہنگ سے کہدو سیمابؔ

یوں بہاتے ہیں زمیں ادقِ جامِ شراب
ساقیا دے مجھے وہ جام ولائے وارثؒ
جس طرف آنکھ اُٹھاؤں نظر آئے وارثؒ
رہے آباد الٰہی یہ زمیں دیوہ
ذرّہ ذرّہ ہے یہاں جلوہ نمائے وارثؒ
چاندنی کا ہے گماں اہلِ نظر کو کیا کیا
روضۂ پاک پہ چھائی ہے ضیائے وارثؒ
رونق افزا تھے جہاں دفن وہیں آپ ہوئے
اب کسی کے لئے خالی نہیں جائے وارثؒ
آبرو آبِ بقا کی مری نظروں میں نہیں
ہوں شہیدِ لبِ اعجاز نمائے وارثؒ
جا لگا چرخ سے یہ کون ستارہ بن کر
تھا مگر ذرّۂ خاکِ کفِ پائے وارثؒ
کہیں سیماب کو سب وارثِ اقلیمِ سخن
مدعا اس کا یہ بر آئے برائے وارثؒ

منظور اُن کو مشقِ خدنگِ نظر ہے آج — سینہ کہاں ہے آج کلیجہ کدھر ہے آج!
دنیا سے تیرے غم میں کسی کا سفر ہے آج — او بے خبر تجھے بھی کسی کی خبر ہے آج

دستِ جنوں جو سلسلۂ جنبانِ در ہے آج
وحشت زدہ مرا دلِ شوریدہ سر ہے آج

برخیز چارہ ساز نہیں اب امیدِ زیست
کل سے بھی کچھ بڑھا ہوا درد جگر ہے آج

کھولا نگاہِ ناز نے ہر زخم کا دہن
سینہ جوابِ خندۂ چاکِ سحر ہے آج

حسرت مقابلے کی ہے ابرِ بہار سے
کتنا بلند حوصلۂ چشمِ تر ہے آج

سیماب اپنا عکس بھی آتا نہیں نظر
یہ کون آئینے میں مرے جلوہ گر ہے آج!

دے نئی بھر کر مجھے ساغر میں روح
پھر مکدر ہے مرے پیکر میں روح

سجدے کو اُس آستاں پر جب جھکا
آ گئی کھنچ کر بدن سے سر میں روح

نکلی آخر تنگنائے جسم سے
کیوں نہ گھبراتی اندھیرے گھر میں روح

اک کھلونا ہے مرا خاکی بدن
اک تماشا ہے مرے پیکر میں روح

جام میں مے ہو، خم بادہ میں جام
روح میں ساغر ہے ساغر میں روح

کارفرما جلوۂ بُت خانہ ہے
ڈالدی ہے حُسن نے پتھر میں روح

کون ہے سیماب ہم آغوشِ فکر
مہکی جاتی ہے مرے پیکر میں روح

بھولے سے جس نے کی نہ دلِ مبتلا کی یاد
یادش بخیر! آئی پھر اُس بے وفا کی یاد

چھوٹوں جو بتکدے سے تو کعبے کی راہ لوں
بھولوں میں ان بتوں کو تو آئے خدا کی یاد

کوئی مجھے سُنے تو عجب قصہ خواں ہوں میں
لاکھوں کہانیاں ہیں دلِ مبتلا کی یاد

اُس دل سے پوچھ کیفِ تصوّر کی مستیاں جس میں سوائے تیرے نہ ہو ماسوا کی یاد
ڈرتا ہوں اور پھر نہیں ڈرتا گناہ سے آتی ہے اور پھر نہیں آتی خدا کی یاد
از برہے تجھ کو ہجر کی راتوں کی داستاں
سیمابؔ تیری یاد بھی ہے کس بلا کی یاد

یہ کیا جانے میں جانا ہے کہ جاتے ہو خفا ہو کر
میں جب جانوں مرے دل سے چلے جاؤ جُدا ہو کر
تصوّر آپ کا کیا کیا فریبِ جلوہ دیتا ہے
کہ رہ جاتا ہوں میں اکثر ہم آغوشِ ہوا ہو کر
وہ پروانہ ہوں، میری خاک سے بنتے ہیں پروانے
وہ دیپک ہوں کہ انگارے اُڑاتا ہوں فنا ہو کر
قیامت تک اُڑے گی دلسے اُٹھ کر خاک آنکھوں تک
اسی رستے گیا ہے حسرتوں کا قافلا ہو کر
تمھیں اب درد دل کے نام سے گھبرائے جاتے ہو
تمھیں تو دل میں شاید آئے تھے درد آشنا ہو کر
یونہی ہم تم گھڑی بھر کو مِلا کرتے تو بہتر تھا،
یہ دونوں وقت جیسے روز ملتے ہیں جُدا ہو کر
یقینی حشر میں سیمابؔ اُن کی دید ہے لیکن

وہ پھر پردے میں جا بیٹھے اگر جلوہ نما ہو کر؟!

مجھے پسند نہ کیوں آئے صحنِ صافِ قفس
لکھا ہوا مری تقدیر میں ہے قافِ قفس

لگی نہ مجھ کو ہوا تک ریاضِ ہستی کی
مرے نصیب سے تھا بندِ ہر شگافِ قفس

زباں درازیٔ صیاد سے پریشاں ہوں
ہوا ہے میرے لئے فرضِ اعتکافِ قفس

بڑھا قفس کا یہ رتبہ مری اسیری سے
ہوائے گل کے لئے فخر ہے طوافِ قفس

کھلی ہے آنکھ یہیں اس سے مجھ کو اُلفت ہے
اُبھار مجھ کو نہ اے ہم نشیں خلافِ قفس

کسی سے منّتِ اخفائے حال کیا کرتا
کہ دُود آہ سے خود بن گیا غلافِ قفس

میں جل ہی جاؤں گا اے گرمیٔ فغاں بس کر
لگے گی آگ ابھی سر سے تا بہ نافِ قفس

نگاہ میں ہیں عروسِ بہار کے جلوے
مجھے دریچۂ فردوس ہے شگافِ قفس

مجھے قفس سے عقیدت بھی تھی محبت بھی
رہا ہوا بھی تو برسوں کیا طوافِ قفس

شعاع پڑتی ہے داغِ جگر کی اے سیمابؔ
بنا ہے مطلعِ خورشید صحنِ صافِ قفس

رنگ یوں اپنا حسینوں میں جما دیتے ہیں
آنکھ ملتی ہے تو ہم دل بھی ملا دیتے ہیں

نزع میں چھیڑ کے پیغامِ وفا دیتے ہیں
ہائے کیا وقت ہے اور وہ مجھے کیا دیتے ہیں

آپ کے دستِ تسلی میں ہے کچھ بات ہی اور
یوں تو آنسو بھی لگی دِل کی بجھا دیتے ہیں

چھیڑتے ہیں مجھے سودائی سمجھ کر اُن کا
لوگ تو اور بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

زہر کھایا شبِ فرقت تو وفا چلّائی
جان یوں بھی کہیں اربابِ وفا دیتے ہیں!

نام کو بھی نہ کسی دل میں رہے گا ناسور — اب اطبّا تری خاکِ کفِ پا دیتے ہیں
خوش رہیں کوچۂ جاناں میں ہوا کے جھونکے — دل کے ٹکڑے تو مجھے ڈھونڈ کے لا دیتے ہیں

آج کل مشقِ ستم کی انھیں دُھن ہے سیماب
آگ غنچے میں لگاتے ہیں بجھا دیتے ہیں

چمن میں صبح کے انوار سے برسی نمو برسوں — کیا ہر تیری نے آبِ شبنم سے وضو برسوں
ہمیں دیکھو کہ ہنسنے کی نہ اُن سے گفتگو برسوں — دیا آنکھوں ہی آنکھوں میں پیامِ آرزو برسوں
چمن کی دھوپ دنیا میں نہ ہو گی سرخرو برسوں — کہ اس کمبخت نے چوسا ہے پھولوں کا لہو برسوں
یہی دل میں وہ بن کر میرے دل کی آرزو برسوں — لہو کی بوند نے پائی ہے کیا کیا آبرو برسوں
تجھے سجدے کئے ہیں اے حریمِ آرزو برسوں — نیازِ عشق پر میرے کرے گا ناز تو برسوں
گھڑی بھر بھی جہاں ٹھہرے نہ بھیڑیں ہوشیاروں کی — وہاں گونجی تمہارے ایک دیوانے کی ہو برسوں
ہوا دل خون جب رنگِ وطن غربت میں یاد آیا — شفق نے میرے ویرانے میں برسایا لہو برسوں
یہ دل میرا ہی میرا ہے جسے جلووں نے گھیرا ہے — یہ گھر تیرا ہی تیرا ہے، رہا ہے تو ہی تو برسوں
لہو میں ڈوب جانا، چند بوندوں کو اُٹھا لینا — نگاہِ یاس سے سیکھی ہے ترکیبِ وضو برسوں
محبت کے زمانے بھی قیامت کے زمانے تھے — رہا دل تیرے اس پہلو میں اُس پہلو میں تو برسوں
تو وہ باقی ہے سب دنیا فنا ہو جائے گی تجھ میں — رہا ہے تو ہی تو برسوں، رہیگا تو ہی تو برسوں
ضرورت کیا ہے اُنکی کمسنی سے پوچھتا ہو نہیں — کہ ٹوٹا جائے اک خانہ خرابِ آرزو برسوں

نہ آیا بعدِ موسیٰ کوہِ سینا پر نظر کوئی

رہی سیماب سونی جلوہ گاہِ آرزو برسوں

شاید جگہ نصیب ہو اُس گل کے ہار میں
میں پھول بن کے آؤں گا اب کی بہار میں

خلوت خیالِ یار سے ہے انتظار میں
آئیں فرشتے لے کے اجازت مزار میں

ہم کو تو جاگنا ہے ترے انتظار میں
آئی ہو جس کو نیند وہ سوئے مزار میں

اے دردِ دل کو چھیڑ کے پھر بار بار چھیڑ
ہے چھیڑ کا مزہ خلشِ بار بار میں

ڈرتا ہوں یہ تڑپ کے لحد کو اُلٹ نہ دے
ہاتھوں سے دل دبائے ہوئے ہوں مزار میں

تم نے تو ہاتھ جور و ستم سے اُٹھا لیا
اب کیا مزہ رہا ستمِ روزگار میں

اے پردہ دار اب تو نکل آ کہ حشر ہے
دنیا کھڑی ہوئی ہے ترے انتظار میں!

عمرِ دراز مانگ کے لائی تھی چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

سیماب پھول آگیں لحدِ عندلیب سے
اتنی تو تازگی ہو ہوائے بہار میں

ہوں تجلیٔ رخِ یار کے حیرانوں میں
آئینے دیکھتا پھرتا ہوں پریخانوں میں

نہ ملا حسرتِ موسیٰ کا نتیجہ، نہ ملے
اک فسانہ تو بڑھا حسن کے افسانوں میں

وہ پریشان ہیں اور شمع کی لَو برہم ہے
دیکھنا روح تو میری نہیں پروانوں میں

اگر انکار ہے زخموں میں نمک بھرنے سے
زخم لے جائیے بھر بھر کے نمکدانوں میں

کیف ہی سب کا جدا، اور ہیں آنسو یک رنگ
ایک سی ڈھل نہ سکی ایک سے پیمانوں میں

پھونک دی روح نئی شمعِ سحر نے سرِ بزم
اُڑ کے ٹوٹے ہوئے پَر مل گئے پروانوں میں

بوئے گیسوئے دوتا پھرتی ہے کیوں خانہ بدوش
تو بھی آبیٹھ محبت کے پریشانوں میں

سوزِ کم ہوئیں اور بزم تری سوز نواز
کبھی مل جل کے چلا آؤں گا پروانوں میں

نیم مست آنکھوں نے مجذوب بنا رکھا ہے
ہوشیاروں میں ہوں سیماب نہ دیوانوں میں

خرابِ فتنۂ بیدادِ یار ہم بھی ہیں
سہے ہوئے ستم روزگار ہم بھی ہیں

خرامِ ناز کرے التفات یا نہ کرے
پڑے ہوئے تو سرِ رہگذار ہم بھی ہیں

چلو جہاں تمہیں چلنا ہو قافلے والو
تمہارے ساتھ شمالِ غبار ہم بھی ہیں

ہمارے جذبِ محبت کی ہے یہ دو اثری
انھیں بھی چین نہیں بیقرار ہم بھی ہیں

ہمیں بھی یادِ وطن سے سکوں نہیں سیماب
اس انجمن میں غریب الدیار ہم بھی ہیں

مست کرکے نگہِ ہوشربا نے مجھ کو
بزمِ ساقی میں لگایا ہے ٹھکانے مجھ کو

لطف پروردۂ فطرت ہے سحر گشت مرا
کہ نسیمِ سحر آتی ہے جگانے مجھ کو

ہاتھ رکنے نہ دیا مشقِ جفا نے اُن کا
چین لینے نہ دیا شوقِ وفا نے مجھ کو

ایک چھوٹا سا شیمن تو بنا لیتا میں
چار تنکے نہ دیے میرے خدا نے مجھ کو

نغمہ سنجی مری سیماب بہت دل کش ہے
یاد ہیں طوطیٔ سدرہ کے ترانے مجھ کو

صبر و شکیب بھی تھے دل بے خبر کے ساتھ
گھر والوں کو بھی لوٹ لیا تم نے گھر کے ساتھ

چارہ گر وعدہ درمان سوز دل ناصبح گھل نہ جاؤں گا شمع سحر کے ساتھ!
دنیا و دیں کی مجھ کو ذرا بھی خبر نہیں جاگا ہوں رات بھر کسی کافر نظر کے ساتھ
اب فکر موت کی ہے، نہ اندیشۂ حیات دنیا کی سو بلائیں گئیں ایک سر کے ساتھ
سیمابؔ اُٹھئے اور قدم ان کے لیجئے
آنے لگیں فلک سے دعائیں اثر کے ساتھ

تم مرے پاس رہو پاس ملاقات رہے نہ کرو بات کسی سے تو مری بات رہے
ہو سرافراز یقیں، حدِ تصور سے گذر وہ بھی کیا عشق جو پابندِ خیالات رہے
میں نے آنکھوں سے نہ دیکھی سحر شامِ فراق شمع سے پہلے بجھا ایک پہر رات رہے
ذہن ماؤف، دل آزردہ، نگاہیں بے کیف مر ہی جاؤں گا جو چند یہی حالات رہے
دیر میں آنے کی تکلیف تو کی ہے سیمابؔ
یاد کبھی کی بھی اے قبلۂ حاجات رہے

کٹ چکی فرقت کی رات آرام سے انتظارِ صبح میں ہوں شام سے
یاد جب آتی ہیں مست آنکھیں تری دل کو بہلاتا ہوں شغلِ جام سے
جذب صحرائے جنوں کا دیکھنا دل کھچا جاتا ہے سو سو گام سے
وحشیو پیراہنِ بے آستیں کم نہیں ہے جامۂ احرام سے
جب رہا ہونے لگے ہم غم پسند خوب ہی روئے لپٹ کر دام سے
ہیں وہی یارب مرے لیل و نہار فائدہ کیا گردشِ ایام سے

اس کو مجھ سے کوئی نسبت ہے ضرور جی بہلتا ہے چراغ شام سے

وہ ہیں اور سیماب تاکید سکوں
اور میں مجبور اپنے نام سے

تلافیٔ غم حاصل کی تم نے خوب کہی یہ بات آج مرے دل کی تم نے خوب کہی
یہ وحشتیں مری پابندِ دار و گیر نہیں جنوں میں قیدِ سلاسل کی تم نے خوب کہی
میں ہوش میں ہوں، خدنگِ نگاہ تو پھینکو حفاظتِ جگر و دل کی تم نے خوب کہی
یہ کیا کہا کہ رہ و رسمِ عشق مشکل ہے محالِ محض ہے، مشکل کی تم نے خوب کہی
یہ حکم کیا کہ جو مانگے گا پائے گا سائل تہیں نہ مانگ لے سائل کی تم نے خوب کہی
ذرا سی دیر میں غمگیں ذرا سی دیر میں شاد مرے اُمید بھرے دل کی تم نے خوب کہی

ہے دل فروختہ سیماب تم نہ جانتے تھے
پھر اس سے گرمیٔ محفل کی تم نے خوب کہی

رفتہ رفتہ وہ مرے جینے کا ساماں ہو گئے پہلے میرا دل بنے پھر راحتِ جاں ہو گئے
لگ گئی صحنِ چمن میں آگ آتے ہی بہار پھول کھل کر آتشِ افروزِ گلستاں ہو گئے
کیا کریں فکریں رہائی کی اسیرانِ قفس ہو چکے مایوسِ تو مانوسِ زنداں ہو گئے
کر رہے تھے جانے ہم اللہ سے کس کا گلہ آپ اپنا سر جھکا کر کیوں پشیماں ہو گئے
ہجر کی شب تھی قیامت خیز چار آنسو مرے آنکھ سے نکلے، گرے، گرتے ہی طوفاں ہو گئے
تیرگیٔ قسمت کی تاریکی، ہجومِ یاس کی، یہ اندھیرے بھی شریکِ شامِ ہجراں ہو گئے

ہوگیا دشوار یکسوئی سے دم بھر بیٹھنا
ہم تو اے سیمابؔ اس دل سے پریشاں ہوگئے

جو تھا برتاؤ دنیا کا، وہی اُس نے کیا مجھ سے
میں دُنیا سے انوکھا تھا کہ وہ کرتا وفا مجھ سے؟

ہوئی ہے آئینہ خانے میں کیا ایسی خطا مجھ سے
کہ تیرا عکس بھی ہے آج شرمایا ہوا مجھ سے

تپِ فرقت کا شاید کچھ مداوا ہونے والا ہے
کہ اب خود پوچھتے ہیں چارہ گر میری دوا مجھ سے

مرے پہلو میں دل رکھ کر مجھے قسمت نے لٹوایا
نہ میرے پاس دل ہوتا نہ کوئی مانگتا مجھ سے

جلا کر اے مذاقِ دید تو نے خاک کر ڈالا
جمالِ یار کا اب پوچھتا کیا ہے مزا مجھ سے

شبِ غم مجھ پہ جو گذری تھی میں اس سے نہ واقف تھا
چراغِ صبح نے شب بھر کا قصہ کہہ دیا مجھ سے

میں دیوانہ ہوں میرے پاس محشر میں کھڑی رہنا
نہ جانے میں کہوں کیا اور کیا پوچھے خدا مجھ سے

تو کیا اپنی سزائے قتل پر خود دستخط کر دوں؟
وہ لکھواتے ہیں کیوں جرم وفا کا فیصلہ مجھ سے

غلط تھی یہ مثل سب دبنے والے کو دباتے ہیں
دبا میں خاک میں، تو خاک کو دبنا پڑا مجھ سے

یہ میری حیرتِ دیدار کا انجام ہونا ہے
نہ تم جلوہ دکھاؤ گے نہ دیکھا جائے گا مجھ سے

بتا او میرے غارتگر، اب انکو کیا بتاؤں میں؟
مسافر پوچھتے ہیں تیری منزل کا پتا مجھ سے

سُنے کس کس کی وہ سیمابؔ کس کس کو تسلی دے
پڑے رہتے ہیں لاکھوں اُسکے در پر مینوا مجھ سے

کسے فکرِ آسائشِ زندگی ہے
ذرا سی رہی ہے بہت کٹ گئی ہے

جدھر دیکھتا ہوں نظر آرہی ہے
تری شکل حدِ نظر بن گئی ہے

گناہوں سے اپنے جو کرتا ہوں توبہ — تو چشمِ کرم میرا مُنھ دیکھتی ہے
شبِ ہجر بستر پہ تنہا نہیں ہوں — مرے ساتھ تقدیر بھی سو رہی ہے
شبیہیں تو دیکھی ہیں آنکھوں نے لاکھوں — مگر تیری تصویر، تصویر ہی ہے
عجب اک شگوفہ ہے عاشق کا دل بھی — کھلے تو گلوں بند ہو تو کلی ہے

کوئی اُس کو چھیڑے تو وہ کیوں نہ روئے
کہ سیمابؔ پتھر نہیں آدمی ہے

قدم لے جلد اے دستِ دُعا بڑھ حوصلہ کر کے
دُعا کچھ لائی ہے بامِ فلک سے جھولیاں بھر کے
بہت بے کیف ہے دل سرد مہری سے زمانے کی
پلا دے آج تو شیشے میں ساقی بجلیاں بھر کے
ذرا سا دن ہے میری داستانِ غم ہے طولانی
سرِ محشر کہاں تک روؤں دُکھڑے زندگی بھر کے
دکھا دی برہمن کو کیا بتوں نے صورتِ باطن
یہ بُت خانے میں کیسے شور ہیں اللہ اکبر کے
اُدھر ہے عکس اُن کا وہ اِدھر ہیں محوِ آئینہ
کھڑے ہیں ایک ہی تیور سے دو قاتل برابر کے
یہ معراجِ محبت عشق میں قسمت سے ملتی ہے

ترے زانو پہ رکھتے ہی نصیبے کھل گئے سر کے
تڑپ کر سونے والے گور کے تختے اُلٹ دینگے
سرِ تربت نہ رو اور رونے والے سسکیاں بھر کے
الٰہی اس تپِ سوزِ دروں میں آگ لگ جائے
کہ ساری رات کپڑے جسم پر رکھتا ہوں تر کر کے
ہم اے سیماب آخر کشتۂ بے تابیٔ دل تھے
فنا ہو کر بدن سے پھوٹ نکلے کیمیا گر کے

سیہ روزی کا یہ عالم زمانے سے نرالا ہے
مرے گھر میں اندھیرا، ساری دنیا میں اُجالا ہے
وہ جوشِ عشق جسکو دل کی تنگی نے پالا ہے
رہے پنہاں تو حسرت ہے نکل جائے تو نالا ہے
پڑا ہے روشنی میں ذرہ ذرہ میرے صحرا کا
چراغِ بیکسی سے شامِ غربت میں اُجالا ہے
سرشکِ شوق کی موجوں سے کیوں گھبرا گئی دنیا
ابھی تو ایک ہی قطرہ سمندر سے نکالا ہے
دوائے درد مینے درد سے کی ہے مصیبت میں
کہ جب کانٹا چبھا ہے نوکِ خنجر سے نکالا ہے
دلِ مشتاق جھونکے لے رہا ہے فرطِ مستی سے
چمن میں آج یہ سیماب جھولا کس نے ڈالا ہے

محتاجِ عبادت کرمِ یار نہیں ہے
افسوس ہے اُس پر جو گنہگار نہیں ہے
یہ تو نہ کہوں گا کہ غمِ یار نہیں ہے
سب کچھ ہے مگر قابلِ اظہار نہیں ہے
بے پردہ وہ کیوں بیٹھے ہوئے ہیں سرِ محفل
کیا آج کوئی طالبِ دیدار نہیں ہے؟

سوچا ہی کہ اب اپنی مدد آپ کریں گے — اچھا ہی جو اپنا کوئی غمخوار نہیں ہے
افتادہ جہاں ہوں پسِ دیوار میں ناکام — قسمت سے وہیں سایۂ دیوار نہیں ہے
اس سے تو مری لذتِ غم ہوتی ہے تازہ — فریاد کسی حال میں بیکار نہیں ہے

سیمابؔ وہ کہتے ہیں کہ ہم خوش ہیں اسی سے
اب زندگیٔ غم مجھے دشوار نہیں ہے

رسم اُن سے محبت کی ادا بھی نہیں ہوتی — اور اب تو سلیقے سے جفا بھی نہیں ہوتی
آجاتا ہے کچھ یاد تو بھر آتے ہیں آنسو — ہم سے تو مصیبت میں دعا بھی نہیں ہوتی
شاید ہوا پیوست خدنگِ نگہِ ناز — اب ٹیس کہیں دل میں ذرا بھی نہیں ہوتی
اے برقِ جمال ایسی بھی کیا پردہ نشینی — اب طور پہ تو جلوہ نما بھی نہیں ہوتی!
یوں قافلے سے دور میں جاتا ہوں اکیلا — ہمراہ مرے بانگِ درا بھی نہیں ہوتی
یہ قحطِ وفا ہے کہ غزل میں مری اکثر — ارزانیٔ مضمونِ وفا بھی نہیں ہوتی

اُس وقت ہمیں عادتِ گلگشت ہے **سیمابؔ**
جب باغ میں گلچیں کی ہوا بھی نہیں ہوتی

امتحاناً ہی وہ مجبورِ فغاں کر دیکھتے — پھر فلک کو ایک لمحے میں زمیں پر دیکھتے
نبض سے امراض کی تشخیص کرتے ہیں طبیب — تم تو میرا حال دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھتے
رسمِ پردہ دیکھنے والوں کی حارج تو نہ تھی — دیکھنا ہوتا تو آنکھوں میں چھپا کر دیکھتے
اپنے صانع پر اگر مصنوع کی ہوتی نظر — آئینے ہر گھر میں تصویرِ سکندر دیکھتے

مانعِ نظارۂ حُسن اس لئے حیرت ہوئی
دیکھ لیتے ایک دن موسیٰ تو اکثر دیکھتے

آنکھ کھل جاتی اگر تقدیر سے روزِ ازل
سب سے پہلے کھول کر خطِ مقدر دیکھتے

یوں نہ گر پڑتے جو کرتے روک تھام اپنی کلیم
دیکھ کر اُن کو سنبھلتے پھر سنبھل کر دیکھتے

اے امیدِ دوست کہتے ہیں کہ مرنا سہل ہے
تو نہ ہوتی کاش، تو یہ کام بھی کر دیکھتے

گر نہ تھی سیماب فکرِ امتحانِ اضطراب
آگ میں رکھ کر مجھے کیوں کیمیا گر دیکھتے؟

طاقوں میں جگمگاتے ہیں شیشے شراب کے
جلتے ہیں میکدے میں چراغ آفتاب کے

دیں گے جواب کیا مری چشمِ پُر آب کے
خالی پڑے ہوئے ہیں کٹورے حباب کے

آنسو تو پونچھ دو مری چشمِ پُر آب کے
اک سرسری نگاہ، میں صدقے حجاب کے

اُن کی طرف سے آپ کئے سیکڑوں سوال
قاصد کو یوں سکھائے سلیقے جواب کے

ڈھالیں گے اپنے ہاتھ سے وہ پھول سی شراب
لادے کوئی چمن سے کٹورے گلاب کے

نکلے ہیں سیر کرنے شہیدانِ فصلِ گُل
خاکِ چمن سے بھیس بدل کر گلاب کے

یہ اشک، یہ شرارِ فغاں، یہ جگر کے داغ،
کیا کیا چراغ ہیں مری شامِ شباب کے

جاتے ہیں خوفِ سیلِ فنا سے بہے ہوئے
موجوں سے دور دور سفینے حباب کے

ہے خاکِ نقشِ پا سے امیدِ سراغِ دوست
ذرّوں سے پوچھتا ہوں پتے آفتاب کے

راہِ فنا میں چلتے ہیں آزاد سر کے بل
دیکھے نہیں ہیں پاؤں کسی نے حباب کے

سیماب دن ہیں عید تو راتیں شبِ بہار

کیا خوشگوار خواب ہیں عہدِ شباب کے

دل کے بہلانے کا وحشت میں ہو ساماں کوئی
لا کے رکھ جائے مرے گھر میں بیاباں کوئی

بزمِ اربابِ وفا میں کبھی کام آجاتی
کھینچ لیتا مری تصویرِ پریشاں کوئی

نظر آتا نہیں وحشت میں کہیں دستِ جنوں
اور کھینچے لئے جاتا ہے گریباں کوئی

اک جہاں مجھ کو پریشان نظر آتا ہے
یوں بھی یارب نہ ہو دنیا میں پریشاں کوئی

سرِ مدفن وہ پھر آئے ہیں ٹٹانے مجھ کو
جمع کر دے مرے اجزائے پریشاں کوئی

باغباں تختۂ گل دیکھ لے کلیاں گن لے
وہ گیا پھاند کے دیوارِ گلستاں کوئی!

نغمۂ عشق سُنے ہو گئی مدت سیماب
چھیڑ دے آج مرا سازِ رگِ جاں کوئی

کر غورِ رنگ و بو کے احساس سے گذر کے
یہ پھول اور کلیاں دھوکے ہیں سب نظر کے

شیرازہ بندیٔ گلِ جوشِ بہار تک ہے
اک روز یہ ورق سب رہ جائیں گے بکھر کے

مجبور کیوں نہ کر دوں ترکِ ستم پہ تجھ کو
میں کیوں ترے ستم پر رہ جاؤں صبر کر کے

بیداریٔ فضا میں پہلو بدلنے والے
اتنا تڑپ کہ تارے رہ جائیں آہ بھر کے

کیا داد اُس نظر سے مانگوں وفائے دل کی
جو مسکرائے دل کی دنیا تباہ کر کے

ایمان حشر پر ہے لیکن یہ سوچتا ہوں!
دل ہو چکا ہے مردہ اب کیا جیو نگا مر کے

خاکِ رہِ محبت خود ایک کارواں ہے
رہگیر ہیں یہ جتنے ذرّے ہیں رہگذر کے

آدابِ وصل معلوم! اب میں کہاں تمہیں ہو
کھویا گیا ہوں حدِ جذبات سے گذر کے

سیماب اب وطن میں اتنا ہے آنا جانا
آئے ہیں عید کرنے، جائیں گے عید کر کے

جلوہ جو تیرے حسن کا نالے میں ہو مرے
یہ ساری کائنات اُجالے میں ہو مرے

دیکھوں تو میرا راز سمجھتا ہے کس طرح
کتنی نگاہ دیکھنے والے میں ہو مرے

ہر خار میری وادیٔ وحشت کا مست ہو
کیا تیر ہو شراب جو چھالے میں ہو مرے

یہ تیرے بنکدے میں تو پتھر ہیں برہمن
وہ بت ہی اور ہو جو شوالے میں ہو مرے

میخانۂ سخن کا گدائے قدیم ہوں
ہر رنگ کی شراب پیالے میں ہو مرے

اے رات دیکھ میرے تصور کی روشنی
کس شان کا ہو چاند جو ہالے میں ہو مرے

سیماب دل جو مائل ناز و نیاز ہے
انداز فقر کا بھی دوشالے میں ہو مرے

کون کہتا ہے کہ فتنے نہ اُٹھاتے چلئے
گر افتادہ سروں کو نہ ستاتے چلئے

آئینے نقش کفِ پا سے بناتے چلئے
چار چاند آج زمیں کو بھی لگاتے چلئے

آپ کیوں گورِ غریباں میں چلے آئے، یہ کیا!
اہلِ مدفن ابھی باہر نکل آتے چلئے

مجھ سے کہتا ہے حریفوں کی تگ و دو کا خیال
نقشِ پا راہِ محبت میں مٹاتے چلئے

سُرخ ہولی میں ہوائیں بھی ہوں یارانِ نشاط
تا درِ پیرِ مغاں رنگ اُڑاتے چلئے

قبرِ عاشق پہ تکلف کی ضرورت کیا ہے
پھول بھول آئے تو کانٹے ہی چڑھاتے چلئے

جی میں ہے روئیے واماندگیوں پر اپنی
اور سب قافلے والوں کو رُلاتے چلئے

مجلس وعظ کا آخر ہے ارادہ سیماب
میکدہ پاس ہے کچھ پیتے پلاتے چلئے

تری اے چارہ گر حیرت بجا معلوم ہوتی ہے
کہیں سب کو محبت کی دوا معلوم ہوتی ہے

تڑپ جاتا ہوں میں کانٹا الجھتا ہے جو دامن سے
مجھے اس میں محبت کی ادا معلوم ہوتی ہے

آلِ آفرینش ہے لحد کی آخری منزل
یہیں تو ابتدا کی انتہا معلوم ہوتی ہے

زمانہ آج مانوسِ جفا ہے دیکھتا ہوں میں،
خدائی آج مایوسِ وفا معلوم ہوتی ہے

میں اے سیماب ترکِ عشق پر آمادہ تھا لیکن
نگاہِ حسن پھر ہمت فزا معلوم ہوتی ہے

شور پیدائی کی دیوانو ضرورت کیا ہے
کیوں بھڑکتے ہو بہاروں سے یہ وحشت کیا ہے

باہر آتی نہیں رہ رہ کے کھٹک جاتی ہے
دل میں ٹوٹی ہوئی اک پھانس ہے حسرت کیا ہے

چڑھ گیا ہے نگہِ شوق پہ رنگِ ہمہ اوست
اب مجھے آپ سے ملنے کی ضرورت کیا ہے

شکوۂ دوست نہ کر دے کہیں ہمیں فراق
سب یہی پوچھتے آتے ہیں شکایت کیا ہے

جان پڑ جائے شبِ غم مرے ارمانوں میں
آپ آجائیں تو مرنے کی ضرورت کیا ہے

تم یہیں کیوں نہ دکھا دو ہمیں جلوہ اپنا
طور پر بیٹھ کے جلنے کی ضرورت کیا ہے

اُن کا جلوہ تھا کوئی کھیل نہ تھا اے سیماب
خیر گی چھا گئی آنکھوں پہ تو حیرت کیا ہے

اب اُس کا فضل میرا رحمتیں میری، عطا میری،

مناسب قیمتوں پر بک گئی جنسِ دعا میری

نہیں اے برہمن ناقوس سے کچھ کم صدا میری
بتوں کے کان بہرے ہیں تو سُن لے گا خدا میری

نہ جانے کیا ترا انجام ہو اے وعدۂ فردا
قیامت ایک دن کی حسرتیں بے انتہا میری

تپِ غم کی لپٹ سے چارہ گر گھبرائے جاتے ہیں
یہ بیچارے علاج اپنا کریں گے یا دوا میری

وفا کی جستجو میں اب مری تربت پر آئے ہو
جہاں تم نے جفا کی تھی وہیں ڈھونڈو وفا میری

مری نظروں میں اے سیمابؔ جلوے ہیں حقیقت کے
نظر کیا کیمیا پر ہو نظر ہے کیمیا میری

کسی مردِ وفا کا کوچ ہو پھر اپنے مسکن سے
اُداسی مانگنے آئی ہے دنیا میرے مدفن سے

جہاں والوں میں اور اہلِ فنا میں فرق اتنا ہے
اُنہیں آنا ہے مدفن میں انہیں اُٹھنا ہے مدفن سے

مری عریانیٔ وحشت کی رکھ لے شرم غربت میں
کفن کی بھیک مانگ اے بیکسی صحرا کے دامن سے

خبر اس انقلابِ دیر و ساماں کی نہ تھی ہم کو
کہ ہم ہونگے قفس میں پھول برسیں گے گلشن سے

ہمیں اُستاد کی تقلید اے سیمابؔ کرنی تھی
عظیم آباد میں یوں پیشتر آئے ہیں ساون سے

ہمیں تو یوں بھی نہ جلوے ترے نظر آئے
نہ تھا حجاب، تو آنکھوں میں اشک بھر آئے

ذرا سی دیر میں دنیا کی سیر کر آئے
کہا لے کے تیری خبر تیرے بے خبر آئے

اسیر ہونے کے آثار پھر نظر آئے
قفس سے چھوٹ کر آئے تو بال و پر آئے

تجھے ملال ہے ناکامیٔ نگاہ فضول
نظر میں جو نہ سمائے وہ کیوں نظر آئے

وہ جانتا ہے میں پابندِ رسم و راہ نہیں
فضول ٹھوکریں کھانے کو راہبر آئے

تمام عمر یہ ناکامیاں قیامت ہیں
کبھی کبھی تو الٰہی، امید بر آئے

جسے تصرفِ تیر نظر نہ ہو معلوم
وہ میرے سامنے لے کر دل و جگر آئے

شریکِ قسمتِ تنہائیِ فراق ہوں میں
اجل بھی کیوں ترے آنے سے پیشتر آئے

بلائے جاں ہے وہ نصفِ شباب کا عالم
کسی حسین کی جب زلف تا کمر آئے

نگاہ جلوہ میں شاید سما گئے سیمابؔ
کہ منتظر گئے لوٹے تو منتظر آئے

کس قدر شامِ شبِ غم تھی پریشانی مجھے
تھا چراغِ خانہ بھی غولِ بیابانی مجھے

لے چلی وحشی بنا کر فتنہ سامانی مجھے
حشر تک ڈھونڈا کرے اب خانہ ویرانی مجھے

باغ میں لے جائے گر برگشتہ سامانی مجھے
پھول گھل کر دیں نوید چاک دامانی مجھے

دل وہی ہے دولبری دونوں میں ہمت آزما
کچھ پریشانی انھیں ہے، کچھ پریشانی مجھے

دل شگفتہ ہو کے بھی آزردۂ غم ہی رہا
خوش نہ آئی یہ بہارِ ہستیٔ فانی مجھے

موسمِ وحشت میں عالمگیر ہے دیوانگی
ساری دنیا اب نظر آتی ہے ویرانی مجھے

اب بہ آسانی کرے گا جذب دریائے کرم
تو نے اے جوشِ ندامت کر دیا پانی مجھے

دیکھئے انجامِ دورِ غم جنوں ہو یا سکوں
عشق ہے صبر آزما، فکرِ تن آسانی مجھے

بے نیازِ محفلِ عالم ہوں اے سیمابؔ میں
ہے غنیمت اپنے دل کی جلوہ سامانی مجھے

کیوں نظر بند کوئی پردۂ حائل میں رہے
جس کو صورت نہ دے اللہ وہ محمل میں رہے

دل کے ارمان ستانے کے لئے دل میں رہے
ہم تو مر کر بھی الٰہی اسی مشکل میں رہے

تیرے جلووں نے ہمیں ہوش میں آنے نہ دیا
بے خبر ہی رہے جب تک تری محفل میں رہے

جذب کرنا اسے آتا ہے، کہے دیتا ہوں
جس کو بننا ہو مرا دل وہ مرے دل میں رہے

اس کو کہتے ہیں طوفان کا اندازہ کر
ڈوبتے ڈوبتے جو حسرتِ ساحل میں رہے

عشق سے حسن بدل لے گا حقیقت اپنی
عمر بھر ہم اسی اندیشۂ باطل میں رہے

جی میں ہے ترک کریں شغلِ محبت سیمابؔ
کون الجھا ہوا اس عقدۂ مشکل میں رہے

اس درجہ ہوش بہکے جامِ شراب پی کے
آنے لگے زباں تک اسرار بے خودی کے

محشر میں ہوں نہ رسوا جذبات عاشقی کے
اب کیا کریں گے یارب پنکے بعد جی کے

پھر شورشِ محبت ہنگامہ آفریں ہے
پھر دل میں دیکھتا ہوں آثار زندگی کے

شاید شگفتہ اس کو صبحِ بہار کر دے
دل کی گرفتگی میں انداز ہیں کلی کے

آگاہِ راز آنکھیں میرے بھید جانتی ہیں
پنہاں کچھ اور بھی ہے پردے میں آدمی کے

کیا کیجئے کسی سے تحریک دوستی کی، ہم خود فریب خوردہ بیٹھے ہیں دوستی کے

سیمابؔ اپنی فطرت، ہے خوگرِ محبت
جو درد آشنا ہو، بندے ہیں ہم اُسی کے

شبِ غم اے مرے اللہ بسر بھی ہوگی — رات ہی رات رہے گی کہ سحر بھی ہوگی؟
میں یہ سُنتا ہوں وُہ دنیا کی خبر رکھتے ہیں — جو یہ سچ ہے تو اُنہیں میری خبر بھی ہوگی
چین ملنے سے ہے اُن کے نہ جُدا رہنے سے — آخر اے عشق کسی طرح بسر بھی ہوگی!
جس کی ہلکی سی جھلک بن گئی افسانۂ طور — ہائے کیا چیز وہ دزدیدہ نظر بھی ہوگی!
وہ ہیں اور دورِ صبوحی ہے، گھٹا چھائی ہے — کبھی یہ صبح الٰہی مرے گھر بھی ہوگی؟
ایک وہ شمع نہ ہوگی جو بجھی جل جل کر — شام بھی ہوگی زمانے میں سحر بھی ہوگی

فکر سیمابؔ ہے انجامِ دعا کی ناحق
دل سے نکلی تو ہم آغوشِ اثر بھی ہوگی

جُرعات

کبھی وہ طور پر اب جلوہ فرما ہو نہیں سکتا
اگر موسیٰ بھی آ جائیں تو ایسا ہو نہیں سکتا

ترے جلووں کو پوچھے کوئی ابراہیم و موسیٰ سے
بھڑک کر نور ہو جانا۔ چمک کر نار ہو جانا

کیا جانے انکے سامنے کیوں ہونٹ سِل گئے
لفظِ اُمید تا بہ زباں آ کے رہ گیا
یہ آفتاب ہے جو مرے دل میں ہے عیاں
وہ داغ تھا جو ہاتھ میں موسیٰ کے رہ گیا

یہی تقاضا ہے میرے جی کا کہ ایک نالہ ہو برہمی کا
نہ ہو ارادہ جو دلبری کا تو صبر لیں آپ کیوں کسی کا
ہوئی نمودار صبحِ رحلت خیال تھا خوابِ عیش و عشرت
شباب کہتا ہے ہو کے رخصت کہ میں نہیں آشنا کسی کا

شبِ فرقت ہمارے ہاتھ تھا جی سے گزر جانا
مگر منظور کس کو تھا انہیں بدنام کر جانا

جو روٹھے ہو تو ٹھہرو، ذبح کر کے اپنے گھر جانا
نظر تو پھیر لی ہے اب چھری بھی پھیر کر جانا

اُن کے کوچے میں مقدر کی نوازش دیکھئے
مجھ کو دی آواز، دربان کو اشارا کر دیا

تھی وجہِ آتشِ گل گرمیٔ فغاں میری
مجھی سے باغ میں ہنگامۂ بہار رہا

کسی سے میں نے سُنا تھا کہ وہ کریم بھی ہے
بس اتنی بات پہ برسوں گناہگار رہا

اُمنگ دل میں بمقدارِ رنگ و بو اُٹھی
جنوں میں جوش بہ اندازۂ بہار رہا

ہم اپنی موت پر دیکھیں کسی کا آنکھ تر کرنا
ہمیں بھی انفعادِ بزمِ ماتم کی خبر کرنا

مرتے ہی میں نے سب کو سبکسار کر دیا
دنیا کے سر پہ بوجھ مری زندگی کا تھا

توبہ، فرشتے چوٹ نگاہوں کی جھیلتے!
غش کھا کے رہ گیا یہ جگر آدمی کا تھا

آج تو پاؤں پہ ساقی کے گرا کر مجھ کو
کام اے لغزشِ مستانہ بنایا ہوتا

اللہ اللہ یہ تبسم یہ نشیلی آنکھیں!
آج تم نے مجھے دیوانہ بنایا ہوتا

یا نہ دیتا مجھے دل اور تمنائے وصال
یا خدا نے تمھیں ایسا نہ بنایا ہوتا

یا آتی جو نصیبوں میں تھی میرے گردش — محفل دوست کا پیمانہ بنایا ہوتا

گرے کیوں مختصر اک موج سے بجلی کی اے موسیٰ — تمہیں تو اشتیاقِ جلوۂ دیدار جاناں تھا!
یہ کون آیا تھا اپنے گشتۂ غم کی زیارت کو؟ — یہ کیسا طور کا جلوہ سرِ گورِ غریباں تھا
دکھائے شعبدے وحشت نے کیا کیا مجھ کو صحرا میں — کبھی دامن میں کانٹے تھے کبھی کانٹوں میں داماں تھا
مرے دیوانہ پن نے خیر سے کی اتنی ہشیاری — پھٹا جو میرے ہاتھوں سے وہ میرا ہی گریباں تھا

جا کر جو میں نے کل اَرنی طور پر کہا — آواز آئی موسیٰ عمراں نہیں ہیں آپ!
قطروں میں میری یوسفِ ثانی تو آپ ہیں — آنکھوں میں میری خوابِ پریشاں نہیں ہیں آپ

امید کو ہے وعدۂ دیدار قیامت — یارب ہو کہیں جلد نمودار قیامت
اُٹھتا ہے ہر اک لمحہ نیا درد جگر میں — آتی ہے شبِ ہجر کئی بار قیامت
میں چاک جگر اور سحر چاک گریباں — ہیں صبح شبِ ہجر کے آثار قیامت

سُنتا ہوں کہ آئے گا کوئی دیکھنے مجھ کو — اللہ کرے اور نہ نکلے مرا دم آج

باغ دکھا اے موسمِ گُل — دل سوئے کہسار نہ کھینچ

پھیر نہ دل پر تیغ نگاہ — شیشے پر تلوار نہ کھینچ
آگ نہ لگ جائے سیماب — آہِ آتش بار نہ کھینچ

صبا کی گود سے پہونچی مجھے شاخِ نشیمن پر — قفس رکھا کا رکھا رہ گیا دیوارِ گلشن پر
بہار آئی تو ٹوٹیں بجلیاں ہر نخلِ گلشن پر — میں سمجھا تھا کہ اب کے پھول برسیں گے نشیمن پر
تمنا رقص کرتی ہے مری طرزِ طپیدن پر — اثر کو وجد آتا ہے مرے اندازِ شیون پر
کتر کر پر خدا جانے کہاں صیاد جا بیٹھا — تو کیا اب میں یونہی بیٹھا رہوں دیوارِ گلشن پر؟

یہ اپنی راہ پر سمجھے تو وہ اپنی راہ پر — نالوں سے تھی امید بھروسا تھا آہ پر
جب سے نظر پڑی ہے تری جلوہ گاہ پر — چڑھتے نہیں ہیں طور کے جلوے نگاہ پر

پیمانہ کو توبہ کے عوض توڑنے والے — توبہ کو نہ توڑا کبھی پیمانہ سمجھ کر

برہمن دیر میں پہونچے ہیں جو کچھ دیر سے ہم — کعبے ہوتے ہوئے آئے ہیں بڑی پھیر سے ہم
کوئی پیالہ کوئی ساغر کوئی مینا ساقی — آس باندھے ہوئے بیٹھے ہیں بڑی دیر سے ہم
اتفاقاتِ زمانہ کا بُرا ہو سیماب
ہم سے اجمیر چھٹا چھٹ گئے اجمیر سے ہم

ہوا پامال جس نے سر اُٹھایا تیرے کوچے میں
ہم اُفتادہ مثالِ سایۂ دیوار اچھے ہیں

انیس کنجِ غم، کیفِ نظر، خاموش، بے پردہ
یہی رخ آپ کی تصویر کے دو چار اچھے ہیں

وہ مل جاتے تو موسیٰ کی طرح لطفِ طلب جاتا
ہم اس وادی میں سرگرمِ تلاشِ یار اچھے ہیں

خاکے ہیں چاند سورج تیرے ہی نقشِ پا کے
آئینے ہیں زمیں پر عکس آسمان پر ہیں

میں ہر آنسو کو اپنے گوہرِ یکتا سمجھتا ہوں
سُنا ہے سات پردوں سے یہ قطرے چھن کے آتے ہیں

لگی دل کی بھڑک اُٹھتی ہے سمجھانے بجھانے سے
ہمارے دوست جب آتے ہیں دشمن بن کے آتے ہیں

وضو کرتے ہیں مے سے خشتِ خم پر سر جھکاتے ہیں
یہ رند اپنی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بناتے ہیں

ہو جائیں محو لذتِ دنیا وہ ہم نہیں
جینے کی کچھ خوشی نہیں مرنے کا غم نہیں

اے داغِ دل مجھے نہیں خوفِ رہِ فنا
کیا میرے ساتھ مشعلِ راہِ عدم نہیں

ہوں وہ سودائی کہ وحشت کو جنوں ہے مجھ سے
بید مجنوں نہیں اُگتا مرے ویرانے میں

پھر رہا ہے مری نظروں میں زمانہ ساقی
میرے سر میں ہے کہ چکر ترے پیمانے میں

جستجو نے تری کیا جانے کہاں پہونچایا
آج کعبے میں ہے سیماب نہ بتخانے میں

کسک سی دلمیں ہوتی ہی رہی اُنکے تغافل سے
وہ لیتے ہی رہے ضبطِ الم کا امتحاں برسوں

بہار و باغ کی تاریخ ہم سے پوچھ لے کوئی
رہا ہو شاخِ نخلِ گل پہ اپنا آشیاں برسوں

رہا ویراں، کوئی آواز تک دل سے نہیں آئی
کسی نے بھی نہ دی اللہ کے گھر میں اذاں برسوں

دیکھ کر تیرا مرقع رنگ اُڑتا ہے مرا
یا میں اپنا رنگ بھرتا ہوں تری تصویر میں

میخانے میں دو چار ہی میکش نظر آئے
ہم عام سمجھتے رہے ساقی کی صلا کو

یوں حشر کے دن مانگ لیا اُن کو اُنہیں سے
وہ خود بھی نہ سمجھے مرے اندازِ دعا کو

اے آفتاب بچ کے نہ چل مجھ سے روزِ حشر
رسوا یہاں کہیں مری تر دامنی نہ ہو

کہتے ہیں وہ کہ ہم بھی تو کچھ بے قرار ہوں
دل کو ترے قرار اگر وہ بھی نہ ہو

تنگ آ گئے ہیں گرمیِ ارمان و شوق سے
وہ ہاتھ اُٹھا کے کوس رہے ہیں شباب کو

دیکھ کر یوں نہ کوئی نیچی نگاہیں کر لے
میری آنکھوں میں اگر حسرتِ دیدار نہ ہو

خوش تو ہو حشر کی اُمید پہ تم اے سیمابؔ
اور پورا جو وہاں وعدۂ دیدار نہ ہو!

کرو کرم کی نظر میرے حال پر دیکھو — وہ اک نگاہِ غلط ہی سہی، مگر دیکھو
ہر ایک شخص نظر آئے طالبِ دیدار — زمانے کو مری آنکھوں میں بیٹھ کر دیکھو

مرن ہو جائیگا جینا ترے امیدواروں کو — نویدِ صبحِ محشر مار ڈالے گی ہزاروں کو
قیامت میں تماشائی جنوں ہو دید کو قابل — اُٹھا لائے ہیں اپنے سر پہ ہم ٹوٹے مزاروں کو
دبا رکھا ہے اے سیمابؔ دل کو بھی جگر کو بھی
چھپا رکھا ہے اک پہلو میں دو دو بے قراروں کو

طالبِ گور ہوں سیمابؔ یہ حسرت ہے مگر — تا لبِ گور وہ آئیں مجھے دفنانے کو

ہوش جاتے رہے آتے ہی تری کوچے میں — دل کو میں بھول گیا اور مرا دل مجھ کو
آخری میری نظر کر گئی کام اے سیمابؔ
اُس نے کس یاس سے دیکھا سرِ محفل مجھ کو

کیا اُسے بیداریٔ شبہائے ہجراں کی خبر — عمر بھر جس فتنہ گر کی آنکھ بھی آئی نہ ہو

یارب آل اُن کے تبسم کا ہو کیا عالم — بجلی تڑپ رہی تھی کہیں گر پڑی نہ ہو

وہ عالمِ شکستگیٔ ناز الاماں جب حُسن خود کسی کے اثر سے تباہ ہو!

مٹا کر پھر مٹا غربت میں اے چرخِ کہن مجھ کو
ستا اتنا کہ یاد آجائے آرامِ وطن مجھ کو

تمہاری شوخ چشمی بزم میں کوئی نہ دیکھے گا
مگر الزام دے گی انجمن کی انجمن مجھ کو

نظر اکتا گئی تھی صبح و شامِ زندگانی سے
تماشا ہو گئی شامِ لحد، صبحِ کفن مجھ کو

غبار آلود ابھی سے ہو گئیں خورشید کی کرنیں
ابھی تو جھاڑنی ہے حشر میں گردِ کفن مجھ کو

کیا گذرتی ہے کسی پر دمِ فریاد نہ پوچھ
نکل آتی ہے زباں نالۂ شب گیر کے ساتھ

آہ کیوں اس کو ازل میں نہ کسی نے روکا
کیوں چلی آئی تمنا مری تقدیر کے ساتھ

ساری دنیا کو جگانا مجھے مقصود نہ تھا
صور کیوں چیخ اٹھا نالۂ شب گیر کے ساتھ

پھوٹی تقدیر لئے جاتا ہوں سوئے زنداں
جوڑ دوں گا کسی ٹوٹی ہوئی زنجیر کے ساتھ

آسماں انقلاب بھول گیا کس نے کی اضطراب میں توبہ
غسل کرنے کو روز آتی ہے میرے جامِ شراب میں توبہ

کالے بادل ہیں پردۂ رحمت توڑتا ہوں حجاب میں توبہ

ہائے سیمابؔ اُس کی مجبوری!
جس نے کی ہو شباب میں توبہ

شرم بسمل کی ہو قاتل ترے احسان کے ہاتھ
ہاں ذرا تول کے تلوار۔ ذرا تان کے ہاتھ

جدہر دیکھو اُدھر جنت میں حُسن جاودانی ہے
آلہی کیا یہاں میری بھی گم گشتہ جوانی ہے؟
مری آنکھوں کا ہر آنسو طلسم زندگانی ہے
جھلک اُٹھے تو موتی ہے ٹپک جائے تو پانی ہے
یہ دل کا آبگینہ اک حبابِ زندگانی ہے
ذرا سی ٹھیس لگ جائے تو پھر پانی ہی پانی ہے

تری تصویر ایسی کھچ گئی کچھ کلکِ قدرت سے
کہ صورت آفریں کی بھی زباں سے آفریں نکلی

ڈراتی ہے کہ اب روئے تو دُنیا کو ڈبو دونگی
مجھے کرنی پڑی اُلٹی خوشا دیدۂ پُرنم کی

کچھ نہ اتنا قدم آنکھوں سے لگا لینے دے
آج تو حسرتِ پابوس مٹا لینے دے
ضعف کہتا ہے کہ ہاتھوں سے گرا دے تصویر
درد کہتا ہے کلیجے سے لگا لینے دے

خامشی بھی ناز سے خالی نہیں
تم نہ بولو ہم پکارے جائیں گے

سعیٔ آسانی سے بڑھ جاتی ہے مشکل اور بھی
ضبط کرتا ہوں تو دُکھتا ہے مرا دل اور بھی
چلتے چلتے ضعف سے بیٹھا اور اُٹھا بار بار
ناتوانی نے بڑھا دی میری منزل اور بھی

طائر کی طرح ہے قفسِ تن میں مقیّد
شاید ہے مری روح گنہگار کسی کی

ہوں طور کی چوٹی سے بھی میں سو قدم آگے
لے آئی کہاں حسرتِ دیدار کسی کی

نہیں ہے جو دل میں تو ہوگا جگر میں
یہی دو ٹھکانے ہیں دردِ نہاں کے

بتا دیں دل میں پیکاں آپکا کیا بنکے رہتا ہے؟
محبت بن کے آتا ہے تمنا بن کے رہتا ہے

اڑ گئی آئی ہوئی نیند اُس ستم ایجاد کی
یہ مجھے کیا ہو گیا تھا، میں نے کیوں فریاد کی؟

بستہ و آراستہ زلفیں مرے کس کام کی
میں تو اُس گیسو کا سودائی ہوں جو برہم رہے

دستِ جاناں میں ہے تو تل اور بوتل میں شراب
ہے پری کے ہاتھ میں شیشہ پری شیشے میں ہے
میں ہی اے سیماب آئینے کو دیتا ہوں جلا
میری ہی دم سے یہ سب جلوہ گری شیشے میں ہے

رکھا ہمیں خدا نے بہر حال سربلند
مٹ بھی گئے تو گردِ رہِ کارواں رہے
اشکوں کیساتھ دل سے نکلتا ہے خونِ گرم
پانی میں کس طرح یہ شرارے نہاں رہے؟

ہائے کیا چیز ہے مجبوریٔ قطعِ اُمید
ہم جہاں تھک کے ٹھہر جاتے ہیں منزل ہے وہی
روح کے بعد بھی ہے دل میں ہجومِ غم و یاس
بجھ گئی شمع مگر شورشِ محفل ہے وہی

ملے تو ساتھ سُلا لیں نصیب خفتہ کو
اکیلے ہجر کی شب نیند ہی نہیں آتی

سمجھ رہا ہوں کہ رسماً ہے میری پرسشِ حال
بہانہ چاہیئے دشمن کو دوستی کے لئے

جاگنے سے اُنکے سب کی روح کو ہے تازگی
پھول کہتے ہیں جو وہ سوئے تو ہم مرجائیں گے
آئیں گے گر دیکھنے سیمابؔ کعبے میں اُسے
برہمن کہتے ہوئے اللہ اکبر جائیں گے

ہے فصلِ گُل بہارِ مئے ناب پر بھی ہے
اے میکشو لبنت کی تم کو خبر بھی ہے
اس انقلاب سے کسی پہلو نہیں ہے چین
کیسا یہ درد ہے کہ اِدھر بھی اُدھر بھی ہے

قاتل کا نام لکھ دیا کیوں میری قبر پر
لیتے ہیں راہگیر بھی بوسے مزار کے
حیرت ہے کس طرح دو ہوئے ہم سے پُر غبار
رکھا تھا اُن کو شیشۂ دل میں اُتار کے

جاؤ گے کہاں چھپ کے بھلا اہلِ نظر سے
وہ دیکھ لیا دل نے تمہیں چاکِ جگر سے!

ہم لوٹ پڑے کعبے سے بُت خانے کی جانب — واللہ پھرے آج تو اللہ کے گھر سے

گر یہ نہ میرے حال پہ کیوں ہنسی کرے — شمع لحد سے بادِ صبا جب ہنسی کرے
گم کردہ راہ۔ آبلہ پا۔ دُور کوئے دوست! — اب شوق ہی کرے تو مری رہبری کرے

رنج ہو انجامِ شادی اہلِ عالم کے لئے — عید اک تمہید ہے ماہِ محرّم کے لئے
رکھ دیا اللہ نے پہلو میں اک مضطر دل — یہ رعایت کی تمہارے جورِ پیہم کے لئے
ہاتھ آجاتا جو پتھر آستانِ دوست کا — ہم بھی اک کعبہ بناتے اہلِ عالم کے لئے

تمہیں جب دیکھ لیتا ہوں تو ہوتی ہے یہ کیفیت — قدم کچھ اور کہتے ہیں نظر کچھ اور کہتی ہے

پاؤں پھر راہِ محبت میں تھکے جاتے ہیں — پھر تمنائے درِ یار رہی جاتی ہے

ستم زدوں پہ گراں تھی ہوا زمانے کی — جھکی تو پھر نہ اُٹھی شاخ آشیانے کی

دیکھ کر کہتے ہیں ہم اُن کی پریشاں نظری — اِدھر آ ہم ہیں ترے ناز اُٹھانے والے
اس قدر بارِ معاصی ہے۔ الٰہی توبہ — بیٹھے جاتے ہیں جنازے کو اُٹھانے والے

نظر آئیں گے جب جلوے تو آنکھیں بند کر لیں گے
تجھے آنکھوں میں رکھ کر طالب دیدار دیکھیں گے

تری تصویر بن کر تیرے جلووں میں فنا ہو کر
تری آنکھوں سے ہم اک دن ترا دیدار دیکھیں گے

آلِ جلوۂ دیدار تو سمجھے نہ کچھ موسیٰ
زباں سے کہدیا ہم جلوۂ دیدار دیکھیں گے

ہمیں پہونچا دیے کوہِ طور تک اے شوقِ نظارہ
نہیں جلوہ نہ ہو ہم جلوہ گاہِ یار دیکھیں گے

میں تمہارا نہیں تو کس کا ہوں؟
دل تمہارا نہیں تو میرا ہے؟!

بانگِ جرسِ بلالے آواز دے کے مجھ کو
گم کردہ راہ ہوں میں بچھڑا ہوں کارواں سے

یہ دھواں دھار گھٹائیں یہ ہوائیں توبہ!
شاید ایسے ہی میں توبہ شکنی ہوتی ہے

ہم تو جب چاہتے ہیں دیکھتے ہیں جلوۂ دوست
وہ تو موسیٰ ہی سے ربِّ ارنی ہوتی ہے

روز آجاتا ہے میخانے میں حسبِ وعدہ
کہیں سیماب سے پیماں شکنی ہوتی ہے

شکوہ نہ کر ابتلائے غم کا
ہے یہ بھی زکوٰۃ زندگی کی

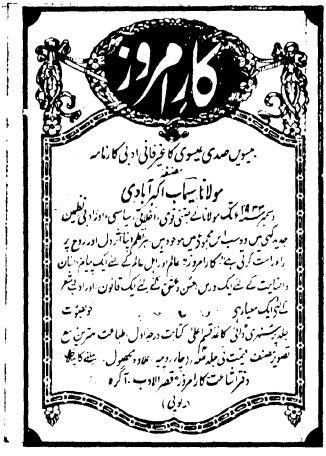
دنیا میں بنا نہ گھر مسافر!
یہ راہ تو ہے چلا چلی کی

(خورشید رقم)

KALEEM-E-AJAM

QASRULADAB SERIES

No. 5.



1ST EDITION 1936 2,000

(All rights reserved.)

دارالاشاعت قصرالادب آگرہ

قیمت فی جلد ۔ ۔ ۔